

کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے  
یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

# کتابِ خلافت

(نظامِ خلافت کے متعلق مفصل اور جامع کتاب)

از قلم

چودھری رحمت علی

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

3- کورٹ سٹریٹ گورنمنٹ ہاؤس (لاہور) پاکستان

(جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں۔)

کتاب : کتاب خلافت  
مصنف : چودھری رحمت علی المعروف بابا خلافت  
دارالاسلام پبلیکیشنز لاہور۔

فون: 4-35183123-042, 03009462188

E-mail: khalafat@hotmail.com

ترتیب و تدوین : اہل عراق چودھری  
اشاعت : اگست - 2010ء  
ایڈیشن : دوم  
تعداد : 1100  
اہتمام : پروفیسر محمد شمس جلیلی (جنگ ڈائریکٹر)  
3-گورنمنٹ ٹرمینل لاہور (پاکستان)

فون: 37320961, 042-37248676 فیکس: 042-37214974

ویب سائٹ : www.islamicpak.com.pk

ای میل : islamicpak@yahoo.com

مطبع : رضا پرنٹرز

قیمت : 350/- روپے

## اک ولولہ تازہ دیا میں نے دلوں کو

الحمد للہ صد بار الحمد للہ امتی انحطاط و زوال کے رواں دواں دور میں راقم الحروف نے تجدید دین کے سلسلہ میں خاص کام کیا ہے۔ مختصر ایک:

☆ جبکہ نظام خلافت کو تباہ کر کے مسلمانوں سے لہجہ مان کر سوچا جی مخراب و منہر اس بارے میں خاموش تھے ذرائع ابلاغ غیور خرافات تھے راقم الحروف نے نیا دکرایا کہ مسلمانوں کی بگڑی جتنی نظام خلافت کو ضائع کر کے اور اس کی بننے لگی تو نظام خلافت کو پھر اس دھرتی پر رواں دواں کر کے۔

☆ راقم الحروف ہی نے اس راز سے پردہ اٹھایا کہ نظام خلافت قرآن و سنت کے مطابق مبنی ہونے کی بنا پر عبادت ہے تو آمریت، جمہوریت، اشتراکیت وغیرہ جیسے انسان ساخت نظام بغاوت ہیں۔ محض بغاوت ہی نہیں سورہ مائدہ کی آیات مبارکہ 45، 44 اور 47 کے مطابق کفر بھی ہیں، ظلم بھی ہیں اور فسق بھی۔ علاوہ انہیں شرک تو ہیں ہی لہذا حرام ہیں۔

☆ راقم الحروف ہی نے صدیوں بعد انکشاف کیا کہ دوہر ملکیت میں دوسرے حق سے خلیفہ المسلمین کے علاوہ چار قرآنی ادارے بعنوان اولوالامر شریعہ مسلمانوں اور بیت المال نکال دینے گئے۔ آج ہمارا اختیار کردہ دین مذکورہ اداروں کے بغیر ہونے کی وجہ سے دوسرے حق نہیں رہا، دوسرے ملک بلکہ بے دینی ہی کی ایک شکل ہے۔ بنامیں عدل، امن، خوشحالی، اتحاد، انقلاب، دوسرے حق جیسی اقدار عظیم پر امنی، پس ماندگی و در ماندگی، اشتراک مظلومیت کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔

☆ یہ پتہ بھی مدتوں بعد راقم الحروف نے ہی دیا کہ اسلام کا نظام اطاعت، تین اطاعتوں یعنی اللہ کی اطاعت، رسول ﷺ کی اطاعت اور اولوالامر کی اطاعت پر مشتمل ہے (نساء: 59)۔ آج ہماری اطاعت ادھوری اور ناقص ہے اس لیے کہ اولوالامر کا وجود ہمارے ہاں اس لیے نہیں کہ خلیفہ المسلمین جسے اولوالامر میں مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے، خود نہیں۔

☆ اس راز کو بھی واضح کیا تو راقم الحروف نے کہ صدیوں سے ہمارے ہاں اجتہاد کے

دروازے شوریٰ کے نہ ہونے سے بند ہیں۔ ارکان شوریٰ نے مشورہِ خلیفۃ المسلمین کو دینا ہوتا ہے جو خود نہیں۔

☆ راقم الحروف ہی نے یہ سربستہ راز کھولا کہ زیرِ آسمان آج امتِ مسلمہ کا وجود نہیں۔ امتِ مسلمہ عرصہ ہوا تحلیل ہو کر ان گنت مسلم اقوام کا روپ دھار چکی ہے۔ بنامیں غلبہ دہیں حق شہادت علی الناس اور دوسرے فرائض جو امتی سطح پر ہونے تھے آج کما حقہ ادا نہیں ہو رہے۔

☆ اس راز سے بھی پردہ راقم الحروف ہی نے اٹھایا کہ دورِ خلافت نہ ہو تو دورِ جہالت ہوتا ہے۔ نیز جب تک ہمارے ہاں نظامِ خلافت بحال نہیں ہوتا، معاصر حاضر کے مسلمان دورِ جہالت میں ہیں اور رہیں گے۔

☆ راقم الحروف ہی نے پتہ دیا کہ دہس حق سے اگر خلیفۃ المسلمین اولوالامر شوریٰ امتِ مسلمہ بیت المال وغیرہ کو نکال دیا جائے تو دین اسی طرح بے جان ڈھانچہ رہ جاتا ہے جس طرح سے انسانی جسم سے روح نکل جائے تو رہنے والی لاش محض خاک کا ڈھیر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں ہمارے اختیار کردہ دین سے وہ ہر کات حاصل نہیں ہو رہی جو دورِ خلافتِ راشدہ کے مسلمانوں کو حاصل تھیں۔

☆ ایک اور بہت اہم بات جو راقم الحروف نے نام کی وہ یہ کہ کوئی بھی نظامِ زندگی اختیار کر دہ آئین کا پر وڈکت ہوتا ہے۔ اشتراکی آئین اشتراکیت کو معرض وجود میں لاتا ہے تو جمہوری آئین سے سرمایہ دارانہ جمہوریت وجود پذیر ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ جب ہمیں خلافتِ راشدہ کا سا نظام مطلوب ہے تو وہ ایک ہی صورت میں وجود پذیر ہو سکتا ہے کہ قرآن و سنت آئین مملکت ہونے کو کوئی خود ساختہ کتابچہ۔ لاریب اصلی بیج سے اصلی فصل پیدا ہوتی ہے قرآن و سنت کو آئین مملکت قرار دے دیں وہ روئیں وہ بہاریں وہ برکات لوٹ آئیں گی جو ہم سے روٹ چکیں۔ مقصد تخلیق آدم بھی پورا ہوگا تو اسی طرح سے تفصیلات آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔



# فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوانات	صفحات
1-	کار قیام خلافت میرا اور حنا کچھو بٹا تو کیسے؟	iv
	خلافت کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟	
2-	کچھ اس کتاب کے بارے میں	01
3-	مقصدِ تخلیقِ آدم	04
4-	اسبابِ زوالِ امت	13
5-	خلافت کی شرعی حیثیت	25
6-	نظامِ باطل	49
7-	نظامِ خلافت قائم ہو آج تو کیسے؟	67
8-	نظامِ خلافت نہ ہونے کے مضمر اثرات	87

## برکاتِ خلافت

نمبر شمار	عنوانات	صفحات
9-	اسلام ہمارے دین کا دین ہے	107
10-	اسلامی معاشرے میں مرد و عورت کی حیثیت	114
11-	عیسوں کی خلافت جو بہود کا فکر	120
12-	عیسوں کے علاوہ دوسرے عیسائیوں کی خلافت جو بہود	124
13-	دعوتِ نبوی سے مالِ جُزپ کرنے کی ممانعت	129
14-	حقِ نبوی کی ممانعت	131
15-	بنیادی حقوق	136
16-	تقدیر و ازواج	177
17-	مرد و عورت کے حقوق میں عدم مساوات	182
18-	اسلامی سزائوں کا سخت ہونا	188
19-	اسلامی جہاد (سُلیح و جہد) کیوں؟	196

## نظام ہائے خلافت

نمبر شمار	عنوانات	صفحات
-20	خلافت کا نظام حکومت	202
-21	خلافت کا نظام عبادت	218
-22	خلافت کا نظام معاشرت	233
-23	خلافت کا نظام معیشت	249
-24	خلافت کا نظام احاطت	267
-25	خلافت کا نظام مشاورت	282
-26	خلافت کا نظام عنف و عصمت	296
- 27	ضمیمہ.....سوال و جواب	312

## کارِ قیامِ خلافت میرا اور ہنا بچھونا بنانا تو کیسے؟

زمیندار کھرانے کا چشم و چراغ ہونے کے ماطہ سے مجھے 1952ء میں زرعی کالج لائل پور میں داخل کرایا گیا۔ پہلے ہی سال گرمیوں کی تعطیلات میں کھرجانے کیلئے سامان باندھ رہا تھا کہ ایک طالب علم ساتھی نے ایک کتابچہ مجھے پکڑا تے ہوئے نصیحت کی کہ میں اسے گاؤں پہنچ کر فارغ وقت میں پڑھوں۔ یہ کتابچہ جو سید ابوالاعلیٰ مودودی کا تحریر کردہ تھا میں نے ایک نہیں دو تھے وقفے وقفے سے تین دفعہ پڑھا۔ اسے پڑھنے سے پہلی دفعہ مجھے پراگشاف ہوا کہ مسلمان دنیا میں ”مظلوب“ ہیں اور دنیا کی قیادت کفر کے ہاتھ میں ہے۔ اس خبر نے مجھے مشکوک و مغموم کیا تو اس حد تک کہ اس نے میری سوچ بلکہ میری زندگی کے دھارے کو بدل کر رکھ دیا۔ کالج واپسی پر اور اس کے بعد سالہا سال تک میں اس نوہ اور کھوج میں لگ گیا کہ ایسا کیوں ہے؟ مسلمان اور دنیا میں مظلوب ہوئیں میرے نزدیک ایک بہت بڑا تضاد تھا۔ اسی سوال کا جواب ڈھونڈنے کیلئے کہ مسلمان دنیا میں مظلوب ہیں تو کیوں؟ میں اس وقت کے بعد ایک عرصہ تک ان گنت علماء کرام سے ملا۔ دینی جلسوں اور اجتماعات میں حاضری میرا معمول بن گیا تو اس قدر کہ اس سے میری تعلیم پر کچھ منفی اثرات مرتب ہوئے۔ بایں ہمہ مجھے کسی بھی حلقے سے میرے سوال کا کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا۔

کالج مذکور سے ایم ایس سی کرنے کے بعد مجھے پہلے محکمہ انہار پنجاب اور پھر واپڈا میں ملازمت کرنے کا موقع ملا۔ اسی دوران کچھ عرصہ شعبہ اسلامیات پنجاب یونیورسٹی میں بطور معلم منسلک رہا اور وہاں پر بھی محترم علامہ علاؤ الدین صدیقی صاحب اور دوسرے اساتذہ سے بار بار تبادلہ خیال کیا لیکن میری پستی الجھن کو کوئی حل نہ کر پایا۔ البتہ اس دوران میری تشویش میں مزید اضافہ ہوا تو اس لیے کہ مزید پتہ چلا کہ مسلمان دنیا میں مظلوب ہوتے ہیں تو اس وقت جب وہ نصرت الہی سے محروم ہوں اور اللہ تعالیٰ کا یہ بھی فرمانا کہ ”(مسلمانو!) تلبہ تمہارا ہی ہو گا بشرطیکہ تم مومن ہوئے۔“ یعنی مسلمانوں کا دنیا میں مظلوب ہونا ایک ہی شکل میں ممکن ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نصرت سے محروم ہوں اور یہ بھی کہ وہ مومن نہ رہیں۔ واقعات کی دنیا میں جب

مسلمان دنیا میں آج مغلوب ہیں تو ایک تو اس لیے کہ وہ نصرتِ امینِ دی سے محروم ہیں اور دوسرے یہ کہ ان کا ایمان اس معیارِ سطح کا نہیں رہا کہ جو انہیں دنیا میں بطور غالب قوت رکھے۔

1982ء کی ایک رات پچھلے پیر حسب معمول قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا کہ پڑھتے پڑھتے ایک جگہ پر حکیم فی الارض یعنی غلبہ کا ذکر آیا۔ میرا اُسے میں پیدا ہونے لگا، مسئلہ تو قہری ”غلبہ“ کے متعلق میں نے اس آیتِ مبارکہ کو بار بار پڑھا۔ سیاق و سباق کو بھی پڑھا۔ کوئی دس بارہ منٹ میں شرح صدر ہوا تو اس قدر کہ میرے ذہن میں تقریباً ربع صدی سے پسرا کیے سوال کا بھرپور جواب مل گیا، اور میں نے خود کو ایک بدلا ہوا انسان محسوس کیا۔ یہ آیتِ مبارکہ سورہ نوری کی آیت نمبر 55 تھی جس کے متعلق بعد میں میرے علم میں لایا گیا کہ مفسرین نے اسے آیتِ استخفاف کا نام دے رکھا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے نظامِ خلافت کے تین نمایاں (Distinct) مراحل کا ذکر فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو:

”اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ کہ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے لوگوں کو بنا چکا ہے۔ اور ان کیلئے ان کے اس دین کو غلبہ عطا کرے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے اور ان کی حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا۔ پس وہ میری عبادت کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔“

بڑا دو ٹوک الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ مبارکہ میں پہلے خلافت کے مرحلے کا ذکر کیا ہے پھر غلبہ دین کے مرحلے اور آخر میں اسلام کی برکات کے مرحلے کا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی پھل دار درخت کو پھل تو شاخوں پر لگتا ہے لیکن شاخیں معرضِ وجود میں نہیں آتیں جب تک کہ اس سے پہلے تانہ نہ ہو اور تانہ بھی ایک ہی صورت میں وجود پذیر ہوتا ہے کہ پہلے جڑ کا وجود ہو۔ یعنی جڑ ہو تو تانہ اور تانہ ہو تو شاخیں پھول اور پھل۔ مذکورہ آیتِ بصراحت بیان کر رہی ہے کہ اسلام کی برکات و ثمرات حاصل ہوتے ہیں تو اس وقت جب دنیا میں کہیں نظامِ خلافت قائم ہو۔ یعنی نظامِ خلافت ہونے کا لازمی نتیجہ غلبہ دین ہے اور غلبہ دین ہونے کا لازمی نتیجہ اسلام کے فیوضِ فواند کا حاصل ہونا ہے۔

جب میں نے اس آئیہ کریمہ کے بیان کردہ مراحل کی روشنی میں سیرت رسول ﷺ کا تجزیہ کیا تو مراحل کی یہی ترتیب وہاں ملی۔ مدینہ میں پہلے نظام خلافت قائم ہوا پھر یہ نظام جہاں کہیں پہنچا وہیں غلبہ دین حق لازماً وجود پذیر ہوا اور جہاں کہیں غلبہ دین حق ہوا وہیں علاقوں کے علاقوں اور خطوں کے خطوں نے اسلام کی برکات کو جانا چکھا اور استفادہ کیا۔ سیرت رسول ﷺ کو مزید کھنگالنے سے مجھے یہ بصیرت بھی حاصل ہوئی کہ جب کئی دور نبوت میں کی گئی جدوجہد کے نتیجے کے طور پر مدینہ میں دنیا بھر کی بڑی بڑی سلطنتوں کے مقابلے میں ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست قائم ہو کر نظام خلافت معرض وجود میں آیا تو قیامت تک جب بھی کسی نے نظام خلافت کو پھر قائم کرنا ہو تو وہ وہی کچھ کرے جو نبی کائنات ﷺ نے مکہ میں کیا۔ اس کی تفصیلات تو بعد میں آئیں گی لیکن ایک بات جس نے مجھے واپس کی پراجیکٹ ڈائریکٹری چھوڑنے پر آمادہ کیا وہ رسول ﷺ کا اہتمام تھا اس نظام سے کہ جس کو وہ بدلنا چاہتے تھے۔ باطل نظام کو نظام خلافت میں بدلنے کا مصمم ارادہ تو کر چکا تھا لہذا یہ کسی طور چٹانہ تھا کہ ایک طرف تو اس نظام کا کل پر زہن رہا کہ جس کو بدلنا ہے اور دوسری طرف اسے بدلنے کی سعی کروں۔ 1982ء اور 1990ء کے دوران کئی دفعہ استعفاء دینے کی ٹھانی لیکن ہر دفعہ محکمانہ ساتھیوں کا اصرار اور گھریلو ضروریات اس میں آڑے آتی رہیں اس لیے کہ میرے تمام بچے اس وقت زیر تعلیم تھے اور ہر روز گار عارف میں تھا۔ بالآخر ملازمت کے ابھی کئی سال باقی تھے کہ میں نے مارچ 1991ء میں ملازمت کو خیر باد کہہ دیا۔ ملازمت چھوڑتے وقت اپنے استعفاء میں لکھا:

"Humbly I may request that till this date I have spent most of my time in pursuit of worldly gains. Now the remaining time, if any, I intend to invest exclusively in the service of Islam."

یہ بھی ذکر کرنا چلوں کہ ملازمت چھوڑتے وقت کبھی یہ وسوسہ بھی دل میں آتا تھا کہ گھریلو اخراجات کیسے پورے ہونگے۔ بہت بندھتی تھی تو درج ذیل آئیہ مبارکہ سے جسے میں اکثر مگھلاتا رہتا تھا:

"جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کیلئے بہت جگہ اور ہمسراوقات کے لیے

بڑی گنجائش پائے گا۔۔۔۔۔“ (نساء: 100)۔

تحدیثِ نعت کے طور پر بیان کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ ایسا ہی ہوا جیسے کہ مذکورہ آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ جو دن بھی اس کے بعد چڑھا پہلے دن سے بہتر چڑھا اور ہر لحاظ سے یعنی جسمانی، روحانی، سماجی، معاشی اور بالخصوص حکمت و شریعت صدری کے اعتبار سے۔

1991ء میں جب ملازمت چھوڑی تو ایک دھن اور ایک ہی لکھن ذہن پر سوار تھی کہ اسی تحریک کو مقدور و بھرا آگے بڑھایا جائے جس کی ابتدا مجدد امجد حضرت آدم سے ہوئی تھی۔ اس وقت خلافت کے حوالہ سے قابل ذکر کام پاکستان میں کہیں نہیں ہو رہا تھا۔ حزبِ التحریر کی صدا کبھی کبھی کانوں میں پڑتی تھی یا پھر بھائی خورشید احمد گنگوہی صاحب نے نشست گاہ کی دیوار پر ”خلافت اکیڈمی“ (جسے ان کے کہنے کے مطابق ایک وقت پر ان کے ایک دوست نے مذاقا ”خلافت ایک آدی“ پڑھا تھا) یعنی اس وقت قادی ایک گنگوہی جو خلافت کے حوالے سے کام کر رہا تھا) کا پورڈ چسپاں کر رکھا تھا۔ اب تو ”مرے راز داں اور بھی ہیں“ کے مصداق متعدد حلقے منزلِ خلافت کی طرف گامزن ہیں لیکن اس وقت مجھے کسی نے یہ تک کہہ ڈالا کہ ”خلافت کسی دوائی کا جزو کا سام حلوم ہوتا ہے“۔

جیسے کہ اوپر ذکر ہوا ملازمت تیار کر کوئی نئی جماعت بنانے کا ارادہ نہ تھا، البتہ خواہش تھی کہ جو دینی جماعتیں اور افراد جن حق کی سر بلندی کیلئے کوشاں ہیں انہیں ”کار قیامِ خلافت“ کی طرف لایا جائے۔ ایسی تنظیموں میں سے کئی نے میرے گھر پہنچ کر کوشش کی کہ میں ان کی جماعت میں شامل ہو جاؤں۔ ہر ایک کا خیال تھا کہ جو شخص اچھے بھلے عہدے کو دین کی خاطر چھوڑ کر کھڑا بیٹھا ہے کام کا آدی ہے۔ میں نے ان کی اس خواہش کو ایک اور طریقہ سے کیش کیا۔ میں نے بشورہ مولانا خورشید احمد گنگوہی اور قاری عابد محمود قریشی اس وقت کی ایک معزز ہستی۔۔۔۔۔ سید وحی مظہر ندوی کی معاونت سے مختلف تنظیموں کے سربراہان کو ترغیب دی کہ ایک تحریکی ادارہ بعنوان ”مجلسِ خلافت“ بنایا جائے جس میں ہر تنظیم کے دو افراد کو شامل کیا جائے۔ یہ مجلس بنی۔ اس کا متفقہ دستور بھی بنا۔ دستور میں ان جماعتوں، تنظیموں اور اداروں کی لسٹ بھی دی گئی جو ریکارڈ کیلئے ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔ کچھ افراد کو معنی جن کی کوئی جماعت وغیرہ نہ تھی انفرادی طور پر شامل کیا گیا۔

1	تحریک احیائے خلافت	مفتی غلام سرور قادری (سیکرٹری)
2	تحریک انقلاب اسلامی	ڈاکٹر محمود الرحمن فیصل
3	تحریک خلافت	چودھری رحمت علی مولانا خورشید احمد گنگوہی عابد محمود قریشی
4	تنظیم اسلامی پاکستان (بطور مبصر)	ڈاکٹر عبداللہ خان عبدالرزاق
5	جمعیت المجددین پاکستان	حافظ زہیر احمد ظہیر
6	نظام اسلام پارٹی	مولانا وحسی مظہر ندوی (کنوینر) معین الدین شاہ ڈاکٹر جہانگیر شجاع
7	نقشبندیہ اویسیہ (تنظیم الاخوان)	مولانا محمد اکرم اعوان تاج رحیم
8	متحدہ علماء کونسل	مولانا ملک عبدالرؤف
9	مجلس تحقیق اسلامی	مولانا عبدالرحمن مدنی (خزانچی)
10	انفرادی طور پر	جاوید احمد غامدی
11	" "	ڈاکٹر مرتضیٰ حسن
12	" "	ریاض الحسن نوری
13	" "	سید خورشید احمد گیلانی
14	" "	مولانا سیف اللہ خالد



مجلس خلافت کی متعدد نشستیں ہوئیں۔ کوئی سال سو سال کے بعد مائون ہال میں اس مجلس کا مشترکہ عوامی اجلاس ہوا۔ اجلاس منعقد ہونے کے بعد مجلس خلافت بوجہ آگے نہ چل سکی۔ میں نے تو چونکا۔ کار قیام خلافت کو آخری سانس تک کرنے کا عزم کر رکھا تھا لہذا اس کو پہلے ”تحریک خلافت“ اور پھر ”عالمی تحریک خلافت“ کے عنوان سے ایک عرصہ تک جاری رکھا۔ عالمی تحریک خلافت اپنی منزل کی طرف بھرپور انداز سے رواں دواں تھی کہ ایک موقع پر ”سحق پھر پڑھ“ کا کوئی شارہ جیل میں جزل (ر) ظہیر الاسلام عباسی صاحب کے ہاتھ لگا۔ ان کے کہنے کے مطابق انہوں نے فیصلہ کیا کہ جیل سے رہائی کے بعد اس رسالے کے مدیر کو ملوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ہم دونوں میں متعدد نشستیں ہوئیں جن کے نتیجے میں ہم دونوں نے اکٹھے ہو کر ”تحریک عظیم اسلام“ کے عنوان سے کار قیام خلافت کو آگے بڑھانے کا عزم کیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ کام بفضل اللہ تادم تحریر پورے خلوص سے آگے بڑھ رہا ہے۔

رحمت علی

دارالسلام فاؤنڈیشن لاہور۔ فون: 9462188 - 0300

خلافت کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟

## کچھ اس کتاب کے بارے میں

خلافت راشدہ کے اٹھ جانے کے بعد نظام خلافت کو بحولِ جالائز تاریخِ عالم کا سب سے بڑا سانحہ ہے جس کی ذمہ داری ان تمام مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے جو اس وقت سے لیکر آج تک اس دنیا میں آئے لیکن بحالیِ خلافت کے کام کو مکمل نہ کر پائے۔ ایسے میں مسنونِ زندگی گزارنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہم چین نہ لیں جب تک کہ نظامِ خلافت کو اس دھرتی کا پھر مقدر نہ بنادیں۔ ایسا کرنے کیلئے یہ جاننا زبُر ضروری ہے کہ نظامِ خلافت ہے کیا؟ بھٹکے ہم تو کہاں؟ ذلتِ خواری مسلمانوں کا مقدر بنا تو کیونکر؟ اب ہم کریں تو کیا؟ ایسے ہی سوالات کے جوابات یہ کتاب دیتی ہے بڑے مختصر لیکن بھرپور انداز میں۔

کوئی چودہ صدیاں بیت گئیں جب نظامِ خلافت کو چلتا کر کے ملوکیت نے ڈیرے آجائے۔ اتنا لمبا عرصہ یہ ملوک کوئی ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھے رہے۔ اس دوران فتوحات بھی ہوئیں۔ خوشحالی کے ادوار بھی آئے۔ فلاحی و زرقانی کام بھی ہوئے۔ ایسا ہوا کیونکہ ایسا کئے بغیر یہ ملوک ملوکیت کو طویل نہیں دے سکتے تھے۔ اصل کام جو ان ملوک نے کیا اس لمبے عرصے میں وہ تھا جس حق کو مسخ کر کے جس ملوک کو رواں دواں کرنا۔ انہوں نے اپنے کام کا آغاز ہی نظامِ خلافت کو مسمار کر کے کیا۔ اللہ کی رحمتیں ہوں عمر بن عبدالعزیزؒ پر جو اپنے دور میں پھر اللہ و رسول ﷺ کی طرف لپکا۔ صدیوں پر محیط عرصے میں باقی ملوک بغض رہے کہ خواہ کچھ ہو نظامِ خلافت کو بحال نہیں ہونے دیں گے۔ کچھ عرصہ ان کی خوب مزاحمت ہوئی۔ خروج بھی ہوئے۔ لیکن جیسے کہ ملوکیت کا خاصہ ہونا ہے ملوک نے ہر مزاحمت کو بے دردی سے کچلا۔ خانوادہٴ رسول ﷺ کو قتل کرنے سے بھی نہ چوہے۔ کئی علاقے امت کو جیلوں میں ڈالا ان پر کوڑے برسائے۔ پہلے بنو امیہ پھر بنو عباس پھر عثمانی غزنیدہ صدیوں پر محیط موروثی بادشاہوں کو جاری و ساری رکھا تو اس حد تک کہ مثال کے طور پر ہارون الرشید نے پوری اسلامی دنیا اپنے دو بیٹوں میں آدھی آدھی یوں تقسیم کر دی جیسے کہ یہ اس کی ذاتی ملکیت ہو۔ بعد میں مامون الرشید نے امین الرشید کو قتل کیا۔

طاقت کے بل بوتے پر ان باغی ملوک نے نہ صرف اس خلافت کا قلع قمع کیا کہ جس کو نبی کائنات ﷺ اور ان کے ساتھیوں نے تیس سالہ دور نبوت میں مٹتوں، مشتوں، اور قربانیوں سے استوار کیا تھا بلکہ یہ خود کو خلیفہ کہلاتے رہے اور عندیہ دیتے رہے کہ خلافت بس یہی ہے جسے وہ رواں دواں رکھے ہوئے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا جرم یہی کہ انہوں نے دس حق ہی کو نہ بدلاتا رہنے کو بھی بدلا۔

یہ کتاب بتاتی ہے کہ وہ خلیفہ نہیں تھے غاصب تھے جنہوں نے خلیفہ المسلمین کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کئے گئے حق نکرانی کو چھینا۔ یہ کتاب بتاتی ہے کہ انہوں نے دس اسلام سے نہ صرف خلیفہ المسلمین کو نکالا بلکہ ان اداروں کو بھی جنہیں قرآن مجید اولوالعزم امت اور شریعی کام دیتا ہے اور جو عرضی وجود میں رہتے ہیں تو صرف اس وقت جب خود خلیفہ المسلمین کا وجود موجود ہو۔ یعنی انہوں نے دس حق کو دس ملوک کی شعل دی۔ جس دین کو آج ہم اختیار کئے ہوئے ہیں یہ دس حق نہیں دس ملوک یا بے دینی کی ایک شعل ہے۔ یہ کتاب بتاتی ہے کہ دور خلافت راشدہ کے مسلمانوں کو جو شرعات و ہدایات حاصل تھے وہ آج ہم کو کیوں حاصل نہیں؟ کیوں ایسا ہے کہ اس وقت عدل تھا آج ظلم، اس وقت امن تھا آج بد امنی، اس وقت خوشحالی تھی آج سب کچھ ہوتے ہوئے بھی بد حالی، اس وقت اتحاد تھا آج انتشار اور اس وقت غلبہ دس حق تھا آج مسلمانان عالم مغلوب و مجبور۔ یہ کتاب بتاتی ہے کہ 1924ء کو ”ستوط خلافت“ نہیں ٹوٹی پھوٹی اور علاقہ امتی مرکزیت کا ستوط ہوا تھا ستوط خلافت تو اس وقت ہوا جب دور خلافت راشدہ کو چلتا کر کے یہ ملوک برسر اقتدار آئے تھے۔

امت روایات میں کھو گئی۔ کچھ لوگ 1924ء کو ”ستوط خلافت“ کا سال قرار دینے پر مصر ہیں شاید اس لیے کہ انہوں نے کہیں کتابوں سے ایسا ہی پڑھا ہے۔ اصل میں ایسا یادان کرتے ہیں تو اس لیے کہ ان کا تصور خلافت ناقص ہے۔ اس موقع کو ”ستوط خلافت“ قرار دینے کا مطلب پورے دور ملوکیت کو دور خلافت قرار دینا ہے۔ حماقت سے ان حضرات نے خلافت کو ”لنڈ بازار“ سمجھ لیا، کاش یہ جانیں کہ خلافت وہ ارفع و اعلیٰ مقام ہے کہ جس کے سامنے فرشتے سجدہ ریز ہوئے۔ یہ جرم بسا نے اور اقتدار کی خاطر بھائی بندوں کو قتل کرنے کا دور ”دور خلافت“ نہیں دور بغاوت تھا۔ کتاب ہذا صدیوں بعد دبیز پردوں کو چاک کر کے حق کو پیش کرتی ہے۔

کاری کی سہولت کیلئے اس کتاب کو ضمیمہ کے علاوہ درج ذیل تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

1- خلافت کیا، کیوں اور کیسے؟

2- برکاتِ خلافت

3- نظامِ اہلِ خلافت

اس کتاب میں کچھ حقائق کا ذکر مکرر نظر آئے گا۔ ایسا ہے تو ایک تو ان کی اہمیت کے پیش نظر اور دوسرے سیاق و سباق کی مانگ ہی ایسی تھی۔ قرآن مجید میں بھی کئی امور کا بار بار اعداد کیا گیا ہے تو ان کی اہمیت کے پیش نظر۔ ریس و تبلیغ کی سہولت کے پیش نظر چند ابواب کو پیکچروں میں بھی تقسیم کیا گیا ہے۔ فہم دین کی خاطر اس کتاب کا ہر گھر میں ہونا سودمند ہوگا۔ پڑھے لکھے اپنے ان پڑھ بہن بھائیوں کو اس کے مندرجات سے آگاہ کریں۔ فہم دین ہی پر دنیا و آخرت کی کامیابی کا دار و مدار ہے۔ بیٹے ل عمران اور بیٹی سلمیٰ کی معاونت اس کتاب کی تیاری میں بڑی ممد و معاون رہی ہے۔ بیٹی شفقت، بیٹی ثروت، بیٹی صدف، بیٹے عرفان اور بیٹے عثمان کی کاوشوں کا اعتراف بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام کو اجر عظیم عطا کرے۔

قارئین کرام! آپ نے سرورق پر ’اہلِ خلافت‘ کے الفاظ ملاحظہ فرمائے ہیں۔ یہ الفاظ راقم کو کسی مصلحت کی خاطر مجبوراً لکھنے پڑے ہیں..... راقم

راقم

## مقصدِ تخلیقِ آدم

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اکرم المخلوقات بنایا ہے۔ اتنی عظمت دی رب کائنات نے اس خاک کے پتلے کو کہ ہر دوسری حقوق کو اس کیلئے مسخر کر دیا۔ قرآن میں آیا:

”وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں“ (ہقرہ: 29)۔

ایک اور جگہ اسی حقیقت کو مزید کھول کر بیان کیا گیا۔ فرمایا:

”اللہ وہی تو ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعہ سے تمہاری رزق رسائی کے لیے طرح طرح کے پھل پیدا کیے۔ جس نے کشتی کو تمہارے لیے مسخر کیا کہ سمندروں میں اس کے حکم سے چلے اور دریاؤں کو تمہارے لیے مسخر کیا۔ جس نے سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کیا کہ لگاتار چلے جا رہے ہیں۔ اور رات اور دن کو تمہارے لیے مسخر کیا۔ جس نے وہ سب کچھ تمہیں دیا جو تمہیں درکار تھا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو کرنہیں سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے“ (ابراہیم: 32-34)۔

کس قدر عظیم عطا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر دوسری حقوق کو انسان کیلئے صرف مسخر ہی نہیں کیا بلکہ مانع بھی۔ انسان کی ہر فطری ضرورت پوری کی۔ دوسری اشیاء کو اللہ پاک نے بنایا ہی ایسا ہے کہ جو انسانی بقا اور ارتقاء کیلئے ضروری ہے۔ انسان مرغی پکڑتا ہے ذبح کرتا ہے اور کھا جاتا ہے۔ گھوڑے کو لگام دے کر سوار ہو بیٹھتا ہے۔ دریاؤں کے رخ موڑ کر پانیوں کو مین مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ ہوا اور اس کی حرکت کو جیسے چاہے اپنے لیے سازگار بنالیتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنا لاڈلا اور اشرف کیوں ہے؟ دوسرے لفظوں میں ہر دوسری حقوق جب انسان کیلئے پیدا کی گئی ہے تو انسان کس کام اور مقصد کیلئے پیدا کیا گیا ہے؟ مقصدِ تخلیقِ آدم ہے کیا؟ ظاہر ہے وہ کام بھی اسی طرح، نوکھا اور فضل ہوا چاہئے جس طرح یہ حقوق

یعنی انسان انوکھا اور افضل پیدا کیا گیا ہے۔

پھر اس کے کہ ہم اس مقصد کو بیان کریں کہ جس کیلئے انسان پیدا کیا گیا ہے اس حقیقت کا ذکر ضروری ہے کہ جس قدر یہ اہم ہے کہ انسان جانے کو اسے کس مقصد کیلئے پیدا کیا گیا ہے اتنا ہی انسانوں کی اکثریت مرنے تک یہ نہیں سوچ پاتی کہ اس کی پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ انسانوں کی ایک معتد بہ اکثریت دنیا میں آتی ہے اور اپنی تخلیق کا مقصد جانے بغیر واپس اپنے رب کے ہاں لوٹ جاتی ہے۔ ظاہر ہے وہ تمام انسان جو دانی میں اپنی زندگی کا پورا عرصہ گزار کر اپنے رب کے حضور پیش ہو گئے تو وہ خود گنجائش پیدا کریں گے کہ ان کے خلاف کاروائی کی جائے گو وہ بصورت دیگر (Otherwise) کئی کاربائے نمایاں ادا کر کے گئے ہو گئے۔ بڑی خوش بختی بڑی بھرپور اور کامیاب زندگی گزار کر اللہ کے ہاں لوٹے ہوں گے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ فرض کریں لاہور میں واقع کوئی محلہ اپنے کسی اہل کار کو کراچی بھیجتا ہے کہ فلاں سرکاری کام کر کے آئے۔ اہل کار کراچی جاتا ہے خوب سیرپائے اور خرید و فروخت کرتا ہے۔ اپنے رشتہ داروں سے ملاقاتیں کرتا ہے لیکن وہ کام نہیں کرتا جس کو کرنے کیلئے محکمہ نے اسے کراچی بھیجا تھا۔ واپس لاہور آتا ہے۔ ظاہر ہے وہ مامدان اہل کار خود محکمہ کو موقع فراہم کرتا ہے کہ اس کے خلاف انضباطی کاروائی کرے۔ اللہ تعالیٰ کو موقع فراہم کرنے اور محکمہ کو موقع فراہم کرنے میں اہل زمین و آسمان کا فرق ہے۔ محکمہ کو ایک دفعہ راض کر کے وہ اہل کار پھر اپنی اچھی کارکردگی سے محکمہ کا نور نظر بن سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کو مارتھنگی کا موقع فراہم کر کے اللہ کے ہاں واپس جانے والے کو دوبارہ کبھی موقع نہ ملے گا کہ وہ بہتر کارکردگی سے اب کی بار اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کر سکے۔ اس کو جوہر اعلیٰ کی اس کی ابتدا تو ہوگی، انتہا کبھی نہیں۔

مقصد تخلیق آدم کیا ہے؟ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف انداز میں اس کا ذکر آیا ہے۔ سورہ ذاریات کی ایک چھوٹی سی آیہ مبارکہ میں اہل زمین و آسمان کا دو ٹوک حتمی اور پر زور ذکر آیا ہے۔ فرمایا گیا: ”ہم نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی مقصد کیلئے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت کریں“ (ذاریات: 56)۔

اللہ تعالیٰ اسے یوں بھی بیان کر سکتے تھے کہ میں نے جن اور انسان کو اپنی عبادت کیلئے پیدا کیا ہے

لیکن ”سوائے اس کے“ کا ذکر کر کے مقصد تخلیق آدم کو اہل حقیقت میں بڑا ہی واضح اور پر زور کر دیا گیا ہے۔

اس آیت مقدسہ کو پڑھتے ہوئے قاری کے ذہن میں ایک تعجب انگیز تاثر پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں عبادت کا جو مفہوم معروف ہے وہ بس نماز روزے حج زکوٰۃ، تسبیحات و مناجات اور اسی قبیل کے دوسرے مراسم عبودیت تک محدود ہے۔ بلکہ محض ”عبادت“ سے تو یہ تاثر ابھرتا ہے کہ دنیا داری کا کوئی کام نہ کیا جائے۔ مصلیٰ ہو تسبیح ہو اور گوشہ تہائی میں بس اللہ اللہ۔ اسلام یوں ”مارک الدنیا“ ہونے کے تصور کی جڑ کاٹ دیتا ہے یہ اعلان کر کے کہ ”لا رہبانیت فی الاسلام“۔ اسلام میں رہبانیت جیسی کوئی شے نہیں۔ اسلام ایک متحرک و مستحکم دین ہے۔ وہ تنہا کائنات و قیہ انسانیت اور تمدن منزل کا درس دیتا ہے۔ قرآن مجید میں دین کی اصطلاح اکثر و بیشتر استعمال ہی ”نظام“ کے معنی میں ہوئی ہے۔ اسلام کا راستہ زندگی کے عین منہجہ حار سے گزرنے کا راستہ ہے۔ اکاس بلی یعنی وہ افراد جن کا گزراوقات دوسروں کی کمائی پر ہو، کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ پوپ پادری پریسٹ پنڈت پربوت پجاری وغیرہ جیسی تن آسان اور زندگی سے فرار اختیار کرنے والی ہستیوں یعنی جن کے مذہبی تخلص کی ابتدا لفظ ”پ“ سے شروع ہوتی ہے کی اسلام شدت سے نفی کرتا ہے۔ کیا خوب ترجمانی کی علامہ اقبالؒ نے جب فرمایا:

یا وصیت افلاک میں تکبیر مسلسل  
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات  
وہ مذہب مردان حق مردان خدا مست  
یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس عبادت کا کیا مفہوم ہے جو مقصد تخلیق آدم اور بالآخر انسان کی مغفرت و نجات کا باعث بنتا ہے۔ قرآن و سنت کی رو سے درج ذیل تین نمایاں مضامین ہیں قرآن مجید کی استعمال کردہ ”عبادت“ کی اصطلاح کے۔ پہلا مفہوم وہی ہے جو عام فہم یعنی ارکان اسلام..... نماز روزہ زکوٰۃ اور حج کی ادائیگی ان فرائض کا وقفہ وقفہ سے دہراتے رہنا اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں یعنی ان انسانوں کیلئے جو دائرہ



اسلام میں داخل ہو جائیں لازم قرار دیا۔ ان کی ادائیگی کے بغیر مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنا محض خود کو فریب دینا ہے۔ یہ چاروں فرائض اسلام کے ستون ہیں۔ نماز کو تو خود ہی رحمت ﷺ نے ”عماد الدین“ قرار دیا۔ لیکن وہ عبادت جو مقصد تخلیق آدم ہے محض ان فرائض کی ادائیگی سے پورا نہیں ہوتا۔ محض عبادت کے لیے تخلیق کا مطلب تو یہ ہے کہ سن شعور سے لیکر آخری سانس تک ایک انسان کا ہر لحوہ بلکہ لمحے کا بھی کروڑوں حصہ عبادت کے بغیر نہ گزرے۔ مثال کے طور پر اگر نماز کو لیں تو پانچوں نمازوں کی ادائیگی زیادہ سے زیادہ دو گھنٹوں میں ہو جاتی ہے۔ تو پھر اس سے یعنی دو گھنٹے عبادت اور باقی بائیس گھنٹے غیر عبادت میں گزارنے سے تو مقصد تخلیق آدم پورا نہیں ہوتا۔ پورا ہونا ہے تو صرف ایک ہی صورت میں کہ ایک انسان کا ہر لحوہ ”من الصالحین“ اور ”مع الصادقین“ کی سطح کا گزرے۔ ایسا ہونا ممکن ہے اور وہ اس طرح کہ انسانی جسم کوئی ہزاروں اعضاء پر مشتمل ہے۔ ان اعضاء میں سے جب بھی کوئی عضو حرکت کرتا ہے تو نیکی کا کام ہو رہا ہوتا ہے یا گناہ کا تیسری کوئی چیز نہیں۔ جب بھی زبان آٹکھ کان ہاتھ پاؤں وغیرہ میں سے کوئی ایک عضو یا مل کر تمام اعضاء حرکت کرتے ہیں تو نتیجے کے طور پر نیکی سرزد ہو رہی ہوتی ہے یا برائی تیسری کوئی چیز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے صرف عبادت کیلئے پیدا کیے جانے کا مطلب ہے کہ سن شعور سے لیکر آخری سانس تک جب بھی انسان کا کوئی عضو حرکت کرے نیکی کیلئے کرے یا برائی کیلئے کبھی نہیں۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت کہ جب بھی کوئی عضو نیکی کیلئے حرکت کرتا ہے تو متوازن قرآن و سنت کے کسی نہ کسی حکم کی پیروی ہو رہی ہوتی ہے اور جب بھی یہ عضوی حرکت گناہ کا ارتکاب کر رہی ہوتی ہے تو متوازن شریعت کے کسی نہ کسی حکم کی مافرمانی ہو رہی ہوتی ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ نیکی ہی نیکی کرنے والا مومن اس لیے چلتا پھرتا قرآن ہوتا ہے کہ اس کا سوا اس کا جائگنا اس کا غسل کرنا اس کا وضو کرنا اس کا کھانا اس کا پینا غرضیکہ اس کا ہر فعل قرآن و سنت کے مطابق ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے فرمایا:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن

قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

پھر جس طرح ایک انسانی عضو سے سرزد ہونے والا عمل نیکی ہوتا ہے یا گناہ اسی طرح ایک انسان

سے سرزد ہونے والا کوئی کام (Job) بھی ایک طرح سے کیا جائے تو نیکی بن جائے اور دوسری طرح سے کیا جائے تو وہی کام گناہ کا کام بن جائے۔ مثال کے طور پر ایک حج ہو سکتا ہے کسی کیس کی تک پہنچنے کے لیے تین سال لگا دے۔ اس دوران ظاہر ہے شواہد و قرائن سے ہی اندازہ لگا کر کیس کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے خود تو بافضل وہ موقع پر موجود نہیں ہوتا۔ اگر وہ حج ساعت کا یہ کام پوری نکلن دیا انتداری اور جانفشانی سے کرتا ہے تو فیصلے کی پھر بھی دو صورتیں ہو سکتی ہیں یعنی فیصلہ غلط بھی ہو سکتا ہے اور صحیح بھی۔ اگر فیصلہ صحیح ہو جائے تو حج کو دوہرا ثواب حاصل ہوتا ہے اور اگر فیصلہ غلط ہو جائے ہے تو شریعت کہتی ہے کہ اس کو اکہرا ثواب ضرور ہوگا۔ ہر دو صورتوں میں اس حج کا اس کیس میں لگایا ہوا تین سال کا متعلقہ وقت بطور ”عبادت“ شمار ہوگا۔ لیکن وہی حج اسی کیس کا فیصلہ سناتے وقت کسی دوست رشتے دار وغیرہ کی سفارش پر یا رشوت وصول کر کے ڈنڈی مار جائے تو وہی وقت جو تین سالوں میں اس نے اس کیس پر صرف کیا اس کے نامہ اعمال میں بطور گناہ درج کیا جائے۔ ذرا سادہ معاملہ لیکن تو مثال کے طور پر ایک کاشکار صبح نہٹا ہے۔ اپنے کھیت پہنچ کر اپنی فصل کاٹتا ہے۔ گمراہ کھیت کرتا ہے اور جانوروں کو کھلاتا ہے تو جتنا وقت اس نے اس کام میں لگایا بطور نیکی شمار ہوگا۔ بصورت دیگر یعنی فصل کاٹتے وقت وہ اپنے کھیت کی کاٹی ہوئی فصل کے ساتھ پڑوسی کے کھیت سے پڑوسی کی فصل کاٹ کر شامل کر لیتا ہے تو وہ پورا وقت جو اس پورے کام میں اس نے لگایا بطور گناہ شمار ہوگا۔ غرضیکہ انسان سے سرزد ہونے والا کوئی بھی کام اگر جائز طریقہ (قرآن و سنت کے مطابق) سے کیا جائے تو نیکی ہوگا اور اگر ناجائز طور سے کیا جائے تو بدی ہوگا تیسری کوئی چیز نہیں۔ محض عبادت کیلئے پیدا کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ جائز طریقے سے نیکی کیلئے ہونا جائز طریقے سے بدی کیلئے کبھی نہ ہو۔

سورۃ ذاریات کی مذکورہ آیہ مبارکہ پڑھنے سے ایک اور اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس آیہ کریمہ میں صرف دو حقوقات یعنی جن اور انسان کا ذکر ہے۔ اس سے کیا یہ مطلب لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کو ان دو حقوقات سے عبادت مطلوب ہے باقی کروڑوں حقوقات سے نہیں۔ عبادت تو یقیناً ہر حقو کی درکار ہے بلکہ قرآن بار بار اس بات کا اعادہ کرتا ہے کہ زمین و آسمان میں موجود ہر حقو ہر لمحہ ہر آن محو عبادت ہے۔ تسبیح و مناجات میں مصروف ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ چیز جو زمین میں ہے۔

مذکورہ آئے کریمہ میں صرف دو جھوٹات کا ذکر کیا گیا باقی کائناتیں تو اس لیے کہ ان دو جھوٹات بالخصوص انسان کی حیثیت دوسری تمام جھوٹات سے یکسر مختلف ہے۔ انسان (اور کسی حد تک جن) کو اللہ تعالیٰ نے ایک مقررہ مدت تک نہ صرف صوابدیدی اختیارات دے رکھے ہیں بلکہ دوسری بہت سی صلاحیتیں اور اہلیتیں بھی عطا کر رکھی ہیں جو دوسری جھوٹات کو مائل نہیں۔ یعنی انسان کو اللہ تعالیٰ نے اختیار و ارادہ کی صلاحیت و ودیعت کر رکھی ہے کہ وہ چاہے تو نیکی کرے اور چاہے تو بدی۔ چاہے تو اللہ تعالیٰ کو بھی مانے اور چاہے تو نہ مانے۔ سورج چاند پانی ہوا وغیرہ میں یہ صلاحیت ہے ہی نہیں۔ دوسری جھوٹات بے چون و چرا پابند ہیں اس کام کے کرنے کی جو اللہ تعالیٰ نے ازل سے ان میں سے ہر ایک کو تفویض کر رکھا ہے۔ سورج کو مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے روشنی اور گرمی مہیا کرنے کا کام دے رکھا ہے۔ سورج کی کیا مجال کہ وہ دیئے گئے کام سے بال برابر بلکہ بال کا کروڑواں حصہ بھی انحراف کرے۔ وہ نہیں کر سکتا کہ کسی دن نہ چڑھے اس لیے کہ اس کی طبیعت ماساز ہے یا یہ کہ وہ کسی ورکشاپ میں زیر مرمت ہے۔ وہ دیئے گئے کام سے سر مو انحراف نہیں کر سکتا اور اس کا ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے اس کام کو کئے جا مای اس کی عبادت ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کسی حقوق کو عبث اور بے فائدہ دیا ہے مقصد پیدا نہیں کیا خواہ وہ حقوق چھوٹی سے چھوٹی بمثل یکٹیر یا ہویا بڑی سے بڑی بمثل آسمان ہوا انسان کو بھی کیا کوئی کام دے رکھا ہے اور اگر دے رکھا ہے تو وہ کام ہے کیا؟ ظاہر ہے انسان کو دیا جانے والا کام افضل بھی ہو گا اور عظیم بھی اس لیے کہ یہ حقوق نہ صرف شرف و فضیلت کی حامل ہے بلکہ دوسری ہر حقوق کو اللہ تعالیٰ نے بنایا ہی ایسا ہے کہ جو انسانی ضرورت کے عین مطابق اور موزوں ہو۔ ایسا ہی ہے رب کائنات نے انسان کو زمین میں کرنے کا کم و بیش وہی کام دے رکھا ہے جو خود رب کائنات باقی کائنات میں براہ راست کر رہا ہے۔ وہی اللہ تعالیٰ کی حاکمیت جو باقی کائنات میں براہ راست جاری و ساری ہے اللہ تعالیٰ کے طے کردہ پروگرام کے مطابق زمین میں انسان کے ذریعہ سے نافذ کرنا مطلوب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے آغاز ہی میں یعنی سورہ بقرہ کے چوتھے رکوع میں جہاں فرشتوں کو عند یدیا ہے کہ وہ زمین میں خلیفہ بنانے والا ہے رکوع کے اختتام سے پہلے یعنی اس رکوع کی آخری آیت میں

نہ صرف کار خلافت کا بھی ذکر کیا ہے بلکہ اس کی نوعیت کا بھی۔ فرمایا:

”ہم نے کہا کہ ”تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ پھر میری طرف سے جو ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کیلئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔“

اس آیت مبارکہ میں ایک تو اس کام کی وضاحت ہو گئی جو انسان نے زمین میں کرنا ہے یعنی دنیا میں ہدایت الہی کے مطابق نظام کا قیام اور دوسرے اس امر کی وضاحت کہ انسان کو ارادہ و اختیار (Discretionary Powers) کی صلاحیت حاصل ہے۔ چاہے تو وہ الہی قوانین مانفذ کرے جس صورت میں وہ کامیاب قرار پائے گا اور چاہے تو وہ آسمانی ہدایت کو ٹھکرا دے جس صورت میں وہ ایسی آگ میں ڈالا جائے گا جو کبھی بجھنے والی نہیں۔ یہ بھی اس آیت سے عیاں کہ جب وہ اپنا نظام زندگی الہی قوانین کے مطابق استوار نہ کرے گا تو پھر اپنے خود ساختہ قوانین مانفذ کرے گا اس لیے کہ بہر صورت اس نے زندگی تو اس دنیا میں گزارنی ہے۔ کار خلافت یعنی وہ کام جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو تفویض کیا ایک جملے میں بیان کیا جاتا ہے تو یہ کہ ”زمین پر انسانوں کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ قوانین کی حکومت“ اور اگر ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو بس ”خلافت“۔ اس جملے کے پہلے حصے میں تین اہم پالیسی امور بیان کیے گئے۔ ایک تو یہ کہ ایسی اللہ تعالیٰ کی بالواسطہ حکومت صرف ایک کرہ یعنی کرہ ارض پر ہے باقی کرات پر نہیں وہاں اللہ تعالیٰ کی حکومت براہ راست ہے۔ دوسرے یہ کہ ظاہر ہے کہ جس کا بنایا ہوا قانون مانفذ ہو حکومت اسی کی ہوتی ہے لہذا زمین پر بھی اللہ تعالیٰ ہی کی حکومت ہے اس لیے کہ حاکمیت صرف ایک اسی ہستی کو سزاوار ہے۔ اور تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کی حکومت معرض وجود آتی ہے تو صرف اس صورت میں کہ دنیا میں الہی قانون مانفذ ہو۔ جملے کے دوسرے حصے میں ایسی حکومت کو خلافت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے تو اس لیے کہ اصل حاکم غیب میں ہے اللہ تعالیٰ خود زمین پر حکمرانی کوئی اپنا دفتر کھول کر نہیں کر رہا۔

قرآن مجید مزید پتہ دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ قیام خلافت کا کام بطور امانت دے رکھا

ہے۔ بلکہ پیشکش ہونے پر انسان نے اس عظیم کام کو کرنے کا ہر ضار و غلبہ خیرا خود اٹھایا ہے۔ قرآن مجید میں آیا:

ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کیلئے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اٹھالیا بے شک وہ ہذا ظالم اور جاہل ہے۔“ (احزاب: 72)۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ کام ہی بطور امانت نہ دیا بلکہ وہ صلاحیتیں (Faculties) اور سہولتیں (Facilities) بھی بطور امانت عطا کیں جن کو نہ بغیر وہ اس قابل ہی نہ ہو سکتا تھا کہ وہ زمین پر اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم کرنے کا کام سرانجام دیتا۔ ان صلاحیتوں اور سہولتوں کو عطا کرنے کا ذکر بھی اکتاب میں آیا۔

فرمایا گیا:

”جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا ”میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں پھر جب میں اس کی نوک پلک ٹھیک کر دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ“ (ص: 72)۔

اس آیت مبارکہ اور سورہ احزاب کی مذکورہ آیت مقدسہ سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے انسان ایک عام ہی مخلوق تھی اس لیے کہ شروع میں ہی انسان اگر اشرف المخلوقات ہوتا تو دوسری مخلوقات کو کار خلافت کی پیشکش کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ جب آخر ہونے پر انسان نے خود اس بار امانت کو اٹھالیا تو پھر یہ ”نوک پلک ٹھیک کرنے“ کا مرحلہ آیا۔ نوک پلک ٹھیک کرنے میں کیا کیا گیا وہی کہ انسان کو بولنے سمجھنے سوچنے تمیز کرنے فیصلہ کرنے کی صلاحیتیں دیں۔ اختیار و ارادہ کی صفت صرف رب کائنات کو سزاوار ہے۔ جب اللہ ہی کی حکومت کو زمین پر قائم کرنے کا ہر انسان نے اٹھالیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے ”نعمت فید من روحی“ کی شکل میں اسی اختیار و ارادہ کی صفت کا کچھ پر تو انسان میں ودیعت فرمایا۔ اس قدر عز و شرف انسان کو عطا کرنے کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ انسان کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں تو غالباً یہ وہ سجدہ نہ تھا جو ہم انسان یا دوسری مخلوقات اللہ کے حضور کرتی ہیں۔ دراصل دنیا و آخرت میں کیے جانے امور کی نگرانی اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو دے رکھی ہے (مدبر استہ امر)۔ تو ان نگرانوں کو اللہ تعالیٰ نے جب انسان کے سامنے سجدہ ریز

ہوئے کو کہا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اب ہر وہ چیز جو ان فرشتوں کی نگرانی میں ہے انسان کیلئے مضر ہے۔  
 لہذا اب وہ کوئی مزاحمت کرنے کی بجائے خود بھی انسان کیلئے مدد و معاون بن جائیں تاکہ انسان روئے زمین پر  
 اللہ تعالیٰ کی حکومت کرنے کا فریضہ بطریق احسن ادا کر سکے۔

یہ تمام سہولتیں اور اہلیتیں عطا کرنے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اور سہولت کا مہیا کرنا  
 ضروری تھا۔ یہ سہولت تھی اللہ تعالیٰ کے ان قوانین و فرامین کی فراہمی کی کہ جن کو مانڈ کر کے ہی کارِ خلافت کی  
 تکمیل ہو سکتی تھی۔ ان قوانین و فرامین کو ایک ہی وقت میں انسانیت کے سپرد نہیں کیا جاسکتا تھا اس لیے کہ پوری  
 انسانی تاریخ پر حمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ ان میں وقفہ فوقتاً ترمیم و تبدیلی مانڈی رہی تھی۔ بنابرین ضروری تھا کہ  
 پوری انسانی تاریخ پر آسانی کتابوں کا نزول اور انبیاء کی بعثت اس وقت تک ہوتی رہتی جب تک کہ دین حق کی  
 حتمی اور آخری تکمیل نہ ہو جاتی اور سلسلہ تنزیل کتب اور بعثت انبیاء کو منقطع نہ کر دیا جاتا۔ ایسا ہی ہوا اور اس  
 ساری حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور شیطان کو زمین پر بھیجنے کے آخری مرحلے جیسا کہ بقرہ: 29 میں بیان  
 ہوا بصراحت واضح کر دیا۔

نتیجہ نکلا اس پہلے پیکر کی گفتگو کا تو یہ کہ مقصدِ تخلیقِ آدم عبادت ہے۔ عبادت کے تین مفہیم ہیں اور  
 ان تینوں مفہیم کے اعتبار سے عبادت کا مقصد پورا ہوتا ہے تو ایک اس صورت میں کہ دنیا میں نظامِ خلافت  
 قائم ہو۔ بنابرین مقصدِ تخلیقِ آدم ٹھہرا..... قیام و دوامِ خلافت۔ وہ شخص جو اس دنیا کی زندگی میں قیامِ خلافت  
 کے کام کو سرانجام نہیں دیتا مقصدِ تخلیقِ آدم سے بے بہرہ رہ کر زندگی گزارتے ہوئے اپنے رب کے پاس لوٹتا  
 ہے جو انتہائی خسارے کا سودا ہے۔ ہر فرد نے دنیا میں ایک ہی بار آنا ہے دوسری بار کبھی نہیں۔

## اسبابِ زوالِ امت

رب کائنات نے جو ذرائع اور قدرتی وسائل مسلمانوں کو دے رکھے ہیں، کسی دوسری قوم کو نہیں دیئے۔ محل وقوع ایسا کہ روس، چین، امریکہ، آسٹریلیا وغیرہ جیسے ممالک کو تو اللہ تعالیٰ نے قطبین اور جہان میں پھینک رکھا ہے جب کہ اسلامی دنیا کرۂ ارض کے صین وسط میں۔ دنیا بھر کی بری بحری فضائی شاہراہیں دنیائے اسلام ہی سے گزرتی ہیں۔ تقریباً تمام درے اور آبی گزرگاہیں اسلامی دنیا میں واقع ہیں۔ آب و ہوا جو مسلمان دنیا کو عطا کی گئی ہے تو ایسی کہ سورج ہر وقت اسلامی دنیا میں کہیں نہ کہیں چمکتا رہتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہر موسم کی اجناس، سبزیاں اور پھل وقت کے کسی بھی موڑ پر کہیں نہ کہیں اسلامی دنیا میں دستیاب ہوتے ہیں۔ افرادی قوت اتنی کہ دنیا میں ہر چوتھا آدمی مسلمان ہے۔ سرمائے کی وہ فراوانی کہ دنیا بھر کے کارخانے، فیکٹریاں اور بینک اوپیک ممالک کی دولت کے مرہون منت ہیں۔ معدنی وسائل بالخصوص معدنی تیل کے ذخائر تو ایسے جیسے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر مسلمان سرزمینوں میں موجزن ہے۔ سندھ طاس اور نیل ڈیلٹا جیسے عظیم نہری منصوبے مسلم دنیا میں واقع ہیں اور سب سے بڑھ کر قرآن و سنت جیسے ہدایت کے عظیم سرچشمے اللہ تعالیٰ نے ملتِ مسلمہ کی تحویل میں دے رکھے ہیں۔

بائیں ہندوستان میں آج کی دنیا میں پستی و گراؤ کی انتہا گہرائیوں میں سرگرواں۔ شاذ و نادر ہی کوئی دوسری قوم اس قدر ذلت و مسکنت سے دوچار ہے کہ جتنی ملتِ مسلمہ۔ اس وقت بلکہ ایک لمبے عرصے سے دنیا کی قیادت کاغذ و شریکین کے ہاتھ میں ہے۔ دنیا میں غلبہ شر کا ہے۔ اس لیے کہ ڈرائیونگ سین پر کفر برائمان ہے۔ دنیا کی پچاس اقامت متحدہ میں پانچ ممالک وینو پاور کے حامل ہیں چار لیکر ڈھونڈیں ان میں ایک بھی مسلمان ملک نہیں۔ تقریباً پانچ درجن مسلم ممالک اگر تمام کے تمام کوئی قرار داپاس کر لیں وینو بہادر کی ایک ٹھوکراں کی دھجیاں بکھیر دیتی ہے۔ جہاں کہیں دنیا میں جنگ ہو رہی ہے سب مسلمان سرزمینیں ہیں۔ کفار و شرکین کی پروردہ خواہش ہے کہ مسلمانوں کو ان کی اپنی زمینوں پر تہ تیغ کیا جائے۔ ارزانی ہے دنیا میں تو خون

مسلم کی اور ویرانی ہے تو عصمتِ مسلم کی۔ روتے ہوئے چنتی عورتیں صبح و شام اٹھتے جتاڑے، اجتماعی قبریں مقدر  
ہے تو صرف مسلمانوں کا۔ اغیار کا داؤ لگ گیا مسلمانوں کو لڑا کر ان کے وسائل لوٹنے کا۔ سچ کہا علامہؒ نے:

ننان بر گہ گل تک بھی نہ چھوڑا اس باغ میں گلچیں

تری قسمت کو رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

مسلمانوں کی بے بسی و بے کسی اور بے بسی و بے مانگی کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ان کے جیتے  
جی اہانت کی جارہی ہے عظیم تر کتاب..... قرآن مجید کی اور عظیم تر پیغمبر..... نبی کائنات ﷺ کی لیکن ڈوب  
مرنے کا مقام ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان کسی گستاخ کا بال تک بیکار نہیں کر سکتے۔ کہاں وہ مقام کہ امتِ مسلمہ کو  
اللہ تعالیٰ نے ”حیر امت“ اور ”نہب وسط“ جیسے عظیم القاب سے نوازا اور کہاں یہ مقام کہ امتِ مسلمہ فٹ پاتھ  
پر پڑے تر بوز کے چھلکے کی حیثیت اختیار کر گئی کہ اسے چلنے والے عام راہروں کو مار کر جی چاہے تو دائیں پھینک  
دیں اور جی چاہے تو بائیں صبح و شام پتلا چھلکا بے رحم خوکروں کے رحم و کرم پر۔ سوال پیدا ہوتا ہے یہ المناک و  
اندوہناک صورت حال پیدا ہوئی ہے تو کیوں؟ بربادیِ مسلم کے اسباب ہیں تو کیا؟

کوئی اٹھتا ہے تو مسلمانوں کے زوال کی وجہ ٹیکنا لو جی میں کی قرار دیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں  
کہ مسلمانوں کے ہاں ٹیکنا لو جی کا فقدان ہے۔ مسلم دنیا میں کوئی ہوائی اڈا معرض وجود میں نہیں آ سکتا جب تک  
کہ بنے بنائے ہوائی جہاز اپورٹ نہ کئے جائیں۔ اور تو اور کسی مسلمان کی کلائی اس وقت تک نہیں جگ سکتی  
جب تک کہ گھڑی دساور سے بن کر نہ آئے۔ 1967ء میں دشمن نے متحدہ عرب علاقے چند دنوں کی معمولی  
مزاحمت کے بعد ہتھیار لیے۔ وجہ یہ تھی کہ عربوں کے پاس اپنے دفاع تک کیلئے اسلحہ کے انبار دشمن ہی سے  
حاصل کردہ تھے جو محض کھاڑیئے کا مال تھا۔

اسی طرح کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ مسلمانوں کے ہاں شرح خواندگی کم ہے اور یہ بھی بہت حد تک  
درست ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ مسلمانوں میں اتحاد کا فقدان ہے۔ کفار و شرکیں متحد ہیں جب کہ اسلام والے  
منتشر۔ یہ بھی درست ہے۔ غرضیکہ متحدہ آراء مسلمانوں کی موجودہ پستی و زوال کی لیکن ہمارے ہاں یہ کم ہی  
شعور ہے کہ یہ جتنے اسباب بیان کیے جاتے ہیں اصل میں اسباب نہیں نتائج ہیں زوال کی اس وجہ کے جو سونہ



بختی اور جھل ہے، مسلمانوں کو اس کا شعور تک نہیں۔ یعنی مسلمانوں کی ذلت و خواری اور پستی و زوال کا صرف ایک سبب ہے اسباب ہیں ہی نہیں۔ صرف ایک وجہ ہے وجوہات ہیں ہی نہیں۔ اے کاش! مسلمان اس ایک سبب سے آگاہ ہوتے لیکن شواہد و قرائن بیا تک دلی بتا رہے ہیں اور یہ ایک عظیم المیہ ہے کہ مسلمانوں کا زوال صرف ایک وجہ سے اور مسلمان ہیں کہ اس ایک وجہ سے بے بہرہ ہونا آشنا۔

وہ ایک وجہ یہ ہے کہ اس دین میں جو رسول ﷺ امت کے سپرد کر کے گئے تھے اور آج ہمارے اختیار کردہ دین میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دور خلافت راشدہ کے بعد کوئی چودہ سو سال سے ہمارے ہاں ملوکیت نے ڈیرے بھاڑ رکھے ہیں۔ ملوک اس دوران کوئی ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھے رہے۔ وہ قرآن مجید میں تو کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے تھے اس لیے کہ اس کے تحفظ کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے لیکن مقدور بھر کوشش کی انہوں نے قرآن و سنت کے نظام..... نظام خلافت کو بد کرنے کی بلکہ بگاڑنے کی۔ بڑی اور بنیادی تبدیلی تو اسی وقت آگئی جب خلفائے راشد کو چلتا کر کے ملوک آدمکے۔ پہلے بیعت کے ذریعہ خلفاء کا انعقاد ہوتا تھا پھر حکومت کے ذریعے بیعت ہونے لگی۔ اس ہمارے قد تبدیلی سے ہندوں کو موقع مل گیا کہ وہ خواہشات و مفادات پر مبنی قوانین کو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ قرآن و سنت پر مبنی قوانین میں غلط سلط کر کے اپنی مرضی کا نظام (دین) رائج کریں۔ سوائے حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کے چند سالہ دور خلافت کے ملوک جس حق میں من پسند تبدیلیاں کرتے رہے اور شومی قسمت یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ سب سے بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ خلیفہ المسلمین کو چلتا کر کے جدی پشتی حکومتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے دو رومیہ پھر دو بنو عباس پھر عثمانیوں کا دور اور پھر دو غلامی سے گزرنے کے بعد طوائف اُملو کی یعنی وہ نظام جس میں آج ہم مسلمان رہ بس رہے ہیں۔ قرآن و سنت کی رو سے پوری اسلامی دنیا کی باگ ڈور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ایک خلیفہ المسلمین کے ہاتھ میں ہونا تھی۔ خلیفہ المسلمین جیسے کہ ان الفاظ سے عیاں ہے کی تعریف ہی یہ ہے کہ پوری دنیائے اسلام کا واحد سربراہ۔

خلفاء راشدین کو چلتا کر کے ملوک آئے تو چونکہ حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں تھی وہ خود کو خلیفہ کہلاتے رہے۔ ظاہر ہے جب دور خلافت یعنی قرآن و سنت کے خالص احکامات پر مبنی نظام نہ رہا تو خود کو

خلیفہ پہلوانا اسی طرح غلط تھا جس طرح کہ دور خلافت کو تیار کر دوہر ملوکیت کو لانا۔ حق نکرانی جو صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے بطور امانت (خلافت) صرف خلیفۃ المسلمین کو حاصل ہے۔ ان ملوکوں نے اس حق کو چھینا اور آج تک چھینے ہوئے ہیں۔ بنامیں یہ غاصب تھے اور غاصب ہیں۔ غلط بات ہے کہ سقوط خلافت 1924ء میں ہوا۔ سقوط خلافت تو اسی وقت ہو گیا جب دور خلافت راشدہ کو منقطع کر دیا گیا۔ ہاں 1924ء میں اس انگیزی لوی مرکزیت کا اختتام ہوا جو جیسی جیسی تھی اس وقت تک بہر حال موجود تھی۔ درحقیقت 1924ء میں سقوط مرکزیت ہوا، سقوط خلافت نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دور ملوکیت میں فتوحات بھی ہوئیں۔ خوشحالی کے دوار بھی آئے لیکن ملوک نے جس حق کی بچ کئی کی تو بے دریغ دل بھول کر۔

ہم نے اوپر ذکر کیا کہ اس دین میں جو رسول ﷺ امت کے سپرد کر کے گئے اور جو دین آج ہم نے اختیار کر رکھا ہے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پہلا بڑا فرق جو پیدا کیا گیا تو یہ کہ سپرد کردہ دین میں خلیفۃ المسلمین کا وجود تھا جب کہ آج ہمارے اختیار کردہ دین میں نہیں اور صدیوں سے یعنی اس وقت سے نہیں جب دور خلافت راشدہ کو دور ملوکیت میں بدل لایا گیا۔ نئی کائنات ﷺ دنیا میں تشریف لائے تھے تو دور جہالت تھا اور جب تشریف لے گئے تو دور خلافت تھا۔ کون وہاں شاہ دور نبوت کا حامل خلیفہ کا انعقاد اور خلافت کا قیام تھا۔ دور نبوت میں حرا و ثور کی ریا نہیں بھی ہوئیں، حبشہ و مدینہ کی ہجرتیں بھی ہوئیں، صلوٰۃ و زکوٰۃ کی عبادتیں بھی ہوئیں، بدروجنیں کی کاوشیں بھی ہوئیں لیکن یہ سب ذرائع (Means) تھے ہدف تھا تو اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا کام۔ قیام خلافت۔ خلیفۃ المسلمین کا چلتا کرنا اور دور خلافت راشدہ کو منقطع کرنا ان تمام محنتوں، جانفشانیوں اور قربانیوں کا نتیجہ کرنا تھا جو دور نبوت میں رسول ﷺ اور ان کے ساتھیوں نے کیں۔ اللہ و رسول ﷺ نے نظام خلافت کو اس قدر ترجیح دی تو اس لیے کہ نظام خلافت کے بغیر قرآن و سنت پر عمل ہو ہی نہیں سکتا اور یہ وہ حقیقت ہے کہ جو مسلمانوں سے اوچھل ہوئی تو اس قدر رک اور تو اور خود مگر اب و سب سے اس کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔ خس فخر اور لیل و نهار پریشان کہ دین حق کی بنیادیں مسمار ہو گئیں لیکن مسلمانوں نے اسے اس سنجیدگی اور فکر مندی سے نہ لیا کہ جو اس کا حق تھا۔

نکماء کی تحقیق کے مطابق انسانی جسم میں چار اعضاء ایسے ہیں کہ جن میں سے اگر ایک میں بھی

معمولی سائنس بھی پڑ جائے تو انسان تیار ہو جاتا ہے اور اگر ان اعضاء میں سے کوئی ایک ہی جواب دے جائے تو یہی موت ہے۔ یہ چار اعضاء رکیہ ہیں دل، دماغ، معدہ اور جگر۔ اسی طرح دین اسلام میں چار اجزائے رکیہ ہیں اس لیے کہ ان کا خود قرآن مجید میں ذکر ہے۔ خلیفہ المسلمین کا وجود ہو تو یہ چاروں قرآنی ادارے آمو جو ہو تے ہیں۔ بصورت دیگر یعنی خلیفہ المسلمین کا وجود نہ ہو تو یہ ادارے معدوم ہو جاتے ہیں۔ آئیں دیکھیں وہ چار ادارے کون سے ہیں؟

## 1۔ اولوالامر

اولوالامر کا مطلب ہے صاحب امر لوگ یا اہل حل و عقد۔ اس میں خلیفہ المسلمین کے علاوہ وہ تمام لوگ شامل ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی طور ایسے عہدوں پر فائز ہوتے ہیں جہاں پالیسی امور طے ہوں۔ یعنی اس میں شامل ہوتے ہیں گورنر، وزیر، کارکن عدلیہ، کارکن شوریٰ، فوج و دوسرے قومی اداروں کے سربراہان، اہل فکر و دانش وغیرہ۔ ویسے تو سیکولر نظاموں میں بھی ظاہر ہے صاحب امر لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن تین امتیازی شرائط ہیں جو شرعی اولوالامر کو عام صاحب امر لوگوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ شرعی اولوالامر ہونے کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ مسلمانوں میں سے ہوتے ہیں، غیر مسلموں میں سے نہیں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کے پابند ہوتے ہیں اور تیسری شرط یہ کہ خلیفہ المسلمین کو ان میں مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اولوالامر کی اطاعت کو مشروط ہی اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کے بعد اور تحت لازم قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں آیا:

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ و رسول ﷺ کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریق کار اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے“ (نساء: 59)۔

وہ نظام اطاعت جسے ہمارا خالق و مالک..... رب کائنات ”صحیح طریق کار اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر“ قرار دے رہا ہے آج ہمارے اختیار کردہ دین سے معدوم ہے اور اس وقت سے معدوم ہے جس

وقت سے خلیفہ المسلمین کا وجود اس میں نہیں یا دوسرے لفظوں میں جب سے دور خلافت راشدہ کو منقطع کر دیا گیا۔ عین اس وقت سے ہمارا نظام اطاعت درہم برہم ہے۔ ”خود بدلے نہیں“ قرآن کو بدل دیتے ہیں“ کے مصداق ہم دو اطاعتوں یعنی اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کے عادی ہو چکے ورنہ قرآن مجید ان دو اطاعتوں کے ساتھ تیسری یعنی اولوالامر کی اطاعت کو لازم قرار دیتا ہے اور وہ اس لیے کہ اولوالامر وہ قرآنی ادارہ ہے کہ جس نے وقت کے کسی بھی موڑ پر اسلامی دنیا میں قرآن و سنت کے احکامات کو نافذ کرنا ہوتا ہے یا دوسرے لفظوں میں نظام خلافت کو رواں دواں رکھنا ہوتا ہے۔ جب سے ہمارے ہاں نظام خلافت نہیں عین اس وقت سے ہمارے ہاں اولوالامر نہیں ہیں۔ نظام خلافت کے بغیر قرآن مجید کی مذکورہ وراسی قبیل کی آیات پر ماقیامت عمل نہیں ہو سکتا۔ بصورت موجودہ ماقص ہے ہماری اطاعت اور ماقص ہے ہمارا اختیار کردہ دین۔

## 2۔ امت مسلمہ

دوسرا قرآنی ادارہ جو آج ہمارے اختیار کردہ دین میں نہیں امت مسلمہ کا ادارہ ہے۔ خلیفہ المسلمین اور نظام خلافت موجود تھا تو امت مسلمہ کا وجود بھی تھا۔ نظام خلافت نہ رہا تو مرکزیت کے درہم برہم ہونے سے ہمارے ہاں امت مسلمہ کا وجود نہ رہا، امت اقوام میں تحلیل ہو گئی۔ زیر آساں آج امت مسلمہ کا وجود کہیں نہیں۔ اقوام ہیں مصری قوم، شامی قوم، ایرانی قوم، افغانی قوم، غرضیکہ ان امت اقوام جو اکثر و بیشتر مصروف ہوتی ہیں تو ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے (Leg Pulling) میں۔ ہمہ وقت امت مسلمہ کا دین میں ہونا محکم دینی تقاضا ہے اس لیے کہ بہت سے دینی فرائض کی ادائیگی صرف امتی سطح پر ممکن ہے۔ علماء کرام، سیاستدان اور ہر دانشور خواہش رکھتا ہے کہ مسلمانانِ عالم متحد ہوں۔ لیکن یہ نہیں بتاتا کہ دنیائے اسلام کی سطح کا اتحاد کیسے ہو؟ بلکہ بھول جاتا ہے کہ اتحاد کی اعلیٰ ترین صورت وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی وضع کردہ اور رسول ﷺ کی آزمودہ..... پوری اسلامی دنیا کے ذرائع و وسائل کا ایک خلیفہ المسلمین کے ہاتھ میں ہوا۔ نظام خلافت کو تیاگ کر ہم مسلمان اتحاد کی اس اعلیٰ ترین اور فطری صورت سے آج محروم ہیں۔ نظام خلافت قائم نہ ہو تو قرآن کریم کی مشہور آیت کہ ”سب لکرا اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفریق میں نہ پڑو“ (آل عمران: 103) پر ماقیامت عمل نہیں ہو سکتا اور اس پر عمل نہ ہو تو مزید درج ذیل آیت پر بھی عمل نہیں ہو سکتا:

”جو لوگ منکر حق ہیں وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں۔ اگر (مسلمانو) تم یہ نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہوگا“ (انفال: 73)۔

ان دو آیات پر عمل نہ ہو تو درج ذیل تیسری آیہ مبارکہ پر بھی عمل نہیں ہو سکتا:

”اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس پہلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے لکھوڑے (فیکٹالوجی اور جدید اسلحہ) ان کے مقابلہ کیلئے مہیا رکھو تا کہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعداء کو خوفزدہ رکھو جنہیں تم نہیں جانتے اللہ جانتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدل تمہاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمہارے ساتھ ہرگز ظلم نہ ہوگا“ (انفال: 60)۔

مذکورہ تین آیات پر عمل نہ ہو تو درج ذیل چوتھی آیت یعنی شہادت علی الناس کا فرض ادا نہیں ہو سکتا:

”اور اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک ”امت وسط“ بنایا ہے تا کہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول ﷺ تم پر گواہ ہو“ (بقرہ: 143)۔

مذکورہ چار آیات پر عمل نہ ہو تو دنیا بھر کے انسانوں کی اصلاح و رہنمائی اور عالمی سطح پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وہ فرض جو ملت مسلمہ کو خیر امت ہونے کے کماٹے سے ادا کرنا ہے اور جو درج ذیل آیے مقدسہ میں بیان ہوا ہے، اس کی تکلیف کے متعلق بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ ”اے خیال ست و محال ست و جنوں“۔

”اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کیلئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو“ (آل عمران: 110)۔

یہ تو چند آیات کا ذکر ہوا لیکن پورے قرآن مجید کے احکامات اس قدر باہم مدغم اور ایک دوسرے سے گندھے ہوئے ہیں کہ اگر یہ کہا جائے کہ نظام خلافت کی عدم موجودگی میں پورے قرآن پر کما حقہ عمل نہیں ہو سکتا تو اس بات کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ ”ادخلوا فی السلم کافہ“ کی صورت حال پیدا ہو سکتی ہے تو نظام خلافت کے ہوتے ہوئے ورنہ یہ منظر دنیا میں کبھی دیکھنے میں نہیں آ سکتا۔ اور تو اور صرف اللہ شہادت علی الناس کو لے لیں۔ قرآن و سنت کے احکامات کو انسانیت تک پہنچانے کے لیے دوجی راستے ممکن ہیں یعنی قول و فعل کے ذریعہ سے۔ جدید ذرائع کی موجودگی میں بذریعہ قول تو رسالت دین کا کام کچھ ہو سکتا ہے لیکن فعلاً تو صحیحی ہو کہ

نظام خلافت بالفعل کسی خطہ زمین میں رواں دواں ہونا کہ دنیا والے اس نظام کے فیوض و برکات پر چشم سرد کیج سکیں۔

### 3۔ شورئی

دین حق کا ایک اور اہم جز شورئی ہے اور اس کا دین میں ہونا بھی ایک قرآنی تقاضا ہے۔ فرمایا گیا: ”(مومن وہ ہیں جو) نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں اور ہم نے جو کچھ بھی رزق انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں“ (شورئی: 38)۔

قرآن مجید میں اکثر و بیشتر صلوٰۃ و زکوٰۃ کا جوڑے کے طور پر ذکر اکٹھا آیا ہے۔ لیکن مذکورہ آیہ مبارکہ میں اس ترتیب کو تو ذکر ان کے درمیان ”اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں“ لایا گیا ہے۔ اس سے دین میں جز شورئی کی اہمیت دو اور دو چار کی طرح واضح ہے۔ مجلس شورئی اور آج ہمارے ہاں رائج پارلیمنٹ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ امتی سح کے ترقیاتی کاموں میں بھی ارکان شورئی کا کردار ہوتا تو ہے لیکن ان کی اصل ذمہ داری کسی ایسی صورت حال یا کوئی ایسا نیا معاملہ کہ جس کے متعلق قرآن و سنت سے براہ راست نص نہ ملے قرآن و سنت ہی سے استنباط کر کے خلیفہ المسلمین کو مشورہ دینا ہوتا ہے۔ کسی حد تک اس ادارے نے انتہائی ادارے کے طور پر بھی کام کرنا ہوتا ہے۔ بنامیں یہ ادارہ مجتہدین یعنی ایسے علماء کرام پر مشتمل ہوتا ہے جن کو حالات حاضرہ کے علاوہ قرآن و سنت پر پورا عبور ہوتا ہے۔ جب کہ پارلیمنٹ نے قانون سازی کرنا ہوتی ہے شورئی کو قانون سازی کی اجازت نہیں انہوں نے قرآن و سنت کی محض تعبیر و تفسیر یا دوسرے انھنوں میں اجتہاد کر کے خلیفہ المسلمین کو مشورہ دینا ہوتا ہے۔ یاد رہے اسلام میں قانون سازی صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے ”ان الحكم الا لله“۔ پارلیمنٹ میں تو مختار حزب اقتدار اور حزب اختلاف ہوتے ہیں لیکن شورئی میں چونکہ قرآن و سنت کی پیروی مطلوب ہوتی ہے، ایسے حزب کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ شورئی ایک امتی سح کا ادارہ ہوتا ہے۔ پتے کی بات جو یہاں کرنی مطلوب ہے یہ ہے کہ ہمارے اختیار کردہ دین میں شورئی کا کوئی وجود نہیں اس لیے کہ ارکان شورئی نے خلیفہ المسلمین کو مشورہ دینا ہوتا ہے جو خود موجود نہیں اور اس وقت سے موجود نہیں جب سے خلیفہ المسلمین کو چنا کر کے ملوک آگئے۔ نتیجہ کے طور پر

صدیاں بیت گئیں ہمارے دین سے شوریٰ کا ادارہ معدوم ہے اور اس وقت سے آج تک اجتہاد کے دروازے بند ہیں۔

#### 4۔ بیت المال

ایک اور ادارہ جو ہمارے اختیار کردہ دین میں نہیں ہے بیت المال کا ادارہ ہے۔ یہ بھی قرآنی ادارہ ہے اس لیے کہ زکوٰۃ جس کا قرآن مجید میں بار بار ذکر آیا کی کما حقہ ادائیگی بھی ممکن ہے جب بیت المال کا ادارہ موجود ہو۔ دارالخلافہ میں اس کا مرکزی وجود ہوا اور پھر صوبوں، شہروں، قصبوں وغیرہ میں اس کی شاخیں ہوں۔ زکوٰۃ ادا کرنے والوں نے اصل میں اپنی زکوٰۃ کی رقوم بیت المال میں جمع کرنا ہوتی ہیں اور یہ خلافتِ وقت کا کام ہے کہ وہ اسے وظائف کی شکل میں مستحقین میں تقسیم کرے۔ یہ جو ہمارے ہاں اس وقت ہو رہا ہے کہ لوگ اپنی زکوٰۃ اپنے گروپش کے لوگوں میں تقسیم کر دیتے ہیں بیت المال نہ ہونے کی وجہ سے ایک متبادل طریقے کے طور پر رائج ہے ورنہ یہ زکوٰۃ دینے والوں کا زکوٰۃ وصول کرنے والوں کو دست بردار دینا اسلامی طریقہ نہیں ہے۔ اس سے کچھ لوگوں کی عزت و نفس مجروح ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کو ظاہر ہے کیسے پسند ہو سکتی ہے؟

یاد رہے حضرت ابو بکر صدیقؓ کے دور خلافت کے آغاز ہی میں مانعہ زکوٰۃ کا مسئلہ پیدا ہوا تھا۔ شاید ان کو مانعہ کی اصطلاح سے یاد کیا جانا درست بھی ہے یا نہیں اس لیے کہ ان حضرات نے زکوٰۃ دینے سے انکار نہیں کیا تھا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ زکوٰۃ تو وہ نکالتے ہیں لیکن بیت المال میں جمع نہیں کرتے، خود ہی اپنے ارد گرد کے مستحقین میں تقسیم کرتے ہیں۔ خلیفۃ المسلمین کو یہ تھوڑی سی ترمیم مگوار گزری جہذا ان کے خلاف کاروائی کی حتیٰ کہ وہ زکوٰۃ کی رقوم کو بیت المال میں ہی جمع کرانے لگے۔ افسوس بلکہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ خلیفۃ المسلمین نے تو دین میں یہ تھوڑی سی ترمیم بھی گوارا نہ کی اور ہم مسلمان ہیں کہ نہ صرف بیت المال کی دین میں عدم موجودگی سے کجھوتہ کئے ہوئے ہیں بلکہ خود خلیفۃ المسلمین ہمارے دین میں نہ رہا اور ہم ہیں کہ بغیر خلیفۃ المسلمین کے دین کو برضا و رغبت یوں اختیار کئے ہوئے ہیں جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہیں اور فرض کئے ہوئے ہیں کہ ہمارا اختیار کردہ دین وہی ہے جو نبی رحمت ﷺ امت کے سپرد کر کے گئے تھے۔

انسانی جسم سے اگر دل دماغ، معدہ اور جگر کو نکال دیا جائے تو باقی جو کچھ بچے اسے لاش سے موسوم کیا جاتا ہے حالانکہ وہ لاش بھی نامکمل اور اجزوری ہوتی ہے۔ دس حق سے اگر محض خلیفہ المسلمین کو نکال دیا جائے تو اس کی حیثیت اس انڈے کی سی ہو جاتی ہے جس سے زردی نکال دی جائے۔ ایسے انڈے کتنا قیامت سیتے رہیں اس سے بچہ کبھی پیدا نہیں ہوگا۔ ایک کمرے کی چار دیواریں ہوتی ہیں۔ کسی ایک دیوار کو مساکر دیں، کمرہ نہیں ہو کوئی اسے ٹھنڈ رکھے گا۔ اور پھر محض ایک دیوار کا کیا دوسری تیسری حتیٰ کہ چاروں دیواروں کو گر ادیا جائے تو صحیح زمین کا حصہ بن جاتی ہے اور دیکھنے والوں کو ایک قحط نظر آتا ہے۔ بلے سے البتہ یہ پتہ چل جاتا ہے کہ یہاں کبھی کوئی شاندار عمارت تھی۔ ہم جموئی اقدار کے ٹوگر ہو چکے کسی کیلئے شاید یہ بضم کرنا آسان نہ ہو کہ وہ دین جس میں خلیفہ المسلمین کے علاوہ اولوالامر امت مسلمہ شوریٰ اور بیت المال نہیں دس اسلام تو کیا بدعتی کی ایک شکل ہے۔ دس حق ہم اختیار کئے ہوتے تو ہمیں وہ تمام برکات اور فوائد و فیوض حاصل ہوتے جو دور خلافت راشدہ کے مسلمانوں کو حاصل ہوئے تھے۔ کون و مکان شاید اس وقت عدل تھا، آج ظلم اس وقت امن تھا آج بد امنی، فتنہ و فساد اس وقت خوشحالی تھی آج بد حالی بلکہ پسماندگی و در ماندگی اس وقت اتحاد تھا آج متنازع اس وقت مسلمان دنیا میں بطور غالب قوت موجود تھے آج مغلوب، یہ تمام اقدار 180 درجے کیوں بدل گئیں؟ تمام اقدار اس لیے برعکس ہو گئیں کہ دور خلافت راشدہ کے مسلمانوں کا دین دس حق تھا جب کہ آج ہمارا اختیار کردہ دین مسخ شدہ، انحراف زدہ اور حقیقت میں بدعتی کی ایک شکل ہے۔ نوٹ فرمائیں بار بار فرمائیں یہی ایک وجہ ہے ہمارے زوال، ہماری پستی اور ہم پر طاری ذلت و رسوائی کی۔

اللہ کا احسان ہے کہ ہمارے ہاں قرآن مجید بغیر کسی شوشے کی تبدیلی کے من و عن موجود ہے اور وہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے خود اس کے تحفظ کی ذمہ داری لے رکھی ہے۔ اس کے اصل اور حقیقی ہونے سے ہمیں کم از کم یہ تو پتہ چلتا ہے کہ ملوک نے دین کو بدلاتو کس حد تک۔ اس کے برعکس یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے دین (دس اسلام) کو بدلاتو مازل شدہ اپنی کتابوں کو بھی بدل لیا۔ انہیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ مخرف ہوئے تو کس حد تک؟ اللہ مرضی کے دین کو چھوڑ کر آج وہ من مرضی کے دین میں سرگرداں و غلطاں ہیں تو کس قدر؟ مسلمان اور دنیا میں مغلوب ہوں ایک تئاد ہے۔ اس میں کیا شک کہ واقعات کی دنیا میں تو آج



ہم مسلمان مغلوب ہیں۔ صرف مغلوب ہی نہیں ہمارا یہ مغلوب ہونا پتہ دے رہا ہے کہ ہمارا ایمان ناقص ہے۔ قرآن نے اپنے نزول کے وقت بتا دیا تھا کہ مسلمان دنیا میں مغلوب ہو گئے تو اس وقت جب وہ مومن نہ رہیں گے۔ فرمایا گیا:

”دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو گے“ (آل عمران: 139)۔

اور یہ بھی کہ مسلمان دنیا میں مغلوب ہوتے ہیں تو اس وقت جب وہ اللہ تعالیٰ کی نصرت سے محروم ہوں۔ یہ بھی قرآن مجید میں آیا:

”اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں“ (آل عمران: 160)

نچوڑا اس پیکر کا نکلا تو یہ کہ دورِ جہالت میں خلیفۃ المسلمین، اولوالامر، امت مسلمہ، شوریٰ اور بیت المال کا وجود نہیں تھا، آج بھی نہیں۔ ہم پھر دورِ جہالت میں ہیں۔ دورِ خلافت نہ ہو تو دورِ جہالت کا ہونا لازمی ہے۔ نظامِ خلافت آج بحال ہو جائے یہ پانچوں ادارے از خود آ موجود ہو گئے۔ پانچوں ادارے آ موجود ہوں تو انسانیت کو وہی برکات و ثمرات حاصل ہو جائیں جو دورِ خلافتِ راشدہ کے مسلمانوں کو حاصل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کا مقصد قرار دیا تو قیامِ نظامِ خلافت کو۔ ہر دوسرے کام کو چھوڑ کر آج کے مسلمانوں کے کرنے کا صرف ”ایک“ کام ہے اور وہ یہ کہ بھائی نظامِ خلافت۔ یہ ایک کام ہو جائے اس کی برکات صرف مسلمانوں کو ہی حاصل نہ ہوں گی، صرف انسانیت کو ہی حاصل نہ ہوں گی، بلکہ حیوانات و نباتات و جمادات غرضیکہ ہر حقوق کو۔ انسانوں کو یہ فیوض و فوائد ہر حقوق کو پہنچانے چاہیے اس لیے کہ ہر حقوق انسان کی خدمت میں مصروف و مشغول ہے۔

## خلافت کی شرعی حیثیت

پیشتر اس کے کہ ہم خلافت کی شرعی حیثیت پر روشنی ڈالیں خلافت کی تعریف کو تازہ کر لیں۔ مفسرین کرام نے خلافت کی جو تعریف کی ہے اس کا نچوڑ یہ ہے کہ ہماری اس زمین پر اللہ تعالیٰ کی حکومت کا امام خلافت ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب پوری کائنات پر حکمرانی اللہ تعالیٰ کی ہے تو پھر زمین پر قائم ہونے والی اس کی حکومت کو خلافت کا انوکھا نام کیوں دیا گیا؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ پوری کائنات پر حکمرانی اللہ تعالیٰ کی ہے ان الحکم الا للہ لیکن زمین پر قائم ہونے والی حکومت کو اسی طرح خلافت کا انوکھا نام دیا گیا جس طرح کہ کائنات کے اس حصہ پر پیدا کی جانے والی حقوق..... انسان کو انوکھا سلوب اختیار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے صواب دہی اختیارات اور دوسری منفرد صلاحیتوں اور اعزازات سے نوازا۔ ایسی حکومت کو اس لیے ”خلافت“ کا مخصوص نام دیا گیا کہ اس میں اصولی قوانین تو سو فیصد اللہ پاک کے مانفد ہوتے ہیں لیکن باقی کائنات کی طرح براہ راست نہیں انسان کے ہاتھوں مانفد ہوتے ہیں۔ مختصراً خلافت کی تعریف ہوئی تو یہ کہ ”انسانوں کے ذریعہ سے زمین پر قائم ہونے والی اللہ تعالیٰ کے قوانین پر مبنی حکومت“۔ یاد رہے قرآن مجید اور کتب احادیث میں بیان کردہ تعلیمات و احکامات اگر ان کے صفات تک محدود رہیں تو ان کی حیثیت محض ایک نظریے اور تھیوری کی ہے زیادہ سے زیادہ انہیں اسلامی نظریہ کہا جاسکتا ہے۔ البتہ جب یہ تعلیمات و قوانین کسی خطہ زمین میں مانفد ہو جائیں تو یہی خلافت ہے۔

☆..... اس لیکچر کی ترتیب و تدوین میں مولانا خورشید احمد گنگوہی صاحب کی معاونت سے استفادہ

کیا گیا۔

علماء امت اور فقہائے اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ کسی بھی چیز کی شرعی حیثیت کو جانچنے کے چار ماخذ ہیں۔ وہی چیز شرعی حیثیت کی حامل قرار پائے گی جو ان چاروں ماخذ میں سے کم از کم ایک ماخذ پر پوری اترتی ہو۔ یہ چار ماخذ ہیں قرآن مجید، سنت رسول ﷺ، اجماع امت اور قیاس۔ آئیے ان چار ماخذ کی روشنی میں خلافت کی شرعی حیثیت کو پرکھیں۔

### قرآن مجید بطور ماخذ خلافت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر اپنی حکومت قائم کرنے کا کام بطور امانت دیا بلکہ قرآن مجید سے پتہ چلتا ہے تو یہ کہ پیشکش کرنے پر انسان نے اس امانت کو خود قبول کیا۔ قرآن مجید میں آیا:

”ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کیلئے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اٹھا لیا“ بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے“ (احزاب: 72)۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دوسری جمہوریتوں نے اس پیشکش کو ٹھکرایا تو کیوں اور ”وہ اس سے ڈر گئیں“ تو کیوں؟ وہ ڈر گئیں تو اس لیے کہ حق امانت ادا کرنے کی صورت میں تو اس میں بڑی عظمت اور عالی مقامی تھی لیکن امانت میں خیانت ہونے کی شکل میں اس پیشکش میں سخت سزا کی وعید بھی مضمر تھی۔ چنانچہ اگلی ہی آیت میں اس بات کو واضح کر دیا گیا۔ فرمایا:

”اس بار امانت کو اٹھانے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اللہ منافق مردوں اور عورتوں اور شرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے اور مومن مردوں اور عورتوں کی توبہ قبول کرے“ اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے“ (احزاب: 73)۔

یوں انسان کے از خود اس پیشکش کو قبول کرنے کے بعد لازمی تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی طے شدہ سنت کے مطابق کہ وہ ہر حقوق کو مطلوبہ کام کرنے کیلئے درکار ساخت اور راہنمائی عطا کرتا ہے (طہ: 50) انسان کو ان اختیارات و اعزازات سے نوازنا کہ جو ”فی الارض خلیفہ“ کو کابر خلافت یا زمین میں اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم کرنے کیلئے درکار تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا:

”جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا ”میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں“ پھر جب میں اسے پوری طرح بنا دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ“ (ص: 71-72)۔

یعنی عام حقوق کی حیثیت سے انسان کی تخلیق تو ظاہر ہے پہلے ہو چکی تھی اسی لیے تو دوسری چیدہ چیدہ مخلوقات کے ساتھ اسے بھی پیشکش ہوئی، البتہ انسان کی طرف سے اس پیشکش کو قبول کرنے کے بعد مذکورہ آئیہ مبارک میں اسے تین مزید اعزازات سے نوازا گیا۔ ایک تو اسے سننے سمجھنے بولنے حق و باطل میں تمیز کرنے وغیرہ جیسی صلاحیتوں سے مزین کیا (سویت) دوسرے اسے ایک مقررہ مدت تک صوابدیدی اختیارات دینے (تخت فیدمن روجی) اور تیسرے فرشتوں کو اس کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی شکل میں کارِ خلافت میں درکار اشیاء و عناصر کو اس کیلئے مسخر کر دیا۔ یہ تمام اختیارات و اعزازات البتہ اللہ تعالیٰ نے بطور امانت دیئے۔ بالفاظ دیگر کام جو کرنے کیلئے دیا وہ بھی بطور امانت اور منفرد صلاحیتیں دیں تو وہ بھی بطور امانت۔

مذکورہ اختیارات و اعزازات عطا کرنے کے بعد ایک اور ایسی سہولت کا فراہم کیا جانا ضروری تھا جس کو مہیا کیے بغیر کارِ خلافت سرانجام نہیں پاسکتا تھا۔ یہ سہولت الٰہی قوانین فراہم کرنے کی تھی۔ ان قوانین کے نفاذ سے ہی اللہ کی حکومت معرض وجود میں آسکتی تھی۔ قوانین ایک ہی وقت پر یکمشت نہیں دیئے جاسکتے تھے اس لیے کہ انسانی تمدن کی ترقی کے ساتھ ان میں تھوڑے بہت رد و بدل کا ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ انسانی تاریخ پر اس سہولت کو ملاحظہ فرماہم کیا گیا تو نہ صرف وقتاً فوقتاً آسانی کتابوں کی تنزیل سے بلکہ انبیاء و رسل کی متوازا بعثت سے بھی تاکہ وہ اپنے قول و فعل سے الٰہی رضا پر مبنی تشریح و تعبیر کر دیں۔ تاہم شروع میں ہی یہ واضح کر دیا گیا کہ اگر انسان امانت دینے گئے کام کا حق ادا کریں گے یعنی زمین پر اللہ تعالیٰ کے فراہم کردہ قوانین مانڈ کریں گے تو وہ ہر فرد ہو گئے۔ بصورت دیگر یعنی اللہ تعالیٰ کے قوانین مانڈ کرنے کی بجائے اگر وہ اپنے بنائے ہوئے قوانین مانڈ کر کے خیانت کے مرتکب ہوں گے تو سخت سزا ان کا مقدر ہوگی۔ قرآن میں آیا:

”ہم نے کہا ”تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ پھر میری طرف سے جو کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کیلئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا“ اور جو اس کو قبول کرنے

سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے“ (بقرہ: 39)۔

قرآن مجید کا اسلوب یہ ہے کہ جو اہم بات ہو اس کو کم از کم دو دفعہ اسی یا تھوڑے بہت مختلف پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک اور جگہ پر قوانین کی فراہمی و پیروی کو بیان کیا گیا تو اس طرح ”اے بنی آدم! یاد رکھو! اگر تمہارے پاس خود تم ہی میں سے ایسے رسول آئیں جو تمہیں میری آیات شمار ہے ہوں تو جو ما فرمائی سے بچے گا اور اصلاح کا رو یا اختیار کرے گا اس کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور ان سے سرکشی اختیار کریں گے وہی اہل دوزخ ہونگے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے“ (اعراف: 35-36)۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے قوانین کو نافذ کرنا یا کارخلافت کوئی نقلی کام نہیں کہ کرنے پر ثواب ہو اور نہ کرنے پر گناہ نہ ہو۔ یہ فرض کفایہ بھی نہیں بلکہ سوفرانض کا ایک فرض ہے جسے نہ کرنا سخت ترین عذاب کا موجب ہے۔ اللہ پاک کے مازل کردہ قانون کو نافذ نہ کرنے والے تو کافر ظالم اور فاسق قرار پاتے ہیں۔ قرآن مجید میں آیا:

۱۔ ”جو لوگ اللہ کے مازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں“ (مائدہ: 44)۔

۲۔ ”جو لوگ اللہ کے مازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں“ (مائدہ: 45)۔

۳۔ ”جو لوگ اللہ کے مازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں“ (مائدہ: 47)۔

اللہ تعالیٰ کے قانون کو نافذ کرنے سے حکومت تو اللہ تعالیٰ کی قائم ہوتی ہے لیکن یہ بڑا اعزاز اور آزمائش ہے ان سپوتوں کیلئے جو ایسے نظام کو خود آگے بڑھ کر قائم کرتے اور چلاتے ہیں۔ بنامریں حق امانت کو بطریق احسن ادا کرنے والوں سے رب کائنات اس قدر خوش ہوتا ہے کہ خود ان کی نصرت کے درپے ہو جاتا ہے۔ ان کی مدد کرتا ہے تو اس طرح کہ ایک طرف انہیں ثابت قدم رکھتا اور دوسری طرف ان کے مخالفین کی چالوں کو بے اثر و بے مدد کر دیتا ہے۔ فرمایا:

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم مضبوط بنادے گا۔ رہو لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے تو ان کیلئے ہلاکت ہے اور اللہ نے ان کے اعمال کو بھگا دیا ہے

اس لیے کہ انہوں نے اس چیز کو پسند کیا جسے اللہ نے مازل کیا ہے۔ اللہ نے ان کے اعمال شائع کر دیئے“  
(محمد: 7-9)۔

یاد رہے یہ اپنے اعمال کو رائیگاں کروانے والے وہی لوگ ہیں جو حق امانت ادا کرنے اور کار خلافت کرنے سے قاصر رہے۔ ان کے برعکس کار خلافت کی طرف پیش رفت کرنے والے جب اپنے ایمان و عمل سے اللہ تعالیٰ کے معیار پر پورے اترتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نہ صرف یہ کہ انہیں دنیا میں حصہ خلافت عطا کرتا ہے بلکہ خلافت کے ہی نتیجہ میں غلبہٴ دس حق اور برکات دس حق بمثل امن خالص عبادت کے مواقع اور شرک سے بچنے کی سہولت کا وعدہ کرتا ہے۔ فرمایا گیا:

”اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے لوگوں کو بچا چکا ہے ان کے لیے ان کے اس دین کو غالب کرے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے ان کی حالت خوف کو امن سے بدل دے گا بس وہ میری عبادت کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں“ (نور: 55)۔

”امن“ کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت مقدسہ میں ایسے جیسے بطور ”نیر و میسر“ لیا جس لیے کہ ”امن“ ہونا ہی کسی معاشرے میں اس وقت ہے جب وہاں پر عدل ہو، خوشحالی ہو اور کوئی فرد محرومیت کا شکار نہ ہو۔ یہاں پر اسلام کی ان برکات کو تیسرے مرحلے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس تیسرے مرحلے سے پہلے دوسرے مرحلے یعنی غلبہٴ دس حق اور غلبہٴ دس حق سے بھی پہلے ایک اور بنیادی مرحلے یعنی قیام خلافت کے مرحلے کا ذکر ہے۔ یہ آیت جسے امام ہی آیتہ استخلاف کا دیا گیا ہے قرآن مجید سے جواز خلافت کی بنیاد ہے۔ ترتیب جو آیت کریمہ بیان کر رہی ہے یہ ہے کہ دس اسلام کی برکات اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتیں جب تک کہ دس حق بطور غالب قوت موجود نہ ہو اور دس حق بطور غالب قوت موجود نہیں ہو سکتا جب تک کہ پہلے نظام خلافت قائم نہ ہو۔ یعنی پہلے نظام خلافت قائم ہو تو غلبہٴ دس حق اور غلبہٴ دس حق ہو تو اسلام کی برکات حاصل ورنہ اس خیال سے محال است و جنوں۔ جیسے کہ پہلے بیان ہوا یہ ایسا ہی ہے کہ پھل دار درخت کو پھل تو شاخوں پر آتے

ہیں لیکن شاخص اس وقت تک معرض وجود میں آئی نہیں سکتیں جب تک کہ ان سے پہلے تانا ہو اور تانا خود وجود پذیر نہیں ہو سکتا جب تک پہلے جڑ نہ ہو۔ جڑ ہو تو تانا ہو تو شاخص، شاخص ہو تو پھل۔ قرآن مجید سے نظام خلافت کے جواز کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت کہ نظام خلافت ہو تو اسلام کی برکات سے انسانیت بہرہ مند ہو سکتی ہے ورنہ نہیں۔ تاریخ شاہد دنیا میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں، دور خلافت راشدہ میں خلافت قائم تھی تو اس دور کے مسلمانوں کو اسلام کی بے مثل برکات بمثل امن، عدل، اتحاد، خوشحالی، غلبہ، دہی حق وغیرہ حاصل تھیں۔ آج دنیا میں خلافت کہیں نہیں تو ان برکات کا حصول کیا، برکات 180 درجے برعکس ہو گئیں ہیں۔ امن کی جگہ برائی، عدل کی جگہ ظلم، اتحاد کی جگہ فرقہ واریت، خوشحالی کی جگہ پسماندگی و درماندگی، غلبہ، دہی حق کی جگہ مظلومیت آج کے مسلمانوں کا مقدر ہے۔ خلافت تھی دور خلافت راشدہ میں تو وحید تھی یعنی صرف اللہ کا قانون رائج تھا۔ تو حید آجائے تو سب نیکیاں اور بھلائیاں آ جاتی ہیں۔ اس کے برعکس شرک یعنی اللہ کے قانون کے ساتھ بندوں کے بنائے ہوئے قوانین کو شامل کر لیا جائے تو بھلائیاں کا قلع قمع اور برائیوں کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ نظام خلافت کے نہ ہونے کا مطلب ہی شرک کا ہونا ہے اور یہ شرک ہی کی وجہ سے ہے کہ آج جیسا کہ اوپر بیان ہوا، ہمارے ہاں دہی حق کی برکات برعکس ہو گئی ہیں۔ ایسا کیوں ہوا ہے مذکورہ آیت میں اس پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ آئیہ استخفاف کا اختتام اس جملے پر ہوا ہے ”جو اس کے بعد کفر (اشکری) کریں تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔“ یعنی جو لوگ نظام خلافت کو تیاگ کر ناشکری کا راستہ اختیار کریں اور اپنے آپ کو خلافت سے محروم کر لیں تو ان کی نشو و نما رک جاتی ہے۔ وہ بھلائیاں سے محروم ہو جاتے ہیں۔ قرآن عربی میں مازل ہوا۔ عربی میں فاسق اس درخت کو کہتے ہیں کہ جس کی چھال مار کر اسے نکا دھڑ ٹکا کر دیا جائے۔ یاد رہے کسی پودے یا درخت کی خوراک و پانی چھال کے ذریعے سے پتوں میں پہنچتے ہیں جہاں یہ خام خوراک سورج کی روشنی میں پک کر درخت کے رگ وریشے میں لوٹی ہے۔ پتے درخت کا کچن ہیں۔ جب چھال اتر جائے تو زمین سے پانی اور غذائی عناصر کی پتوں میں پلائی منقطع ہو جاتی ہے۔ ایسے درخت کی نشو و نما رک جاتی ہے اور کچھ ہی عرصہ بعد وہ سوکھ کر ایندھن بن جاتا ہے۔

دور خلافت راشدہ میں جب خلافت کی چھال قائم تھی تو دنیا والوں کو دہی حق کی برکات میسر تھیں۔

نا شکری کا مرکب ہو کر جب بعد میں آنے والے مسلمان ناسق بن گئے تو ان کی نشو و نما رک گئی۔ یہی وجہ ہے کہ دس حق کی رحمتیں آج ہمارے ہاں رحمتیں بن کر مقدر بنی ہوئی ہیں۔ بصورتِ موجودہ آپ لاکھ لیاہڑیاں ادارے یونیورسٹیاں بنا کیں نشو و نما بہر حال رک رہے گی۔

قرآن میں یہ بھی آیا ”سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرق میں نہ پڑو“ (آل عمران: 103)۔ اس آیت پر قیامت عمل نہیں ہو سکتا اگر اسلامی دنیا میں موجود 57 حکمرانوں سے اقتدار صرف ایک حکمران یعنی خلیفۃ المسلمین کے ہاتھ ختم نہ ہو۔ قرآن میں آیا ”اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں“ (نساء: 59)۔ اس آیت پر بھی قیامت عمل نہیں ہو سکتا جب تک خلیفۃ المسلمین دنیا میں موجود نہ ہو اس لیے کہ صاحبانِ امر میں جب تک خلیفۃ وقت کو مرکزی حیثیت حاصل نہ ہو شرعی اولوالامر معرضِ وجود میں آتے ہی نہیں۔ قرآن مجید میں یہ بھی آیا ”وہ جو اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں“ (شوری: 38)۔ اس آیت پر بھی قیامت عمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ شوریٰ موجود نہ ہو اور شوریٰ موجود نہیں ہو سکتی جب تک خلیفۃ المسلمین موجود نہ ہو۔ ارکانِ شوریٰ نے خلیفۃ وقت ہی کو تو مشورہ دینا ہوتا ہے۔ اجتہاد کے دروازے بند رہیں گے جب تک کہ خلیفۃ خلافت کا نظام موجود نہ ہو۔ قرآن مجید میں یہ بھی آیا ”(مسلمانو!) اب دنیا میں وہ بہترین امت تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کیلئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو“ (آل عمران: 110)۔ اس آیت پر بھی قیامت عمل نہیں ہو سکتا جب تک خلیفۃ المسلمین کے وجود سے دوبارہ مرکزیت قائم نہ ہو اور موجودہ مسلم اقوام کو باہم مدغم کر کے پھر امتِ مسلمہ کو بحال نہ کیا جائے۔ غرضیکہ اور تو اور خلافت کی عدم موجودگی میں نہ نظامِ صلوة کا حق قائم ہو سکتا ہے اور نہ نظامِ زکوٰۃ۔ خلیفۃ المسلمین کی عدم موجودگی میں تو معیاری حج کی ادائیگی ناممکن ہے اس لیے کہ خطبہ حج تو خلیفۃ المسلمین کا اعزاز ہے۔ بتائیں کیا اس میں کوئی شک ہے کہ خلافت ہو تو دین ورنہ بے دینی۔ دورِ جہالت تھا تو دورِ خلافت نہیں تھا اور جب دورِ خلافت نہ ہو تو دورِ جہالت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برہمنی کو قیامِ خلافت یا اقامتِ دین کا ہی کام کرنے کو دیا گیا۔ چیدہ چیدہ ہانپیا حکام کیلئے فرمایا:



”اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جسے (اے محمد ﷺ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم امیرانہم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دے چکے ہیں۔ اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔ یہی بات ان مشرکین کو سخت مگوار ہوئی ہے جس کی طرف تم انہیں دعوت دے رہے ہو“ (شوری: 13)۔

یعنی اللہ پاک نے انبیاء و رسل کو انسانیت کا امام ہوتے ہوئے وہی..... ائمہ دین..... کا کام کرنے کو کہا جو انسانیت کو کمرے کیلئے دیا۔ کوئی نئی دنیا میں ایسا نہیں آیا جس نے اپنی نبوت کے پہلے لمحے سے لیکر آخری لمحے تک یہی کام نہیں کیا۔ خود رسول ﷺ نے دور نبوت کا ایک ایک لمحہ اسی نگ و دو میں گزارا۔ ہم سمجھ بیٹھے ہیں کہ دین میں نماز روزے زکوٰۃ وغیرہ کی بہت اہمیت ہے بلکہ نماز کے ادا کرنے کو ہی آج سارا دین تصور کر بیٹھے ہیں۔ نماز پڑھ لی اور کچھ بیٹھے کہ بس دین کا حق ادا ہو گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں نماز اور زکوٰۃ کی اسلام میں بہت اہمیت ہے۔ نماز ساجی و حمدنی نظام کو سنو ارتقی ہے تو زکوٰۃ معاشی نظام کو۔ لیکن اہمیت ان کی ہے تو اس لیے کہ یا ایک مسلمان کو نظام خلافت قائم کرنے اور قائم رکھنے میں بنیادی تربیت کی حیثیت رکھتی ہیں یعنی خود منزل نہیں ہیں منزل یعنی قیام و دوام خلافت میں مدد و معاون ہوتی ہیں۔ بلکہ یہ اپنی حقیقی اور معیاری حیثیت سے ادا ہی اس وقت ہوتی ہیں جب خلافت قائم ہو چکی ہو اور مسلمان اقتدار میں ہوں۔ قرآن مجید میں آیا:

”یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے زکوٰۃ دیں گے معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے۔ اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے“ (حج: 41)۔

یعنی صرف یہی نہیں کہ نماز اور زکوٰۃ کی اصل ادائیگی ہوتی اس وقت ہے جب نظام خلافت قائم ہو اور مسلمانوں کو حکمین فی الارض حاصل ہو بلکہ فرہہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ادائیگی بھی اس وقت ممکن ہے جب مسلمان دنیا میں بطور غالب قوت موجود ہوں۔ جیسے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے الفاظ سے ظاہر ہے معروف کو حکماً نافذ کرنا اور نہی کو بالقوۃ منع کرنا ہوتا ہے۔

مذکورہ آیہ مبارکہ یعنی شوریٰ کی آیت نمبر 13 میں انبیاء و رسل کو اہمیت دین و قیام خلافت کا کام دیتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ یہی اہمیت دین کا کام (اے محمد ﷺ) آپ نے کرنا ہے۔ اب دیکھنا وہی بات یہ ہے کہ اہمیت دین اور اہمیت سلوۃ و زکوٰۃ کی ترتیب کیا ہے کہ جس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ کو عمل پیرائی کیلئے کہا۔ یاد رہے پہلی وحی جو رسول ﷺ پر نازل ہوئی محض تعدادی تھی۔ البتہ دوسری وحی میں جو کچھ عرصہ بعد نازل ہوئی نہ صرف یہ کہ زندگی بھر کرنے کا پروگرام دے دیا بلکہ ساتھ یہ بھی واضح کر دیا کہ جسے بنائے باطل نظاموں کو ملیا میٹ کر کے نظام حق کو قائم کرنا جان جو کھوں کا کام ہے۔ حائثین نظام باطل ٹھنڈے بیٹوں یہ کام ہونے نہیں دیتے۔ مشکل ترین کام ہے اہمیت دین کا جو انبیاء و رسل کو کرنے کیلئے دیا گیا۔ لہذا رسول ﷺ کو اس کام کی تکلیف سے آگاہ کرتے ہوئے مبر و ثبات کا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کی گئی۔ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ دوسری وحی سورہ مدثر کی درج ذیل چھوٹی چھوٹی سات آیات پر مشتمل تھی۔

”اے اوڑھ لپیٹ کر لینے والے! اٹھو اور خبردار کرو۔ اور اپنے رب کی کبریائی کو قائم کرو اور اپنے کپڑے پاک رکھو۔ اور گندگی سے دور رہو۔ اور احسان نہ کرو زیادہ حاصل کرنے کیلئے اور اپنے رب کی خاطر مبرا کرو۔“

یعنی اور ضروری ہدایات کے علاوہ جو کام کرنے کیلئے دیا تو اللہ کی حکومت (کبریائی) قائم کرنے کا اور پھر بتا دیا کہ اس راستہ میں جب مشکلات و مصائب سے واسطہ پڑے تو مبرا کا دامن تھامنا اور وہ بھی اپنے رب کی خاطر یعنی ظاہر ہے کام جو کرنے کیلئے دیا جا رہا ہے وہ اللہ کی حکومت قائم کرنے کا ہے۔ چونکہ اس دوسری وحی کے موقع پر بھی رسول ﷺ وصول وحی سے ابھی پوری طرح مانوس نہ ہوئے تھے لہذا اسی طرح اس موقع پر بھی آپ ﷺ چادر لپیٹ کر لیٹ گئے جیسے کہ پہلی وحی کے موقع پر۔ اس لیے رسول ﷺ کو ”یا ایہا المدثر“ کے الفاظ سے پکارا گیا۔ مطلب یہ کہ اے میرے محبوب بندے تم اوڑھ کر کہاں لیٹ گئے تمہیں تو کارِ عظیم کی تکمیل کیلئے بارِ عظیم سے گزرنے کے ہیں۔

اور تو اور خود رسول ﷺ کو قیام خلافت یا اللہ کے قانون کو نافذ کرنے کا کام بطور چیلنج دیا اور قرآن مجید میں بار بار سخت وعید سنائی اللہ کے قانون کو چھوڑ کر لوگوں کی خواہشات کی پیروی کرنے کی۔ ایک جگہ پر

فرمایا:

”اب اگر تم نے اس علم کے باوجود تمہارے پاس آچکا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی تمہارا حامی و مددگار ہوگا اور نہ ہی کوئی اس کی پکڑ سے تم کو بچا سکتا ہے۔ (رعد: 37)۔

ایک اور جگہ پر فرمایا:

”(اے محمد ﷺ) تم اس دین کی طرف دعوت دو اور جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اس پر مضبوطی سے قائم ہو جاؤ اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو اور ان سے کہہ دو کہ ”اللہ نے جو کتاب مازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں“ (شوری: 15)۔

پھر قیام خلافت کا کام رسول ﷺ کی رحلت کے بعد صرف ان کی امت یا قبل از قیامت آخری امت کو ہی نہ دیا گیا بلکہ اس سے پہلے کسی نہ کسی پیمانے پر سابقہ امتوں کو بھی دیا گیا۔ اہل کتاب کے متعلق فرمایا:

”ہم ملا کہہ دو اے اہل کتاب! تم ہرگز اصل پر نہیں ہو جب تک کہ توراۃ اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمہارے رب کی طرف سے مازل کی گئی ہیں“ (مائدہ: 68)۔

قرآن مجید سے ان واضح احکامات کی روشنی میں کسی کا یہ تصور کرنا کہ دنیا میں اقتدار حاصل کرنے کے درپے ہونا دنیا پرستی ہے سراسر غلطی پر مبنی ہے۔ ہاں اپنے لیے اقتدار حاصل کرنا واقعی دنیا پرستی اور گمراہی ہے لیکن اللہ کے دین کیلئے حکومت کا طالب ہونا عین عبادت اور مقصد تخلیق انسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہجرت کے مازک موقع پر اللہ تعالیٰ خود اپنے نبی ﷺ کو مدنا سکھاتے ہیں تو حصول اقتدار کی۔ قرآن مجید میں آیا:

”اور مدنا کرو کہ پروردگار مجھے جہاں بھی تولے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنادے“ (بنی اسرائیل: 80)۔

چنانچہ مدینہ پہنچنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے نبی کا سات ﷺ کو وہ اسلامی ریاست عطا کر دی جو بالآخر چند ہی سالوں میں پورے عرب پر اللہ کے دین کو غالب کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوئی۔ اصل میں دنیا سے فتنہ و فساد کا قلع قمع ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ اصلاح پسندوں کے پاس سیاسی قوت نہ ہو۔ خود قرآن میں آیا:

”ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورے کا پورا اللہ کیلئے ہو جائے“

برائی جتنی چاہے کوئی بغیر قوت پھیلا سکتا ہے لیکن نیکی محض و عطا و تدکیر سے استوار نہیں ہو سکتی۔ یہی بات ہے جس کا خود رسول ﷺ نے اظہار کیا فرمایا ”اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے ان چیزوں کا سد باب کر دیتا ہے جن کا سد باب قرآن سے نہیں کرتا“۔ مذکورہ دعا میں رسول ﷺ سے یہ بھی کہلوایا گیا کہ وہ اقتدار میرے پروگرام کیلئے ہو کسی دوسرے کے پروگرام کیلئے نہیں۔ دوسرے کے پروگرام کیلئے تو مکہ میں بھی آپ ﷺ کو اقتدار ملا تھا لیکن آپ ﷺ نے دو ٹوک انکار کر دیا۔ وہاں جا کر اقتدار کو قبول کیا جہاں وہ خالص خلافت کی شکل میں تھا۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا مخصوص وجوہات کی بنا پر دنیا میں اللہ تعالیٰ کی حکومت کو خلافت کا نام دیا گیا لیکن انسانوں کو بار بار یاد دہانی کرائی گئی کہ بظاہر بندوں کی حکومت نظر آنے والی مگر انی اصل کے اعتبار سے اللہ کی حکومت ہوتی ہے اس لیے کہ کبریائی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو منہز اور نہیں۔ بتائیں قرآن مجید اسی کی کبریائی کو بار بار دہراتا ہے۔ روزے کا مقصد بیان کرتے ہوئے یہ تو فرمایا کہ ”طعام تحبون“..... ”طعام تشکرون“ لیکن ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اس طور جو تمہیں ہدایت حاصل ہو اس پر اللہ تعالیٰ کی ”کبریائی“ کا اظہار و اعتراف کرو۔ وہ لوگ جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم کرنے کی بجائے اپنی حکومت بطور جمہوریت، آمریت، اشتراکیت وغیرہ قائم و دائم کرنے میں عرصے گزر دیتے ہیں آخرت میں جب وہ عین سزا بھگت رہے ہوں گے تو ان کو بتادیا جائے گا کہ ان کا ایسا انجام اس لیے ہے کہ وہ بھول گئے تھے کہ ”سب تعریف اللہ ہی کیلئے ہے جو زمین اور آسمانوں کا مالک اور سارے جہان والوں کا پروردگار ہے۔ زمین اور آسمانوں میں کبریائی اسی کیلئے ہے اور وہی زبردست اور دانا ہے“ (جاثیہ: 36-37)۔ سورہ بنی اسرائیل میں آیا ”اس کی کبریائی قائم کرو کمال درجے کی کبریائی“۔ سورہ حشر میں آیا: ”سب پر غالب اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا اور بڑا ہی ہو کر رہنے والا“۔ اسی طرح ایک جگہ پر اللہ تعالیٰ نے اپنا تعارف کر لیا تو اس طرح کہ ”اعلیٰ العظیم“..... ”بزرگ و برتر ذات“ (بقرہ: 255)۔ دوسری جگہ پر فرمایا: ”الکبیر المتعال“..... وہ بزرگ جو ہر حال میں بالاتر رہنے والا ہے“ (زمرہ: 9)۔ تیسری جگہ پر فرمایا: ”الکبیر“..... بالا دست اور بزرگ ہے“ (حج: 62)۔

پھر صرف قرآن مجید کی تلاوت کے وقت ہی اس کبریا کی کبریائی کے گن نہیں گائے جاتے بلکہ معمول کی زندگی میں کسی نہ کسی صورت میں اعلان ہو رہا ہے تو اسی کا کہ "اللہ اکبر"۔ کبریا کی صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ بچے کی پیدائش پر جو پہلی حقیقت اس کے ہر کان میں باری باری ڈالی جاتی ہے تو یہ کہ ہم سب پابند ہیں اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم کرنے کے۔ پھر اذان میں نماز میں کئی بار بلکہ مذہب کو ذبح کرتے وقت دو ٹوک اعلان ہوتا ہے تو یہی کہ دنیا کے دھندوں میں کوئی بھول گیا ہے تو پھر یاد کر لے کہ مکران ہے تو صرف ایک اللہ..... اللہ اکبر۔

### سنت رسول ﷺ بطور مآخذ خلافت

قرآن مجید کے بعد اسلام کا دوسرا بڑا مآخذ رسول ﷺ کی سنت ہے۔ سنت رسول ﷺ اصل میں اللہ تعالیٰ کے مبرا کردہ قانون کی آئینش تعمیر و تعمیر ہے۔ قرآن مجید اصولوں کی کتاب ہے۔ سابقہ ادوار کی طرح کتاب کے ساتھ رسول ﷺ کو بھیجا ہی اس لیے گیا کہ وہ اپنے قول و فعل اور تائید سے ان اصولوں کی تفسیر و تعبیر کر دے۔ بصورت دیگر یعنی قرآن مجید کے الفاظ کی تشریح اگر ہر کبہ و مہبہ کی صوابدید پر ہوتی تو سوائے اختلاف کے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ کوئی مربوط نظام معرض وجود میں آتا ہی نہ۔ نماز کو ہی لے لیں قرآن مجید میں اتنا ہی آیا کہ "اقیموا الصلوٰۃ" یعنی نماز قائم کرو۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ کیسے قائم کریں؟ فرمایا "اسی طرح سے نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھو"۔ چنانچہ نماز جس طرح آج ہمارے ہاں پڑھی جا رہی ہے قرآن مجید کے بعد سنت رسول ﷺ سے مآخذ ہے۔ کوئی لاکھ کہے کہ وہ "اہل قرآن" ہے قرآن مجید پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا اس لیے کہ قرآن مجید خود سنت کے بغیر نہیں چلتا۔ ایک جگہ پر آیا:

"کہہ دو اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں کو بخش دے گا۔ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے"۔ کہہ دو "اللہ کی اطاعت کرو اور رسول ﷺ کی"۔ اگر یہ اعراض کریں تو یاد رکھیں کہ اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا" (آل عمران: 31-32)۔

یعنی اللہ کی اطاعت کے ساتھ رسول ﷺ کی اطاعت نہ کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے خود اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہ کرنے والا۔ یہ اس لیے کہ اللہ کی اطاعت ممکن ہی نہیں رسول ﷺ کی اطاعت کے بغیر۔ اللہ کا اتنا پتہ

رسول ﷺ ہی تو دیتا ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں آیا:

”جو کچھ رسول ﷺ تمہیں دیں وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دیں اس سے رک جاؤ۔ اللہ سے ڈرو اللہ سخت سزا دینے والا ہے“ (حشر: 7)۔

ایک اور جگہ پر آیا:

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی اور اپنے اعمال کو برباد نہ کرو“ (محمد ﷺ: 32)۔

بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ کی وہ اطاعت بے سود ہے جو رسول ﷺ کی اطاعت کے ذریعہ سے نہ ہو۔ یہی وہ ضابطہ ہے جس کا رسول ﷺ نے خود ایک موقع پر اظہار فرمایا تو اس طرح

”جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری مافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی مافرمانی کی“ (بخاری و مسلم)۔

تاریخی واقعہ ہے رسول ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا۔ وداع کرتے وقت معاذ بن جبلؓ سے پوچھا کہ یمن میں امور کا فیصلہ کرتے ہوئے تمہیں قرآن مجید سے راہنمائی نہ ملے تو پھر کیا کرو گے؟ حضرت معاذ بن جبلؓ نے کہا کہ ایسی صورت میں سنت رسول ﷺ سے استفادہ کروں گا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر سنت رسول ﷺ بھی خاموش ہو تو پھر؟ معاذ بن جبلؓ نے جواب دیا کہ ایسی صورت میں قرآن و سنت پر قیاس کرتے ہوئے خود فیصلہ دوں گا۔

”طلب ان حوالہ جات کا یہ کہ رسول ﷺ کا کوئی فعل، قول یا تائید قانون کی حیثیت رکھتا ہے البتہ اس بڑی شرط کے ساتھ کہ وہ واقعی رسول ﷺ سے منسوب ہو۔ ہر وہ حدیث جو قرآن سے مطابقت نہ رکھتی ہو ٹھکرا دی جائے گی۔

خلافت کیلئے سنت رسول ﷺ سے اس سے بڑا اور کیا ثبوت کہ آپ ﷺ کی پوری زندگی کا حاصل ہے ہی ”قیام خلافت“۔ دو ربوت کے ایک طرف دو جہالت تو دوسری طرف دو رب خلافت، آپ ﷺ دنیا میں تشریف لائے تو دو جہالت کا دور دورہ تھا دنیا سے تشریف لے گئے تو دو رب خلافت تھا۔ زندگی بھر پر محیط

رسول ﷺ کا اصل اسوہ کیا ہوا؟ ظاہر ہے ”قیام خلافت“ یعنی آنے والے وقتوں میں جب بھی کسی کو دور جہالت سے واسطہ پڑے تو اسوہ رسول ﷺ یہی ہے کہ جہن سے نہ بیٹھے جب تک کہ دور جہالت کی جگہ دور خلافت کو قائم نہ کر دے۔ یاد رہے دنیا میں جب دور خلافت نہ ہو تو دور جہالت ہوتا ہے۔ دور جہالت کے ساتھ کھوتا کٹے رکھنا نہ صرف اسوہ رسول ﷺ کی ضد ہے بلکہ پر لے درجے کی منافقت ہے دعویٰ ہوتا ہے دین کا لیکن پیروی ہو رہی ہوتی ہے بے دینی کی۔ یاد رہے حرا و شور کی ریاضتیں بدر و حنین کی کاوشیں اور جیش و مدینہ کی ہجرتیں سب ذرائع تھے منزل تھی تو صرف قیام خلافت۔

کتاب احادیث میں سے کسی مستند کتاب کا نام نہیں لیا جاسکتا جس میں قیام و دوام خلافت کے متعلق احادیث کا مجموعہ نہ ہو۔ مثال کے طور پر صحیح بخاری میں ”کتاب الاحکام“ کا پورا حصہ احادیث خلافت پر مشتمل ہے۔ اسی طرح صحیح مسلم میں ”کتاب الامارت“ اسی لیے وقف ہے۔ اس تاثیر کی کتاب ”جامع الاصول“ کے اندر ایک حصہ ہے جس کا نام ہی ”کتاب الخلافة“ ہے۔ داؤد شریف ترمذی شریف نسائی شریف مسند احمد موتہ امام مالک غرضیکہ ہر مجموعہ احادیث میں مستقل ایک ایک باب خلافت کے متعلق ہے۔ خلافت کے متعلق یہ وسیع فرائض ہونے کے علی الرغم البیہ یہ ہے کہ دنیا کے اسلام حتیٰ کہ علماء کرام اور دانشوران امت اہمیت خلافت سے بے بہرہ اور قیام خلافت سے مغر اختیار کیے ہوئے ہیں۔ منبر و محراب میں بڑی طاقت ہے۔ اگر عالمیں منبر و محراب قیام خلافت کے درپے ہو جائیں تو ”شبانی سے کلیمی دو قدم“ ہے۔ دور ملوکیت میں صرف یہی نہ ہوا کہ اہل سیاست اور اہل مذہب ریلوے ٹریک کی دو لائنوں کی طرح متوازی راستوں پر چل پڑے بلکہ یہ بھی کہ اہل مذہب حرم ملوکیت کا شکار ہو کر بھول ہی گئے کہ وہ اصل اسوہ رسول ﷺ سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ صدائیں سنی جانے لگیں کہ نظام خلافت کو تو امام مہدی نے آ کر قائم کرنا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وقت کا کونسا موڑ ہے جس پر مسلمانوں کو خلیفۃ المسلمین، اولوالامر شوریٰ وغیرہ کی ضرورت نہ ہو۔ اس وقت تو زیر آسمان امت مسلمہ تک کا کہیں وجود نہیں۔ عرصہ ہوا امت مسلمہ خود مختار اقوام میں بٹ چکی۔ قرآن و سنت دنیا سے معدوم نہیں ہو گئے، من و عن موجود ہیں۔ کھولنے پڑھنے پر کھٹے اور بتائے کہ کیا کوئی ایسا اسلام بھی ہے جو خلیفۃ المسلمین، اولوالامر شوریٰ اور امت مسلمہ کے بغیر ہو۔ کاش! علماء امت قرآن خوانی سے قرآن چھپی اور دورہ

حدیث سے غورۂ حدیث کی طرف بھی آئیں۔

سنت رسول ﷺ بطور ماخذ خلافت کے سلسلہ میں ہم یہاں صرف چیدہ چیدہ احادیث کا ذکر کرتے ہیں۔ سب سے پہلے ان احادیث کا ذکر جن میں ہادی برحق ﷺ نے خلیفہ وقت کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ اس سلسلے کی پہلی حدیث حضرت نعمان بن بشیرؓ سے مروی ہے۔ فرمایا:

”تمہارے اندر دو ربوبت رہے گا جب تک اللہ چاہے گا۔ پھر اللہ جب اسے ختم کرنا چاہے گا تو اسے ختم کر دے گا۔ اس کے بعد خلافت علی منہاج النبوة قائم ہوگی۔“ (مسند احمد)

یہ ایک لمبی حدیث کا ابتدائی حصہ ہے جس میں سرور کائنات ﷺ نے خود ایسے دور کا ذکر فرمایا جس کی خوبصورتی اور کمال یہ کہ وہ نبوت کے طریق پر ہوگا۔ یاد رہے کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء و رسول گزر چکے کسی نے ایسے مبارک دور کا ذکر نہیں کیا۔ ذکر کیا تو اس کا کہ ”میرے بعد ہی آئے گا۔“ حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰؑ حضرت عیسیٰؑ وغیرہ فرمیں کہ کسی ایک نبی نے بھی یہ نہیں کہا کہ میرے بعد خلیفہ یا دو خلافت آئے گا۔ خلیفہ المسلمین کی اس سے بڑی فضیلت اور کیا کہ جس جگہ کو سابقہ انبیاء نبی کی آمد کے ذکر سے پر کرتے تھے اس جگہ کو رسول آخر الزماں ﷺ نے خلافت سے پر کیا اور خلافت بھی ایسی جو نبوت کے طریق پر ہو۔ مکی دور نبوت ہو یا مدنی اصل میں ایک مدت کی انسانی بھول کے بعد پھر اسلام کو نصب کرنے کے ادوار تھے۔ دور نبوت میں جزیرہ العرب کی حد تک اسلام کو ایک غالب حیثیت سے متعارف ہو چکا تھا لیکن اس کے انتظامی عدالتی، تمدنی، معاشرتی، ثقافتی، تعلیمی، شوریائی امور وغیرہ کی تفصیلات طے ہونا بھی باقی تھیں۔ چنانچہ رسول ﷺ نے نہ صرف اپنی سنت بلکہ اپنے ہدایت یافتہ خلفاء کی سنت کو اپنانا بھی لازم قرار دیا۔ یاد رہے مذکورہ نظاموں کی تفصیلات کو جو بالخصوص خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ سے قرآن و سنت کی روشنی میں طے ہوئیں اسلامی دنیا تو درکنار غیر اسلامی دنیا نے بھی اپنانے میں سعادت سمجھی۔

فضیلت ہی کے متعلق ایک اور حدیث جو معاذ بن جبلؓ اور عبیدہ بن جراحؓ سے یعنی دو جلیل القدر صحابہؓ سے مروی ہے یوں ہے:

”نبوت اور خلافت کا دور اللہ کی رحمت کا دور ہے۔“ (مجمع الزوائد)۔



یعنی رحمت کا زمانہ یا تو نبوت کا زمانہ ہوتا ہے یا خلافت کا زمانہ۔ نبوت ختم ہو چکی اب ناسیات  
خلافت کا دور ہے۔ اس کے کبھی ختم ہونے کا ذکر تو کیا اس کو ہر لمحہ قائم و دائم رکھنے کا حکم ہے۔ اگر خلافت بالفعل  
موجود ہے تو فرمان رسالت کے مطابق یہی دور دورہ رحمت ہے۔ اور اگر خلافت کی بساط لپیٹ دی جائے تو یہ وہ  
بد قسمت دور ہے کہ انسانیت اللہ کی رحمت کے سائبان سے محروم ہو جاتی ہے۔

ایک اور حدیث میں جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے سات ایسے آدمیوں کا ذکر  
فرمایا جن کو قیامت کے دن جب اللہ کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ اپنے سایہ میں لے لے گا۔  
ان ساتھ خوش قسمتوں میں خلیفۃ المسلمین ہر فہرست ہوگا۔ (بخاری، مسلم، نسائی)۔

یہ چند احادیث خلیفہ و خلافت کی فضیلت میں بیان ہوئیں لیکن شومی قسمت ہماری دین اسلام سے  
اس قدر دوری کہ ہم مؤذن کی فضیلت کو تو جانتے ہیں۔ نماز میں پہلی صف کی فضیلت کو تو جانتے ہیں۔ درود  
امراہی کی فضیلت کو تو جانتے ہیں۔ حفظ قرآن کی فضیلت کو تو جانتے ہیں، نہیں جانتے ہم تو خلافت کی فضیلت  
کو قرآن و سنت بجا نگہ دلی اعلان کریں کہ خلافت تو انسان کی تخلیق اور اس دنیا میں بھیجے جانے کا مقصد ہے  
ہماری بلا کو۔ مقصد حیات بھول کر ہم پگھلنے والوں پر سرگرواں ہیں۔ اللہ و رسول ﷺ کے نزدیک جو ہم ہمارے  
نزدیک وہ غیر ہم اور اللہ و رسول ﷺ کے نزدیک جو غیر ہم ہمارے نزدیک ہم۔ کون نہیں جانتا کہ اللہ کے  
قوانین کو نافذ نہ کرنے والا اللہ کے نزدیک کافر بھی ہے ظالم بھی اور فاسق بھی۔ دل دہل جاتا ہے بادی برحق کی  
یہ حدیث بیان کرتے ہوئے کہ ہر مرنے والا جہالت کی موت مرتا ہے اگر اس نے خلیفۃ المسلمین کی بیعت نہ کی  
ہو۔ فرمایا:

”جو شخص اپنا ہاتھ نکال لے اطاعت سے وہ قیامت کے دن اللہ سے ملے گا اس حالت میں کہ کوئی  
دلیل اس کے پاس نہ ہوگی اور جو شخص مرجاوے اور اس کی گردن میں بیعت کا قلابہ نہ ہو تو اس کی موت جاہلیت  
کی ہی ہوگی۔“ (مسلم)۔

یعنی خلیفۃ المسلمین کی بیعت کیے بغیر مرنے والا اور اس کی اطاعت سے نکل جانے والا ایسے ہی  
مرتا ہے جیسے وہ دور خلافت میں آیا ہی نہ ہو۔ دور جہالت میں ہی رہا اور دور جہالت میں ہی مرا۔ اس کی موت

ابو جہل اور ابولہب کی سی ہو گئی۔ ایسی ہی احادیث کا یا ر لوگوں نے یہ توڑ نکالا کہ وہ بیعت جو اصل میں اللہ اور بندے کے درمیان ہوتی ہے (توبہ: ۱۱۱) اور اللہ کے نمائندے خلیفۃ المسلمین ہی کا اس لیے اعزاز ہے کہ بیعت کرتے وقت اس کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے برابر سے غیرے کا مشغلہ بن گیا۔ بے ملک بادشاہوں کی طرح بے اختیار و بے بس خلفاء کی بھیڑ لگ گئی۔ بڑے عم خویش رشد و ہدایت کے میثار سلسلے چل نکلے۔ ساون کے مینڈکوں کی طرح بے شمار گدیاں معرض وجود میں آ گئیں۔ متبادل انتظام کر لیا، بھول ہی گئے ہم کہ منصب خلافت 3 دن اور دو راتوں سے زیادہ خالی رکھا ہی نہیں جاسکتا۔

ایک اور حدیث میں رسول ﷺ نے خلیفۃ المسلمین کو ڈھال قرار دیا۔ فرمایا:

”امام ڈھال ہے جس کے پیچھے لڑتے ہیں مسلمان اور بچتے ہیں مسائل و مشکلات سے۔ پھر اگر وہ حکم کرے اللہ سے ڈرنے کا اور انصاف کرے تو اس کا ثواب ہوگا اور جو اس کے خلاف حکم دے تو اس پر جہاں ہوگا“ (بخاری و مسلم)۔

کس قدر عمدہ مثال فرمائی نہی کائنات ﷻ نے۔ اندازہ لگائیں معرکہ حق و باطل پر پابے تکواریں تکواریں سے ٹکرا رہی ہیں۔ ہر مجاہد کے دائیں ہاتھ میں تکواریں ہیں تو بائیں میں ڈھال ہے۔ ایسے میں اگر آپ ایک ایسے مجاہد کو میدان میں اتاریں کہ جس کے پاس تکواریں تو ہیں ڈھال نہیں ہے تو ٹھیک ہے اس کا اگر داؤ لگ گیا تو وہ شاید حریف کا کام تمام کر دے لیکن جو تکواریں اس پر پڑیں گی ڈھال کی عدم موجودگی میں تو وہ اسے گاجر موٹی کی طرح کاٹ کر رکھ دیں گی۔ نبی کائنات ﷻ نے خلیفۃ المسلمین کو ڈھال سے تشبیہ دے کر دو اور دو چار کی طرح واضح کر دیا کہ وقت کے کسی بھی موڑ پر جب امت مسلمہ خلیفۃ المسلمین سے محروم ہوگی تو اقوام عالم بدورِ بے اس کا خون بہائیں گی۔ یہ خون فلسطین میں بھی بہے گا۔ یہ خون کشمیر میں بھی بہے گا۔ یہ خون افغانستان اور عراق میں بھی بہے گا۔ غرضیکہ میدان کارزار کا روپ دھار جائیں گی تو صرف مسلمان سر زمینیں۔ دنیا بھر میں ارزانی ہوگی تو خونِ مسلم کی اور بربادی ہوگی تو عصمتِ مسلم کی۔

اس حدیث پاک سے ایک اور بہت سچے کی بات کا راز نکلا۔ وہ یہ کہ نظام خلافت کے ہونے ہی سے مسلمانوں کے مسائل حل ہو گئے۔ بدوں خلافت امت مسلمہ گھمبیر مسائل سے دوچار ہو گئی جیسے کہ ہماری

آنکھوں کے سامنے آتے وہ ہے۔ اسی صورت حال کو ایک اور حدیث سے واضح کیا گیا۔ فرمایا:

حضرت عمرؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”خلیفۃ المسلمین زمین میں اللہ کا سایہ ہے۔ اللہ کے بندوں میں سے ہر مظلوم ادارہ خلافت کی پناہ حاصل کرے گا۔“

یعنی دنیا بھر میں کسی بھی مظلوم کو پناہ ملے گی تو نظام خلافت میں۔ اس کی وادری ہوگی تو خلیفۃ المسلمین کی موجودگی میں۔ آج پتہ ہے خود مسلمان کس جگہ اور کن اداروں میں فریاد لیکر جاتے ہیں؟ ان ممالک میں کہ جہاں ستاون مسلمان ممالک اگر فریاد لیکر جائیں تو جمہوریت کے دعوے دار ایک عدد دویں سے اس کی دھجیاں بکھیر دیتے ہیں یعنی عدل کے دعوے دار اداروں کی بنیاد ہی بے جھٹی اور ظلم پر استوار ہے۔ ایک اور حدیث جس کے راوی اس عباسؓ ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”خلیفۃ المسلمین کے بغیر امت کی اصلاح ممکن نہیں۔“

ایک بہت بڑی حقیقت سے پردہ اٹھایا رسول اللہ ﷺ نے اس مختصر حدیث میں۔ یعنی فرمایا تو یہ کہ جب امت میں بگاڑ آچکا ہوگا۔ جب مسلمانوں کی گاڑی دعویٰ سے اتر چکی ہوگی۔ وہ پکڑنڈیوں میں سرگرداں ہاتھ پاؤں مار رہی ہوگی ایسے میں مسلمانوں کی بگڑی محض اپنی عقل کے گھوڑے دوڑانے اور خود ساختہ منصوبے بنانے سے نہیں بنے گی۔ بنے گی تو صرف نظام خلافت کو پھر بحال کرنے سے۔ امت مسلمہ کی حالت زار کو دیکھ کر ہر ماسخ خواہ وہ عالم دین ہو یا سیاستدان دانشور ہو یا پروفیسر وغیرہ جو مل تجویز کرتا ہے وہ یہ کہ مسلمان متحد ہو جائیں۔ حل واقعی یہی ہے بڑا کافی اور بڑا اسانفی لیکن تجویز کنندہ کوئی واضح لائحہ عمل نہیں دیتا کہ اتحاد ہو تو کیسے؟ محض اتحاد کی بات کرنا اور یہ کہنا کہ اتحاد میں بڑی طاقت ہے بالکل بجا لیکن محض اتحاد اتحاد کے گن گانے یا اتحاد المسلمین سے موسوم کر کے کوئی کمیشن وغیرہ بنا لینا کیا امتیٰی سطح کے اتحاد کو بحال کر سکتا ہے؟ ایسی کمیشیاں اور ادارے بنانے سے مزید انتشار تو پھیل سکتا ہے اتحاد قیامت قائم نہیں ہو سکتا۔ امتیٰی سطح کا اتحاد صرف اسی ایک طریقہ سے قائم ہو سکتا ہے جو خالق کائنات کا وضع کردہ اور نبی کائنات ﷺ کا آزمایا ہوا ہے اور وہ یہ کہ پوری امت کی باگ ڈور اس ایک خلیفہ کے ہاتھ میں ہو کہ جس کی اطاعت بھی اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کے بعد اور تحت لازمی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جو نظام زندگی دیا ہے وہ ہے ہی اتحاد کی اعلیٰ ترین صورت۔ نظام

خلافت سے بڑھ کر کسی اتحاد کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول ﷺ کی متعدد احادیث تاکید کرتی ہیں کہ ایک خلیفہ کی موجودگی میں اگر کبھی دوسرا آدمی کو اس کو قتل کر دو۔ صحیح مسلم کی ایک تسلسل میں بیان ہونے والی تین احادیث ملاحظہ ہوں۔ فرمایا:

۱۔ ”قربیب ہیں فتنے اور فساد پھر جو کوئی چاہے اس امت کے اتفاق کو بگاڑا تو اس کو تلوار سے مار دیا خواہ کوئی ہو۔“

۲۔ ”جو شخص تمہارے پاس آوے اور تم سب ایک شخص پر جمے ہو۔ وہ چاہے تم میں پھوٹ ڈالنا اور جدائی کرنا تو اس کو مار ڈالو۔“

۳۔ ”جب دو خلیفہ سے بیعت کی جاوے تو جس سے اخیر میں بیعت ہوئی ہو اس کو مار ڈالو۔ (اس لیے کہ اس کی خلافت پہلے خلیفہ کے ہوتے ہوئے باطل ہے)“ (کتاب الامارت)۔

آج ہمارے ہاں مسلمانوں پر کوئی 57 حکمران مسلط ہیں۔ اللہ و رسول ﷺ کے احکامات کی اس قدر مخالفت کہ 57 کی تو کیا بات نبی رحمت ﷺ تو ایک وقت پر دو خلفاء کی اجازت نہیں دیتے اور اس کا طریقہ بتایا تو یہ کہ دوسرے حکمران کو سزا دیا جائے یا قتل کر دو۔ اس قدر سخت سزائیں دوسرے سزا دینے والے کی تو اس لیے کہ اس فعل سے امت مسلمہ میں تفرق پڑتا ہے۔ اور تفرق فتنہ اور بڑے فساد کا موجب ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا:

”جو لوگ منکر حق ہیں وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں۔ اگر تم یہ نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد پیدا ہوگا“ (انفال: 73)۔

یاد رہے فتنہ و فساد کی قبر مانیاں اس قدر زیادہ ہیں کہ قرآن مجید انہیں قتل سے زیادہ مہلک اور ہولناک قرار دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

”قتل اگرچہ برا ہے لیکن فتنہ اس سے بھی زیادہ برا ہے“ (بقرہ: 191)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قتل بڑا ہولناک جرم ہے۔ اس قدر ہولناک کہ بغیر حق کیا ہوا قتل پوری انسانیت کے قتل کے مترادف ہے۔ مسلمان کو عداقت کرنے والے کی سزا صرف دوزخ ہے اس سے کم نہیں۔

لیکن فقہاس سے بھی زیادہ ہولناک ہے تو اس لیے کہ یہ اصلاح کی ضد اور ایسی صورت حال پیدا کرتا ہے کہ اس میں ایک تو کیا ہزاروں لاکھوں قتل ہو کر بھی جان نہیں چھوٹی۔ سچ کہا مولانا مودودیؒ نے کہ ”جب کوئی انسانی گروہ زبردستی اپنا فکری استبداد دوسروں پر مسلط کرے اور لوگوں کو قبول حق سے بھر روکے اور اصلاح و حق کی جائز و معقول کوششوں کا مقابلہ دلائل سے کرنے کی بجائے حیوانی طاقت سے کرنے لگے تو وہ قتل کی بہ نسبت زیادہ سخت برائی کا ارتکاب کرتا ہے اور ایسے گروہ کو یزید و شمشیر بنادینا بالکل جائز ہے۔“

شرک بہت بڑا جرم ہے لیکن تفرق و فرق واریت اس سے بھی بڑا جرم ہے۔ چنانچہ حضرت بارون نے سامری کے پیدا کردہ شرک کو تو برداشت کر لیا لیکن یہ گوارا نہ کیا کہ ان کی مداخلت کی وجہ سے امت تقسیم ہو جائے۔ فرق واریت اس لیے شرک سے زیادہ مہلک ہے کہ فرق واریت سے جرم دوہرا ہو جاتا ہے یعنی فرق واریت بھی اور ساتھ شرک بھی۔ یاد رہے ہمارے ہاں مذہبی فرق واریت بہت بعد کی بات ہے۔ پوری امت کیلئے ایک حکمران کی بجائے متعدد دھڑوں وجود میں آ گئے تو سیاسی فرق واریت کا دور دورہ پہلے ہوا تو اس سیاسی فرق واریت کے نتیجے کے طور پر مذہبی فرق واریت کا ظہور بعد میں۔ سیاسی فرق واریت آج ختم ہو جائے اور پوری امت مسلمہ ایک خلیفہ المسلمین کی سربراہی میں آ جائے تو مذہبی فرق واریت جلد اپنی موت آپ مر جائے گی۔ رسول ﷺ کے ارشاد کے مطابق اگر ہم امت مسلمہ کو ”جسد واحد“ کی صورت میں رکھتے یعنی پوری امت کو ایک حکمران کی سربراہی میں رکھتے تو نہ فرق واریت سر اٹھاتی اور نہ فتنہ و فساد اور شرک کا ارتکاب ہوتا۔ یاد رہے کشمیریوں کا مسئلہ صرف کشمیریوں کا نہیں، امت مسلمہ کا مسئلہ ہوتا۔ مسئلہ فلسطین بھی اصل میں امت مسلمہ کا مسئلہ ہے نہ کہ محض فلسطینیوں کا۔

### اجماع امت بطور ماخذ خلافت

اصول تو ویسے یہ ہے کہ جس چیز کا جواز قرآن مجید سے ثابت ہو جائے وہ اہل ہے۔ ان صفحات میں سنت رسول ﷺ اور اجماع امت کو مزید کھنگالا جا رہا ہے تو اس لیے کہ دیکھا جائے کہ قرآن مجید میں بیان کردہ مضمون خلافت کو رسول ﷺ اور صحابہؓ نے کس طور پر کیا۔ یاد رہے معاملے میں یا ایسی نئی صورت حال کہ جس کے متعلق قرآن و سنت میں نص نہ ملے قرآن و سنت ہی کی روشنی میں ذیلی قانون سازی کرنا ”اجماع امت“

ہے۔ قرآن و سنت کے معانی کو متنازع ہونے کی صورت میں متعین کرنا "اجماع امت" ہی کے دائرہ میں آتا ہے۔ نظام خلافت میں "اجماع امت" کو تیسرے ماخذ کی حیثیت حاصل ہے اور یہ اجتہاد ہی کی ایک قسم ہے۔ "اجماع امت" میں لفظ "امت" کا ہونا خود غمازی کرتا ہے کہ یہ امتی سطح کی ذمہ داری ہونے کی بناء پر شوری کے دائرہ کار کا معاملہ ہے۔ اجماع کا لغوی معنی ہے اتفاق اور اتفاق کی نوبت آتی ہی اس وقت ہے جب فرد کی بجائے ایک جماعت فیصلہ کرے۔ یہی بات ہے جو حضرت علیؑ نے سعید المسیب جو رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد مدینہ میں پیدا ہوئے کے ایک سوال کے جواب میں کہی۔ سوال کیا گیا اگر کسی مسئلے پر قرآن و سنت خاموش ہوں تو پھر ہم کیا کریں۔ جواب حضرت علیؑ نے فرمایا کہ اگر آپ کو قرآن مجید سے بھی اور سنت رسول اللہ ﷺ سے بھی راہنمائی نہ ملے تو پھر ایک عالم پر اکتفاء نہ کرنا چاہئے بلکہ مجتہدین کی ایک جماعت اس کا فیصلہ کرے۔ شوری مجتہدین ہی کی جماعت تو ہوتی ہے۔

قیام خلافت کے نصاب کے متعلق اجماع امت ہے کہ منصب خلافت تین دن اور دو راتوں سے زیادہ خالی نہ رہے۔ رسول اللہ ﷺ کی رحلت پر ان کا جد مبارک تین دن اور دو راتیں سپرد خاک نہ کیا گیا اس لیے کہ کبار صحابہؓ عہد نبی ساعدہ میں جمع تھے یہ فیصلہ کرنے کیلئے کہ اب خلیفہ المسلمین کون ہو؟ انصار کا خیال تھا کہ ہونے والا خلیفہ انصار میں سے ہو جبکہ مہاجرین کی رائے تھی کہ وہ مہاجرین میں سے ہو۔ اسی دوران ایک تیسری تجویز جسے ایمان نے منصفہ مسز ذکر دیا، یہ تھی کہ ایک خلیفہ مہاجرین سے اور ایک انصار سے مقرر کر لیا جائے۔ اس تجویز کو دو فوک رد کیا گیا تو اس لیے کہ قرآن و سنت اس کی اجازت نہیں دیتے۔ یہ اتفاق ہوتے ہی کہ ہونے والا خلیفہ المسلمین مہاجرین میں سے ہو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ اور حضرت عبیدہ بن جراحؓ میں سے کسی ایک کو خلیفہ المسلمین بنانے کی تجویز پیش کی۔ ابھی بات آگے نہ بڑھی تھی کہ حضرت عمرؓ نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ہاتھ میں دے دیا۔ یہ بیعت کا آغاز تھا چنانچہ اس کے بعد وہاں پر موجود صحابہؓ نے تو وہیں بیعت کر لی جب کہ باقی کبار صحابہؓ نے اگلے دن مسجد نبوی میں کی۔

نصب خلافت کا معاملہ اس قدر اہم تھا کہ بظاہر اس وقت شریعت کے دو احکام کو پس پشت ڈالا گیا۔ ایک تو یہ کہ وفات پانے والے کو جلد از جلد دفن دیا جائے اور دوسرے یہ کہ متوفی کے اعز ہوا قبر اس وقت

تک کوئی دوسرا کام نہ کریں جب تک رحلت کرنے والے کو دفن نہ دیا جائے۔ اصل میں اس وقت معاملہ درپیش غیر معمولی نوعیت کا تھا۔ یاد رہے کوئی بھی نئی اپنے وقت کا خلیفہ بھی ہوتا ہے۔ رحلت فرما جانے والی ہستی ﷺ جس منصب و رتبے کو سنبھالے ہوئے تھی غیر معمولی نوعیت و اہمیت کا حامل تھا۔ معاملہ صرف ہونے والے خلیفہ المسلمین کے چناؤ کا ہی نہ تھا اس اہم بات کا فیصلہ کرنا مطلوب تھا کہ منصب خلافت زیادہ سے زیادہ کتنا عرصہ خالی رکھا جاسکتا ہے۔ نصاب جو اس طرح طے ہوا بعد میں بھی اس کا حوالہ دیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے بعد پنے جانے والے خلیفہ المسلمین کیلئے جو کمیشن بنائی اسے یہ بھی تاکید کی کہ وہ یہ فیصلہ تین دن اور دو راتوں کے اندر اندر کرے۔ ثقیف بنی ساعدہ میں دو ہڑے ہڑے فیصلوں پر اجماع امت ہوا۔ ایک تو منصب خلافت کے خالی رہنے کے نصاب پر اور دوسرے یہ کہ ایک وقت پر پوری امت مسلمہ صرف ایک خلیفہ کی سربراہی میں ہو دیا دو سے زیادہ خلفاء کی سرکردگی میں کبھی نہیں۔

اسے مالا فقی کا نام دیا جائے بدبختی یا گمراہی کا ایک مدت سے مقدور ہجر مخالفت کئے ہوئے ہے امت مسلمہ ان دونوں فیصلوں کی جوئی کائنات ﷺ کی رحلت کے موقع پر کہا رہا یہ بشمول السابقون الاولون نے کئے۔ کہاں یہ اجماع امت کہ منصب خلافت تین دن اور دو راتوں سے زیادہ خالی نہ رہے اور کہاں یہ صورت حال کہ دو خلافت راشدہ کے اختتام سے آج تک خالی ہے منصب خلافت۔ پھر کہاں اس فیصلے پر اجماع امت کہ ایک وقت میں پوری امت مسلمہ صرف ایک خلیفہ کی سربراہی میں ہو اور کہاں مسلمانان عالم پر آج مسلط ہوا ستاون سربراہان کا۔ کیا جواب ہو گا اس دن جامعہ الازہر اور دوسرے اونچی کھٹی والوں کا جب اللہ پوچھے گا کہ جب دس حق کو یوں ملایا میت کیا جا رہا تھا تو تم کہاں مر گئے تھے؟ تمہارے سامنے دس اسلام کے حصے بخرے ہوتے رہے اور تم یوں لمبی نان کر سوائے رہے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں؟ کاش احمالیں محراب و منبر جان جائیں کہ ہماری زندگی کا ایک ایک لمحہ گناہ گاری میں گزر رہا ہے جب تک ہم نظام خلافت کو پھر اس دھرتی کا مقدور بنا کر اسوۂ رسول ﷺ کی پیروی کا حق ادا نہیں کرتے۔

ظاہر ہے ”قیاس بطور ماخذ خلافت“ کو زیر بحث لانے کی ضرورت ہی نہیں۔

## نظامِ باطل

### نظامِ باطل ہے کیا؟

نظامِ باطل کہا جائے یا دورِ جہالت بات ایک ہی ہے۔ یعنی وہ نظام جو قرآن و سنت کے خالص احکامات و قوانین پر مبنی نہ ہو۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ایسا نظام جو قرآن و سنت کے خالص قوانین و ضوابط پر رواں دواں ہو آج کی دنیا میں زیرِ آسمان کہیں نہیں۔ ہر جگہ یعنی دنیا کے ہر گوشے میں نظامِ باطل کی چہل پہل ہے اور وقت کے موجودہ موز پر اس کی دو اقسام ہیں۔ نظامِ باطل کی ایک قسم وہ ہے جو قرآن و سنت کے انکار پر مبنی ہے اور اس وقت پوری دنیا کے کفر میں رواں دواں ہے۔ کفار و مشرکین نے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ صوابیہ کی اختیارات کو بغاوت کا راستہ اختیار کرتے ہوئے اپنے ہاں کے نظاموں کو اپنی خواہشات و مفادات پر استوار کر رکھا ہے۔ نظامِ باطل کی دوسری قسم وہ ہے جو کچھ اسلام کچھ غیر اسلام کچھ اللہ و رسول ﷺ کے احکامات اور کچھ اپنی خواہشات و مفادات کے ملغوبے پر مبنی ہے۔ قلم لکھتے جھجک محسوس کر رہا ہے کہ ایسا آدھا تیر اور آدھا تیر کے مصداق نظام اس وقت پوری دنیا کے اسلام میں جاری و ساری ہے۔ پھر یہ بھی کہ جیسے منافق اللہ تعالیٰ کے نزدیک کافر سے زیادہ قابلِ گرفت ہے دنیا کے اسلام کا اپنایا ہوا ملغوبہ نظام دنیا کے کفر کے اپنائے گئے کافرانہ نظام سے زیادہ مہلک اور زیادہ قابلِ گرفت ہے۔ قرآن مجید میں آیا:

”تو کیا تم کتاب (قرآن) کے کچھ حصوں کو مانتے ہو اور کچھ کا انکار کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں؟ اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو“ (بقرہ: 85)۔

جس ذلت و خواری سے اس وقت مسلمانانِ عالم دوچار ہیں اس کی وجہ کس قدر کھول کر اس آیت



کریمر میں بیان فرمادی گئی ہے۔ کتاب کے کچھ حصوں پر عمل پیرا ہوا لیکن نمبر 2 میں بیان ہو چکا ہمارے اختیار کردہ دین میں نہ خلیفہ المسلمین کا وجود ہے نہ اولوالامر کا نہ ملت مسلم کا نہ شوری کا اور نہ بیت المال کا۔ ان تمام قرآنی بنیادوں کو مسمار کر کے مسلم دنیا کے ہر ملک نے اپنے ہاں جو نظام رائج کر رکھا ہے اس میں محض اپنی خواہشات و مفادات کی تکمیل کرنے والے ادارے قائم کر رکھے ہیں۔ یہ صدوزیہ ڈکٹیٹر یا بادشاہ یہ خود ساختہ امراء یہ پارلیمنٹ یہ خود ساختہ آئینی کتابچے اور دوسرے متبادل انتظامات اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ مختلف مسلم ممالک میں اختیار کردہ نظاموں میں کچھ اسلام اور کچھ غیر اسلام کی نسبت تناسب کا تو فرق ہے لیکن ہے ہر مسلم ملک کا نظام کچھ اسلام اور کچھ غیر اسلام پر مبنی۔ اور تو اور یہ درجنوں مسلم ممالک کا وجود خود غیر اسلامی ہے۔ یہ پوری دنیا کے اسلام پر ایک خلیفہ المسلمین کی سربراہی کی بجائے آج کوئی 57 سربراہوں کا مسلط ہونا کچھ اسلام اور کچھ غیر اسلام کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ نظام خلافت قائم و دائم رکھا جاتا تو ایسا نہ ہوتا۔ نظام خلافت کو بحال کر دیا جائے ہر چیز موزوں (In Order) اور اسلامی ہو جائے۔ اس دنیا کی ذلت و رسوائی سے بھی نجات مل جائے اور آخرت کے شدید ترین عذاب کی بھی نوبت نہ آئے۔

### نظام باطل اور اسوۂ رسول ﷺ

جب دنیا میں نظام باطل روں دواں ہو تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسوۂ رسول ﷺ کیا ہے؟ ایسی صورت حال کی ظاہر ہے اللہ کے رسول ﷺ اور ان کے ساتھیوں نے اصلاح کی۔ نظام باطل کو نظام حق اور دور جہالت کو دور خلافت میں بدلا۔ ”قاصد فی“ اور ”اطاعتی“ کے مطالبات ہمارے لیے اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں چھوڑتے ہیں کہ نظام جہالت جس سے ہمیں سابقہ پڑا ہوا ہے کو نظام خلافت میں بدل جائے۔ ”فقد اطاع اللہ“ کا حصول ”من طاع الرسول“ کی شرط پوری کیے بغیر ممکن نہیں اور اطاعت رسول ﷺ اس کے سوا اور ہے کیا کہ دور جہالت سے کھنکھوتہ نہ کیا اور چین نہ لیا جب تک کہ اسے دور خلافت میں بدل نہ دیا۔

ایک دن آما ہے۔ ہر فرد نے اپنے رب کے حضور پیش ہونا ہے۔ اللہ پوچھے گا میرے بندے! تو نے وہ کام کیوں نہ کیا جو میرے رسول ﷺ نے کیا۔ بندہ عرض کرے گا باری تعالیٰ! میں نے بہت نمازیں پڑھیں فرض ہی کا کیا نقلی روزوں کی بھرمار کر دی زکوٰۃ و صدقات دیتا رہا۔ حج بھی میں نے کیا عمرے تو بہت

کیے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے بندے! کیا میرے رسول ﷺ دنیا میں گئے تو نمازیں پڑھ کر اور روزے وغیرہ رکھ کر واپس آ گئے۔ یاد ہے تم کو انہوں نے ﷺ نے اور ان کے ساتھیوں نے سختیں کیں، قربانیاں دیں، مصائب و مشکلات کے پیرازان پر ٹوٹ پڑے، شب و روز چین نہ لیا جب تک کہ نظام جہالت کو نظام خلافت میں بدل نہ دیا۔ بندے! تو مجھے عرف ایک سوال کا جواب دے کہ تو نے مسنون زندگی کیوں نہ گزاری؟

قرآن و سنت کے اوراق پلٹیں، مسنون زندگی گزارنی ہے تو آج کے مسلمانوں کیلئے عرف ایک راستہ ہے کہ موجودہ نظام جہالت کو نظام خلافت میں بدل لائے۔ جب رواں دواں نظام کو بدلنا ہے تو اس کے دوراستے ہیں۔

پہلا راستہ یہ کہ موجودہ نظام باطل سے بقدر استطاعت اجتناب کیا جائے۔ اس کا حصہ نہ بن کر اسے بدلنے کی کوشش کی جائے۔ یہ وہی طریقہ ہے جو انبیاء و مشمولین کا نظام ﷺ نے اختیار کیا۔ اللہ کا قرار کرنے سے پہلے طاغوت کا انکار کیا۔ دنیا میں کوئی نئی ایسا نہیں آیا جس نے مروجہ معاشرے کی پیروی کی ہو۔ خود معاشرے کے پیچھے گلنے کی بجائے اس نے معاشرے کو اپنے پیچھے لگانے کی سر توڑ اور بھرپور کوشش کی۔ اگر آدمی باطل معاشرے کی پیروی کرے اور ساتھ نماز روزے وغیرہ کا اہتمام کرے تو اسے کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ بھانپنا اس وقت چتا ہے جب باطل نظام سے کھوت نہ کیا جائے اور اسے بدلنے کی تگ و دو کی جائے۔ ایک آدمی کی عادات کو بدلنا کاردار اور پھر جسے بنائے نظاموں کو بدلنا مجڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا ہوتا ہے۔ ہمت شکن مصائب اور دل دہلا دینے والی تکالیف سے واسطہ پڑنا لازمی ہے۔ قرآن اس کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ ایک جگہ پر فرمایا گیا:

”پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا حالانکہ تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے؟ ان پر سختیاں گزریں، معصیتیں آئیں، ہلا مارے گئے، حتیٰ کہ وقت کا رسول ﷺ اور اس کے ساتھی اہل ایمان چلیں، اللہ کی مدد کب آئے گی..... اس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے“ (بقرہ: 214)۔

ایک اور جگہ پر آیا:

”الف۔ ل۔ م“ کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ”ہم ایمان لائے“ اور ان کو آزمایا نہ جائے گا۔ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون؟“ (مکھبوت: 1-3)۔

اصل میں بتے دیا کے بھاؤ کے موافق تیرا آسان ہوتا ہے جان پر اس وقت سختی ہے جب بھاؤ کے خلاف تیرا جائے۔ باطل نظام سے بھجوتے کے رکھنا خواہ اس کے ساتھ قیام و جہاد کی بھرمار ہو باطل نظام کے لیے بڑا سازگار ہوتا ہے۔ ایسے میں کیا جال اس کے ماتھے پر چمکن تک پڑے۔

قریش کے وفود ابوطالب کے ذریعہ بار بار آئے کہ بھیجے کو سمجھاؤ وہ کچھ لے دے کہ معاملہ کر لے۔ قرآن اس کا ذکر کرتا ہے۔ فرمایا گیا:

”پس اے نبی ﷺ جھلائے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ۔ وہ چاہتے ہیں کہ کچھ تم مداخلت کرو تو وہ بھی مداخلت کریں“ (قلم: 8-9)۔

خائفین اسلام نے یہ بھی چاہا کہ اگر ان کی خواہشات کو سوکر وہیں حق میں کچھ تبدیلیاں کر لی جائیں تو وہ محمد ﷺ کے باقی دین کو برسرِ وجود قائم کر لیں گے۔ قرآن میں آیا:

”اور جب انہیں ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں تو جو لوگ (آخرت میں) ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی اور قرآن لا دیا اس میں کچھ ترمیم کرو۔ اے محمد ﷺ ان سے کہو مجھے یہ حق نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر و تبدل کر لوں۔ میں تو بس اس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے“ (یونس: 15)۔

رسول ﷺ نے ان کی ہر پیشکش کو ہٹکارا جھٹلایا۔ ایک دفعہ تو مشرکین پیشکشوں کا ایک پرکشش چیلنج لیکر آ گئے۔ اس میں ہر فرست پیشکش یہ تھی کہ اگر محمد ﷺ ان کے ساتھ بھجوتے کر لیں تو وہ انہیں اپنا حکمران بنا لیتے ہیں۔ کیسے کرتے رسول ﷺ باطل کے ساتھ بھجوتے کسی نبی سے یہ امید رکھنا کہ وہ باطل کے ساتھ ایک قدم چل پڑے گا ایسا سوچنے والے کی محض حماقت کا مظہر ہے۔ یہی وہ ہور ہے جس پر نبی کائنات ﷺ کے سامنے دو متبادل راستے تھے۔ ایک سبوتوں کا راستہ تھا تو دوسرا مشکلات کا۔ ایک تن آسانیوں اور تن پروری کا راستہ تھا تو

دوسرا ہجرت و فرار کا۔ ایک مروجہ معاشرے کے پیچھے چلنے کا راستہ تھا اور دوسرا معاشرے کو اپنے پیچھے لگانے کا۔ پوری تاریخ شاہد برقی نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ نبی کائنات ﷺ نے بھی یہی دوسرا راستہ اختیار کیا اس لیے کہ ایسا کیے بغیر باطل نظام نہیں بدلا کرتے۔ جب بھی کسی نے نظام بدلتا ہے ضروری ہے کہ اس سے قدر استطاعت اجتناب کیا جائے۔ مسنون طریقہ یہی ہے۔

ہم نے محض ”اجتناب“ کا نہیں ”قدر استطاعت اجتناب“ کی اصطلاح کا استعمال کیا۔ یعنی رواں دواں نظام باطل کے ساتھ چلنے سے انکار کرنا تو لازم ٹھہرا لیکن یہ اجتناب اسی حد تک کیا جانا ضروری ہے جس حد تک کسی کے بس میں ہو۔ مثال کے طور پر باطل نظام کی ملامت سے اجتناب ہے تو لازم لیکن کوئی متبادل روزگار کے قائل نہ ہو یا اسے روزگار نہ ملنے کا خدشہ ہو تو وہ اجتناب نہ کرے۔ البتہ اسے ایک مجبوری سمجھ کر کرے اور موقع ملے ہی اس سے دستبردار ہو جائے۔ کوشش اس کی نظام کو بدلتے کیلئے رہے یعنی وہ ان لوگوں کا ہجر پور ساتھ دے جو نظام بدلنے میں مصروف ہوں۔ یاد رہے نبی رحمت ﷺ اور صحابہؓ اسی خانہ کعبہ میں عبادت کرتے رہے جہاں مشرکین عرب نے 360 بت سجا رکھے تھے۔ انجام کار اللہ تعالیٰ نے بت پرستوں کو تو مشرکین قرار دیا اور وہ جو مجبوراً اس خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے جنہیں اس نظام سے نفرت تھی اور جو ٹھانے بیٹھے تھے کہ موقع ملے ہی کعبہ اللہ کو اس گندگی سے پاک کر دیں گے اللہ تعالیٰ انہیں ”السا بقون الاولون“ قرار دیتا ہے یعنی وہ لوگ جنہوں نے نظام بدلنے میں مسابقت کی۔ دونوں گروہ..... مخالفین اسلام اور اسلام والے اسی خانہ کعبہ میں عبادت کرتے تھے جو باطل زدہ تھا۔ زمین و آسمان کا فرق پڑ گیا ان کے انجام میں تو اس لیے کہ ایک گروہ کو اللہ تعالیٰ مشرکین یعنی وہ جن کی بخشش نہیں قرار دیتا ہے اور دوسرے گروہ کو السا بقون الاولون یعنی وہ جن کو اسی دنیا میں جنت کی بنا رست دی گئی کا مستحق ٹھہرایا گیا۔ اتنا بڑا فرق پڑا تو اس لیے کہ پہلا گروہ خانہ کعبہ کے باطل نظام کا کنوڈین تھا جب کہ دوسرا اس نظام میں بکرا بت وقت گزاری کر رہا تھا اور کوشاں تھا کہ ایک دن وہاں کے نظام کو ہر غیر اللہ آلودگی سے پاک کر دے گا۔ ایسا ہی ہوا وہ وقت آیا جب نبی کائنات ﷺ ان جوہر نے خداؤں کو اپنی چمڑی سے گرا رہے تھے۔

تو ایک طریقہ تو باطل نظام بدلنے کا وہی جس کا ذکر ہوا دوسرا طریقہ یہ کہ باطل نظام بدلنے والے

نظام کا حصہ بن کر اسے بدلنے کی جدوجہد کریں۔ یعنی وہ طریقہ کہ جسے کسی بھی نے اختیار نہیں کیا۔ غیر مسنون اس لیے کہ رسول ﷺ نے بعد اس طریقے کو اختیار کرنے سے انکار کیا۔ کیوں انکار کیا؟ بڑا سوال ہے۔ بڑے ہی غور و خوض کا مقاضی۔ ایک فقرے میں اس کا جواب دیا جائے تو یہ کہ ”اس طریقے کو اپنانے والے نظام کو بدل نہیں پاتے بلکہ دھیرے دھیرے دھیسے دھیسے باطل نظام انہیں بدل دیتا ہے۔“ دیر یا سیر وہ جو بڑے جوش و ہوش سے نظام کو بدلنے کے درپے ہوتے ہیں آہستہ آہستہ خود باطل نظام کے موافق بلکہ رسیا ہو جاتے ہیں۔ اس قدر رسیا کہ شعوری اور لاشعوری طور پر اس کے گن گنا شروع کر دیتے ہیں۔ محنتیں بھی کرتے ہیں۔ قربانیاں بھی دیتے ہیں۔ اخلاص کے بحر پر مظاہرے بھی کرتے ہیں لیکن شومی قسمت نظام باطل کے زہر سے بچ نہیں پاتے۔ مجبوری کی آڑ میں ایسی دلدل میں پھنس جاتے ہیں کہ قرآن و سنت کی نصوص تک توڑتے چلے جاتے ہیں۔

## نظام باطل کے تضادات

نظام باطل میں کوئی خرابی ہے کہ کسی بھی نے بھی اس سے کچھ نہیں کیا بلکہ بحر پر کوشش کی کہ اسے اولیں فرصت میں نظام حق سے بدل دیا جائے۔ انبیاء و رسل کی بعثت اور کتبِ سماوی کی تنزیل کا مقصد واحد تھا ہی نظام باطل کا قلع قمع کر کے اس کی جگہ نظام حق کو برپا کرنا۔ خود ہی کائنات ﷻ نے جیسے کہ پہلے ذکر ہو چکا دور نبوت کا ایک ایک لمحہ نظام باطل کو نظام خلافت کے بدلنے میں لگایا تو کیوں؟ اس لیے کہ نظام باطل غیر فطری غیر متوازن غیر صالح اور غیر عادلانہ ہونے کی وجہ سے ایسا سازگار ماحول پیدا کرتا ہے کہ انسان اللہ کی غلامی سے نکل کر بندوں کی غلامی میں آجاتا ہے اور یوں اس کی زندگی تضادات کا مجموعہ اور اجڑن رہتی ہے۔ مثال کے طور پر ہم ذیل میں چند تضادات کا ذکر کرتے ہیں (نظام باطل کے مضمر اثرات کا بیان تو ہم انشاء اللہ پیکچر نمبر 6 میں کریں گے)۔

ہماری یہ تحریر انسانیت کی سطح کی ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ اس آفاقی تحریر کو مقامی و شخصی حالات سے ملوث نہ کریں۔ لیکن بات سمجھانے کی خاطر ہمیں ذیل میں ملکی و مقامی سطح کے حالات کو بیان کرنا پڑ رہا ہے۔ ہم اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔

دوسرے کئی مسلم ممالک میں بھی ایسا ہوا لیکن ہم یہاں پر صرف ملکِ عزیز پاکستان کی بات کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں سالہا سال سے نظامِ باطل کا حصہ بن کر اور الیکشنوں کا راستہ اختیار کر کے یہاں پر اسلامی نظام قائم کرنے کیلئے متعدد دوینی جماعتیں کوشاں ہیں۔ وہ جو "اسلامی نظام، اسلامی نظام" کا داعیہ لیکر باطل نظام کا حصہ بنے تھے آج "جمہوریت، جمہوریت" کا راگ الاپ رہے ہیں۔ بھول گئے کہ جمہوریت..... جمہور کے خود ساختہ آئین و قانون پر مبنی نظام ہی تو باطل نظام ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان کیا جمہوریت کو قائم کرنے اور جمہوری اداروں کو مستحکم کرنے کیلئے بنایا گیا تھا؟ جمہوریت تو ہندوستان میں آج بھی ہے۔ بلکہ بھارت کی جمہوریت ذرا زیادہ خالص ہے۔ ایسے میں کس حکیم نے کہا تھا کہ خون کے دریا عبور کرو اور سرزمینِ پاکستان پہنچ کر جمہوریت کو نافذ کرو؟ قرآن و سنت گواہ سب خرابیوں کی جڑ بندوں کی بندوں پر حکومت ہے۔ اس میں کیا شک نظامِ خلافت کو بھی بندے ہی چلاتے ہیں۔ اصل میں بات قانون کی ہے۔ جس کا قانون رائج ہو حکومت اس کی ہوتی ہے۔ نظامِ خلافت کو بھی بندے ہی رواں دواں رکھتے ہیں لیکن قانون اللہ کا ہوتا ہے۔ اور وہ آفاقی قانونِ خلیفہ وقت پر بھی اسی طرح لاگو ہوتا ہے جس طرح کہ ایک عام شہری پر۔ جمہوریت، آمریت، اشتراکیت وغیرہ ایک ہی سکے کے مختلف رخ ہیں۔ اگر نظامِ فروہاد کے بنائے ہوئے قوانین پر مبنی ہو تو اسے آمریت کہتے ہیں۔ کسی طبقے یا گروہ کے خود ساختہ قوانین پر مبنی نظام کو اشتراکیت کہتے ہیں۔ تمام عوام (جمہور) بگڑ جائیں اور وہ اپنے بنائے ہوئے قوانین لاگو کر کے نظام چلائیں تو اسے جمہوریت کا نام دیا جاتا ہے۔ تمام کافرانہ ممالک میں اس وقت انسان ساختہ زیادہ تر یہ تینوں نظام جاری و ساری ہیں۔ کس قدر بھول..... کفار و شرکین بھی جمہوریت پسند، مسلمان بھی جمہوریت پسند..... چونکہ کفر از کعبہ بر خیز و کجا ماند مسلمان؟

نظامِ خلافت عبادت ہے اس لیے کہ یہ اللہ کا وضع کردہ اور رسول ﷺ کا آزمودہ نظام ہے۔ اس کے مقابلہ میں آمریت، اشتراکیت، جمہوریت جیسے نظام بغاوت ہیں اس لیے کہ یہ بندوں نے اپنی خواہشات و مفادات کی تکمیل میں رواں دواں کر رکھے ہیں۔ یہ انسان ساختہ نظام بغاوت تو ہیں ہی، کفر، ظلم، فسق اور شرک بھی ہیں۔ حرام ہوتی ہے وہ چیز جس میں کفر، ظلم، فسق اور شرک پیوست ہو۔ بنامیں جمہوریت حرام ہے۔

آمریت حرام ہے شراکیت حرام ہے۔

ہم نے اوپر ذکر کیا کہ نظام باطل کا حصہ بن کر نظام کو بدلنے کا داعی بظاہر مجبوراً کسی پے در پے قرآن و سنت کی نصوص کو توڑنا چلا جاتا ہے۔ اور وہ بھی دھڑلے سے اس لیے کہ ساتھ ساتھ جشن بھی منانا جاتا ہے۔ بے دریغ سرمایہ لگاتا ہے۔ دعوتیں بھی کرتا ہے، منصفانہ بھی بانٹتا ہے۔ نظام باطل کی سرگزشت مکمل نہیں ہوئی جب تک اس سارے عمل (Process) کا کچا پٹنا نہ کھولا جائے۔ جو مسلمان MPA، MNNA کی خواہش لیکر موجودہ بغیانہ نظام کا حصہ بنتا ہے، حصول منزل کی خاطر اس کو کس کس قرآن و سنت کی نص کو توڑنا پڑتا ہے؟ آئیں بادلِ خواہستہ کچھ پراگندہ نور دی کر لیں۔

مثال کے طور پر قومی اسمبلی کا رکن بننے والا امیدوار سب سے پہلے امیدواری کے فام پر کرتا ہے اور اس پر اپنے دستخط ثبت کرتا ہے۔ ایسا کر کے مصحوبیت میں وہ ایک بڑی چھلانگ لگاتا ہے۔ ایسی چھلانگ لگانے کا مطلب ہے وہ نظام باطل کے لیے مہر قبولیت ثبت کرتا ہے۔ جب کہ مسلمان ہونے کے کماٹے اس پر فرض تھا کہ طاغوت کا انکار اور اللہ کا اقرار کرتا۔ قرآن مجید میں آیا:

”جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا، اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تمام لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ سب کچھ سننا اور جاننے والا ہے“ (بقرہ: 256)۔

لیکن جب ایم این اے شپ کا امیدوار نظام باطل کو قبول کرتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ نظام حق کو رد کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ اللہ کا انکار تو طاغوت کا اقرار کرتا ہے۔ پھر جب یہ امیدوار اپنی کامیابی کی کمر شکن مہم چلاتا ہے تو کسی طور اسے عہدہ مل جائے تو وہ اس دوسری نص کو توڑتا ہے جس میں رسول رحمت ﷺ نے فرمایا ”ہم نہیں عہدہ دیتے اسے جو عہدے کو مانگتا اور مانگتا پھرے“۔ اسی انتخابی مہم (Campaign) میں جب وہ سرمایہ کاری کرتا ہے تو بیاہنگ دہل اس تیسری نص کو توڑتا ہے جو قرآن مجید میں بیان ہوئی تو اس طرح

”ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے طاغوت کو تمہارے لیے بادشاہ مقرر کیا ہے۔ یہ سن کر وہ بولے ”ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حقدار ہو گیا؟ اس کے مقابلے میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ وہ تو کوئی

یہ المادہ آردی نہیں ہے۔“ نبی نے جواب دیا ”اللہ نے تمہارے مقابلے میں اسی کو منتخب کیا ہے اور اسے دماغی اور جسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں اور اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جسے چاہوئے اللہ بڑی وسعت رکھتا ہے اور سب کچھ اس کے علم میں ہے“ (بقرہ: 247)۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ بڑے واضح انداز میں سرمائے کو بطور معیار اہلیت رد کرتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں تقریباً تقریباً واحد معیار اہلیت ”سرمایہ“ ہی ہو کر رہ گیا ہے۔ غریب لاکھوں خوبیوں کا مالک ہو، عوامی نمائندہ بننے کی اس لیے نہیں سوچ سکتا کہ سرمایہ کاری نہیں کر سکتا۔ آگے چلیں اسی مہم کے دوران وہ چوتھی نسل توڑتا ہے تو اس وقت جب خود ساختہ خوبیاں اور مخالف کی خود ساختہ خرابیاں بیان کرتا ہے۔ اسی دوران وہ برادری ازم، قرابت اور دوستی کے جذبات ابھار کر طبقاتی تقسیم پیدا کرتا ہے۔ پھر جیسے کہ ہم آگے ذکر کریں گے یہ انتخابی مہم اصل میں مہاجروں کی ایک شکل ہے یعنی اس دوران جو اٹھایا جاتا ہے اور دل کھول کر۔ متعدد دھماکوں کو اکثر و بیشتر مقروض بنا کر جو امیدوار کامیاب ہو جاتا ہے وہ بیشتر اس کے کہ ایک چھت کے نیچے مردوخواتین کی گپ شپ میں شامل ہو کر متواتر کئی نصوص توڑے، حلف اٹھاتا ہے۔ اس حلف کو منظر غائر دیکھیں اس میں قرآن و سنت کے الفاظ تک نہیں اور وہ شاید اس لیے کہ ایک غیر مسلم نے بھی منتخب ہو کر وہی حلف اٹھانا ہوتا ہے۔ حلف میں وہ اس آئین کے تحفظ کا بوجھ اٹھاتا ہے جس میں ایک بھی شق قرآن و سنت کے خلاف ہو تو اس کے تحفظ کے حلف کا کوئی مسلمان سوچ بھی نہیں سکتا۔ ایک شق کے غیر اسلامی ہونے کی تو کیا بات جس آئین کے تحفظ کا حلف اٹھایا جاتا ہے اس میں غیر اسلامی دفعات، اسلامی دفعات سے کہیں زیادہ ہیں۔ ہم ذیل میں اس کتاب کے میں شامل چند غیر اسلامی دفعات کا ذکر کرتے ہیں تاکہ باطل نظام کی ظاہریاں اور انکلی پچھو جا کر ہو۔

## طرز انتخاب

کسی بھی نظام میں طرز انتخاب کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے اس لیے کہ معرض وجود میں لائے جانے والے نظام کی یہ پہلی اینٹ ہے۔ اگر یہ پہلی اینٹ بڑھی لگ جائے تو تاثر یا دیوار کج ہی جائے گی۔ قرآن و سنت کو تو یہ طرز انتخاب وضع کرتے وقت درخور اعتناء ہی نہ سمجھا گیا، اپنی خواہشات اور رزم زمانہ کی



بیرونی کرتے ہوئے اس میں ”بر بالغ فرد ایک ووٹ“ کے اصول کو اپنایا گیا۔ اسلامی تاریخ کے ورق ایسے بار بار ایسے چاروں خلفاء راشدین میں سے کسی ایک کا انتخاب بھی اس اصول کے مطابق نہ ہوا۔ آخر کیوں؟ اس لئے کہ قرآن مجید اس اصول کے برعکس مستقل ایک اور اصول دیتا ہے۔ قرآن کریم میں بار بار آیا ”اکثر الناس الاعلمون..... لوگوں کی اکثریت ہمیشہ جاہل ہوتی ہے۔“ بالفاظ دیگر جس نظام کی اٹھان لوگوں کی اکثریت کے بل بوتے پر ہوگی وہ نظام لازماً جاہلانہ ہوگا۔ اسلام میں حق رائے دی صرف ارباب حل و عقد یعنی پہلے سے موجود اولی الامر کو حاصل ہے اور بس۔ خود امیدوار کھڑے ہو کر اپنے حق میں ووٹ مانگتے پھرنا اور اپنی تعریف خود کرتے پھرنا باطل نظام کی پرورش کرنے کا ایک اور ذریعہ ہے۔ اسلام پہلے ہی قدم پر اس بھیاں کو روکنا قلع قمع کرتا ہے۔ رسول کا ارشاد گرامی ہے:

”نہیں دیجئے عہدہ ہم اسے جو خود مانگتا اور مانگتا پھرے“ (مسلم)

ہمارے ہاں کامروہ طرز انتخاب تو ایسے ہی قمار بازی کی ایک بھیاں اور وسیع تر شکل ہے۔ جوئے کی فتنی تعریف یہ ہے کہ ایسا کھیل جس میں چند جوئے باز سرمایہ لگاتے ہیں۔ پورے لگائے گئے سرمایہ کا فائدہ ایک جوئے باز لے لیتا ہے باقی تمام ہاتھ ملتے کھڑے ہوتے ہیں۔ یہی تو ہمارے ہاں انتخابات میں ہوتا ہے۔ ایک حلقے میں چند افراد سرمایہ لگاتے ہیں۔ پورے لگائے گئے سرمایہ کا فائدہ منتخب ہونے والا قمار باز لے لیتا ہے باقی تمام ہاتھ ملتے کھڑے ہوتے ہیں۔ تھڑے پر جوا کھیلنے والے قمار بازوں اور انتخاب لڑنے والے جوا بازوں میں البتہ ایک فرق تو یہ ہوتا ہے کہ تھڑے پر کھیلنے والے معمولی سرمایہ لگاتے ہیں جب کہ انتخابات لڑنے والے لاکھوں کی سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ تھڑے پر جوا کھیلنے والوں کو پولیس آپکرتی ہے جب کہ انتخابی قمار بازوں کو حکومت وقت خود ہر سولت میسر کرتی ہے تاکہ وہ جی بھر کر کھیلیں۔ پھر تھڑے پر چھوٹے پیمانے پر قمار بازی کرنے والوں کے خلاف علماء کرام فتویٰ صادر کرتے ہیں جب کہ انتخابی قمار بازی علماء کرام خود کھیلتے ہیں۔

## اولی الامر

73ء کے آئین کے مطابق کوئی بھی غیر مسلم رکس شورنی رکس کابینہ اور رکس عدلیہ ہو سکتا ہے معروف

صدر اور وزیر اعظم کے لئے مسلمان ہونا لازمی ہے۔ ایسا بھی رسم زمانہ کی نقالی اور انسانی خواہشات کی پیروی میں کیا گیا ہے۔ اسلامی احکامات کے مطابق ہر وہ مسلمان اولوالامر کا حصہ ہے جو کسی ایسی اسامی پر تعینات ہو کہ جہاں پالیسی امور طے ہوتے ہوں یا سماجی طور پر وہ ایک فائز مقام ہو۔ شوریٰ عدلیہ کا بیٹہ کے اولوالامر ہونے میں کوئی کلام ہے ہی نہیں۔ رب کائنات تو مومنوں سے یوں مخاطب ہوتا ہے کہ ”اولی الامر منکم“..... یعنی اولوالامر مسلمانوں میں سے ہونے چاہئے“ بالخصوص ارکان شوریٰ کیلئے تو مجتہد ہونا لازمی ہے۔ بتایا جائے کہ درج ذیل حکم کیا اللہ تعالیٰ کا حکم ہے یا نہیں؟

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! طاعت کرو اللہ کی اور طاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں“ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ و رسول کی طرف پھیر دو اگر واقعی تم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر“ (نساء: 59)۔

ایک طرف اللہ تعالیٰ کا غیر مسلموں کو اولوالامر میں شامل نہ کرنے کا حکم دوسری طرف اپنی خواہشات کی پیروی میں 73 کے آئین میں غیر مسلموں کو اولوالامر میں شامل کرنے کا قانون بنائے طاغوت اور کیا ہوتا ہے؟ کیا یہی قصور نہیں قدامتِ امر و فرعون کا؟ کس قدر ڈھٹائی؟ ڈوب مرنے کا مقام ہے ان حضرات کیلئے جنہوں نے طاغوتی دستاویز پر آج سے کوئی تیس سال پہلے ہر تصدیقِ مثبت کی اور آج تک اس عظیم حادثاتی غلطی کو دہرائے جا رہے ہیں۔

## قرآنی معیارِ اہلیت

قرآن جب انتخابات کی بات کرتا ہے تو اس کے لئے پانچ اوصاف پر مشتمل معیارِ اہلیت بھی دیتا ہے۔ ”یٰۤاَہم کَامِہٖ عٰوٰی مُؤْمِنُوۡنَ“ کے لئے معیارِ اہلیت مقرر کرنے کا۔ اسلام اس بارے میں کیسے خاموش رہ سکتا تھا؟ پانچ اوصاف یعنی ایمان (نور: 55) تقویٰ (حجرات: 13) صلاح (نور: 55) علم اور جسم (بقرہ: 247) پر مشتمل معیارِ اہلیت خود قرآن میں دیا گیا۔ ہمارے ہاں کے مربوط طریقِ انتخاب جسے 73 کے آئین کی پشت پناہی حاصل ہے کی دفعات 62 اور 63 میں گو معیارِ اہلیت دینے کی بودی ہی کوشش کی گئی

ہے لیکن وہ استعداد قابل عمل ہے کہ عملاً صرف ایک ہی اہلیت وپہ کامیابی بن کر رہ گئی ہے اور وہ اہلیت ہے ”سرمایہ داری“ یعنی سرمایہ کاری کرنے کی استعداد۔ رب کائنات کو یہ تھا کہ عیار لوگ سرمائے کے بل بوتے پر لوگوں کو رام کرنے کی جسارت کریں گے لہذا اس نے جس آئیہ مبارک میں علم اور جسم جیسے دو اہم اوصاف کو قرار آتی معیار اہلیت کا حصہ بنایا اسی میں سرمایہ داری و سرمایہ کاری کو معیار اہلیت بنانے کی نفی کر دی۔ ملاحظہ ہو قرآن:

”ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے طاقت کو تمہارے لئے بادشاہ مقرر کیا ہے۔ یہ سن کر وہ بولے ”ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حقدار ہو گیا؟“ اس کے مقابلے میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ وہ تو کوئی بڑا مالدار آدمی نہیں ہے۔“ نبی نے جواب دیا ”اللہ نے تمہارے مقابلے میں اسے منتخب کیا جس لئے کہ اسے علم اور جسم کی اہلیتیں فراوانی سے عطا کی ہیں۔“ (بقرہ: 247)۔

## عورت کی سربراہی

اسلام کے معاشرتی و سیاسی نظام میں چھوٹے سے چھوٹا انتظامی یونٹ ”گھر“ ہے۔ یہ یونٹ چھوٹا تو ہے لیکن اس قدر بنیادی کہ کوئی بھی معاشرہ و تمدن باآخر گھروں کے مجموعے سے بنتا ہے۔ جیسی اینٹ ویسی دیوار کے مصداق جیسا یہ بنیادی یونٹ ہو گا ویسا ہی معاشرہ معرض وجود میں آئے گا۔ اسلام نے بنائیں اس یونٹ کی ہیئت و کارکردگی کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ خود قرآن مجید میں جتنی ہدایات گھریلو زندگی کے متعلق ہیں کسی اور یونٹ کے متعلق نہیں۔ سچے کی بات جو یہاں کی جانی مطلوب ہے یہ ہے کہ اسلام اس چھوٹے سے چھوٹے یونٹ کی باگ ڈور عورت کے ہاتھ میں نہیں نہ صرف مرد کے ہاتھ تھا تا ہے بلکہ اس تھمانے کی مصلحت بھی بیان کرتا ہے۔ قرآن مجید میں آیا:

”مرد عورتوں پر قوام ہیں اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔“ (نساء: 34)۔

ظاہر ہے جب اسلام چھوٹے سے چھوٹے انتظامی یونٹ کی باگ ڈور عورت کے ہاتھ نہیں تھا تا تو وہ پورے ملک کی قیادت کو صعب مازک کے سپرد کرنے کا کیسے روا دار ہو سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کا حکم تو سپریم ہے خود ساختہ آئین کے مصنفیں اگر سوچتے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی جب اپنے گھر کی قیادت اپنی بیوی کے

سپر دکنے پر آمادہ نہیں تو پورے ملک کی سربراہی اس کے ہاتھ دینے کی حماقت کیوں؟  
 آئین کے مصنفین تو ظاہر بجا پٹی خواہشات کے اور رسم زمانہ کی پیروی کر رہے تھے حسرت تو  
 ان علماء کرام اور دینی سیاسی جماعتوں پر ہے جو فریب میں آکر رسول ﷺ کے اس ارشاد مبارک کو بھی گول کر  
 گئیں کہ وہ قوم تباہ ہو گئی جس نے اپنی باگ ڈور عورت کے ہاتھ تھادی۔ اس ایک غیر اسلامی قدم یعنی عورت کی  
 سربراہی کی گنجائش پیدا کرنے سے خود ساختہ آئین کے وہ حصے جو سربراہی مملکت (The President) اور  
 وفاقی حکومت (The Federal Govt.) پر مشتمل ہیں سب غیر اسلامی قرار پاتے ہیں۔

## دوسرا ہان

اسلامی حکومت میں سربراہ کی حیثیت مشروط آئینی مطاع کی ہوتی ہے۔ سربراہ وقت کی اطاعت اسی  
 طرح لازم کہ جس طرح اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت۔ مطاع کو اگر دو یا زیادہ عہدوں میں تقسیم کر دیا جائے تو  
 ایسے عہدے دار اسی طرح باہم متصادم ہو جاتے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ اگر دو الٰہ ہوتے تو  
 کائنات کا نظام کبھی نہ چل سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اوپر دی گئی سورہ نساء کی آیت نمبر 34 میں مرد کو قوم بناتے وقت  
 ایک وجہ یہ دی گئی ہے کہ کسی بھی انتظامی یونٹ میں ایک کو افضل (سربراہ) بنانا بہر حال لازمی ہے۔ خود ساختہ  
 آئین میں دوسرا ہاں..... ایک سربراہی مملکت (صدر) اور دوسرا سربراہی حکومت (وزیر اعظم) کی پرویشن  
 اس قدر غیر اسلامی ہے کہ اس نے پورے آئین کو اسلام کے خلاف کھڑا کر دیا ہے۔ ہمارے ہاں آئے دن  
 صدر اور وزیر اعظم کی باہمی چپقلش نے تو تجربے سے بھی ثابت کر دیا ہے کہ مطاع کو منقسم نہیں ہونا چاہیے۔ یاد  
 رہے دور خلافت راشدہ کا اختتام ہوا ہی تو اس وقت جب ایک خلیفہ کی موجودگی میں دوسرے خلیفہ کی بیعت  
 ہونے لگی۔ خلافت وقت کا دوسرا ہاں میں بٹ جانا اسلامی تاریخ کا وہ عظیم حادثہ ہے کہ جس سے اتری ہوئی  
 گاڑی آج تک ہڑی پر نہیں چڑھ پائی۔ کس قدر پتے کی بات بتادی ہوئی ہے ہلائی برحق نے فرمایا:  
 ”جب دو خلیفہ سے بیعت کی جاوے تو جس سے آخر میں بیعت ہوئی ہو اس کو مار ڈالو۔“ (اس  
 لئے کہ اس کی خلافت پہلے خلیفہ کے ہوتے ہوئے باطل ہے)۔ (مسلم)  
 یوں خود ساختہ آئین کا وہ حصہ جو صدر و وزیر اعظم بلکہ پرنسپل گورنمنٹس، گورنروں، صوبوں اور

فیدریشن کے باہمی تعلقات وغیرہ پر پھیلا ہوا ہے تمام غیر اسلامی قرار پاتا ہے۔

## مجلس شوریٰ (The Parliment)

رسم زمانہ نے آئین کے مصنفوں کو مجلس شوریٰ کے ساتھ بریکٹ میں (The Parliment) لکھنے پر مجبور کیا ورنہ اسلامی شوریٰ کو پارلیمنٹ سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا کہ شرق کو مغرب سے۔ دونوں کے فرائض منہی ہی میں 180 درجے کا فرق ہے۔ مروجہ پارلیمنٹ ایک قانون ساز ادارہ ہے جس میں بندوں کی ہوئی قانون سازی (جو محض ارکان پارلیمنٹ کی خواہشات پر مبنی ہوتی ہے) کے مطابق کاروبار حکومت اور کاروبار زندگی چلتا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی شوریٰ تخلیفہ وقت جس کا حصہ ہوتا ہے کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ وہ قانون سازی نہیں کر سکتے قانون سازی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے۔ ”ان الحکم الا للہ“۔ شوریٰ کا اصل ہنگامہ اگر واحد فرض منہی کہا جائے تو مضائقہ نہیں ہر اس معاملہ میں قرآن و سنت کی روشنی میں اجتہاد کر کے تخلیفہ وقت کو مشورہ دینا ہوتا ہے کہ جس کے بارے میں تخلیفہ المسلمین کو براہ راست قرآن و سنت سے ہدایات نہ ملیں۔ اجتہاد کی اس پرویشن سے ہی قرآن و سنت وہ درجہ اختیار کرتے ہیں کہ جسے قرآن ہی میں ”ایوم اکملت لکم دینکم“ کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ سیکڑوں ایسے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں کہ جن کے متعلق براہ راست قرآن و سنت سے ہدایات نہیں ملتی۔ اسلام میں اجتہاد کی پرویشن ایسے ہی موقع کے لئے ہے۔

## دو ایوان

خود ساختہ آئین کا وافر حصہ دو ایوانوں یعنی قومی اسمبلی اور سینٹ کے لئے مختص ہے حالانکہ اسلام میں اس کی قطعاً گنجائش نہیں اس لئے کہ جس کیفیت و صورت حال کے لئے سیکولر دنیا میں یہ دو ایوانی پارلیمنٹ بنائی جاتی ہے وہ اسلام میں پیدا ہی نہیں ہوتی۔ رسم زمانہ کی نکالی میں ہمارے ہاں بھی قومی اسمبلی کا وجود تو مختلف صوبوں کی آبادی کے متناسب ارکان پر مشتمل ہے جب کہ سینٹ میں تمام چھوٹے بڑے صوبوں سے تعلق لئے گئے ارکان کی تعداد برابر ہے۔ ایسا اس لئے کیا گیا ہے کہ ارکان قومی اسمبلی کسی بڑے صوبے سے تعلق

رکھتے ہوئے اپنی اکثریت کی بناء پر کسی دوسرے صوبے کو نفع یا نقصان نہ پہنچا سکیں۔ اسلام میں فیصلے (نہ کہ قانون سازی) جب کرنے ہی قرآن و سنت کے مطابق ہیں تو علاقے زبان یا کسی اور بنیاد پر کسی کے نفع یا نقصان پہنچانے کا امکان ہی کہاں کہ دو ایوانوں کی ضرورت پڑے۔ اسلام میں تو یہ بھی ضروری نہیں کہ خلیفہ وقت ارکان شورشی کی اکثریت کی رائے پر عمل کرے۔ اگر خلیفہ المسلمین کو تمام ارکان شورشی کے مقابلہ میں صرف ایک رکن شورشی کی رائے قرآن و سنت کے قریب تر محسوس ہو تو وہ یہ نہیں دیکھے گا کہ یہ تو محض ایک رکن کی رائے ہے۔ ترجیح قرآن و سنت کو ہے نہ کہ اکثریت کی رائے کو۔ مانعیں زکوٰۃ کے بارے میں تو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے پوری شورشی کی رائے کو ٹھکرا دیا۔ وقت نے ثابت کیا کہ ان کا فیصلہ ہی قرآن و سنت سے قریب تر تھا۔

اسلام کی رو سے البتہ دو ایوان کا ہونا اس طور جائز بلکہ ترجیح کا حامل ہے کہ ایک ایوان مرد حضرات کے لئے مختص ہو تو دوسرا خواتین کے لئے اور ہر دو کی اہمیت و وقعت یکساں ہو۔ اس سے ایک تو مجموعہ مجلس جو شریعت کی صریح خلاف ورزی ہے کا انعقاد ختم ہو جائے گا اور دوسرے خواتین مکمل کر بہتر انداز میں اپنی رائے اور فیصلے کا اظہار کر پائیں گی۔ شورشی کی اصل روح یہی ہے۔

## اسلامی نظریاتی کونسل

73ء کے آئین میں مجلس شورشی کے علاوہ اسلامی نظریاتی کونسل کا وجود تو اسلام کے ساتھ ایک سنگین مذاق ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا اور جیسا کہ شورشی کے نام ہی سے عیاں ہے شورشی کا اصل کام اجتہاد کرتے ہوئے خلیفہ کو مشورہ دینا ہے۔ اجتہاد ظاہر ہے وہ کر سکتا ہے جس کا نہ صرف قرآن و سنت پر کلی عبور ہو بلکہ وہ عالمی امور سے بھی پوری طرح آگاہ ہو۔ اسی لئے تو عوامی نمائندوں کیلئے قرآنی معیار اہلیت میں ایک شرط ”علم“ کی ہے۔ کس قدر غیر اسلامی ہے 73ء کا آئین کہ ان پڑھ تک کو رکن شورشی ہونے کی اجازت دیتا ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ کسی کالج میں لیکچرر تو ان پڑھ کو تعینات کر دیا جائے اور پھر اس کی کوپرا کرنے کیلئے اہل افراد کی ایک علیحدہ ٹیم بنا کر خواہ مخواہ کالج کے بجٹ پر بوجھ ڈالا جائے۔ کیا یہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی 180 درجے مخالفت نہیں جس میں کہا گیا ہے کہ ”امانتیں (عہدے) اہل افراد کے سپرد کرو“ (نساء: 58)۔

## وفاقی شرعی عدالت

شرعی عدالت کی 73ء کے آئین میں پرویشن سے تو سو فیصد عیاں ہے کہ اس آئین کو بنایا ہی گیا اسلام کا مذاق اڑانے کیلئے ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وفاقی شرعی عدالت شرعی ہے تو کیا پاکستان میں کوئی غیر شرعی عدالت بھی مطلوب ہے؟ عدالت اور غیر شرعی چہ بولہجھی؟ انسان جب قانون سازی کرے گا تو ایسی قانون سازی کا تضادات کا مجموعہ ہونا لازمی ہے۔

## طریق قانون سازی

قانون سازی اور بندوں سے ”ان الحمد للہ“ کی کھلم کھلا خلاف ورزی تو ہے ہی بچارے رحمت کا ہاتھ کانپ رہا ہے اس طریق قانون سازی کو تحریر میں لاتے جو 73ء کے جمہوری آئین میں درج ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

قانون سازی یا متبادل قانون سازی کی تحریک خواہ عدالت کی طرف سے ہو، اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے یا کسی رکبی شورشی کی طرف سے، دو صورتوں سے دوچار ہوتی ہے۔ پہلی صورت تو یہ کہ حکومت وقت ایسی ترمیم یا قانون سازی کو دل سے قبول نہیں کرتی۔ ایسا ہو تو حیلے بہانے بیل کبھی منڈھے نہیں چڑھتی اس لئے کہ حکومت وقت کے پاس ملنے کے ان گنت طریقے ہوتے ہیں۔ تجربہ شاہد ہے وہ مالٹی ہی چلی جاتی ہے۔ اگر پارلیمنٹ میں معاملہ آئی جائے تو چونکہ پارلیمنٹ میں حکومت وقت کی اکثریت ہوتی ہے لہذا معاملہ وہی بن جاتا ہے کہ کب گوندھا جائے کب پکلا جائے اور کب کھانے کی نوبت آئے؟ یاد رہے 1973ء کے آئین کے کئی قوانین عدالتوں سے غیر شرعی قرار پائے اور ان کو تبدیل یا ترمیم کرنے کی سفارش کے باوجود آج تک ترمیم نہیں کر پائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ حکومت وقت بھی ترمیم یا نئی قانون سازی کے حق میں ہوتی ہے اور دل و جان سے ترمیم کرنا چاہتی ہے لیکن خود ساختہ آئین میں ترمیم کیلئے دو تہائی اکثریت کا ہونا لازمی ہے۔ یاد رہے کہ تاریخ پاکستان میں کم ہی ایسا ہوا ہے کہ حکومت وقت کو دو تہائی اکثریت حاصل ہو اور یہ دو تہائی اکثریت کا

میر نہ ہوا صدیوں پر بھی محیط ہو سکتا ہے۔ ایسے میں مظلوم بہ ترمیم کا کیا حشر ہوگا؟ یہی نہ کہ عدالتیں بھی حکومتِ وقت بھی حتیٰ کہ پوری قوم بے بس ہو گئی۔ ترمیم نہیں کر پائے گی خواہ عدالت میں آئین کے جس حصے کو بدلتا ہے وہ غیر شرعی قرار پا چکا ہو۔ اللہ تعالیٰ کل کو میدانِ حشر میں پوچھے گا کہ خود ایک دفعہ/شق کو غیر شرعی قرار دینے کے بعد تم اس کے ساتھ کیوں چپے رہے؟ ظاہر ہے جواب یہی ہوگا کہ ہمارے ہاتھ دو تہائی اکثریت نہ ہونے کی وجہ سے بندھے تھے۔ بتائیے اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ عذر کیا قابلِ قبول ہوگا؟ اللہ تو یہی کہے گا کہ تم کو کس حکیم نے کہا تھا کہ ہاتھ بندھنے والا کتا بچہ خود تیار کر کے اسے آئینیں مملکت قرار دے دو۔ میرے عطا کردہ ازلی وابدی آئین کو مجبور و مظلوم کر کے یہ خود ساختہ آئین بنانے کی تم نے جسارت و حماقت کی ہی تو کیوں؟ یہی تو وہ موقع ہوگا جب اپنی امت کی کبھی شکایت نہ کرنے والے نبی ﷺ پکارا تمہیں گے تو یوں:

”اے اللہ! میری قوم نے اس قرآن کو مجبور کئے رکھا“ (فرقان: 30)۔

بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرض کیجئے کہ حکومتِ وقت کو پارلیمنٹ میں دو تہائی اکثریت حاصل ہے اور وہ اس قابل ہے کہ مظلوم بہ ترمیم کر سکے۔ لیکن ”زلف کو سر ہونے تک“ مزید کئی مشکل مراحل سے گزرنا پڑتا ہے جن کا ذکر تک کرنا مناسب نہیں۔ بندے اور اللہ و رسول ﷺ کے احکامات کی منکوری دیں، طاغوت اور کیا ہوتا ہے؟



## نظام خلافت قائم ہو آج تو کیسے؟

ایک مسلمان ریفرنس کا پابند ہے من مرضی یا شتر بے مہار کی سی زندگی نہیں گزار سکتا۔ ریفرنس قرآن و سنت ہے اور بس۔ مسلمانی ہے ہی یہی کہ چھوٹے سے چھوٹا کام مثلاً پانی کا گھونٹ بھی پیا جائے تو مسنون طریقے سے پیا جائے۔ پیغمبر کو کتاب کے ساتھ بھیجی اس لئے جانا ہے کہ وہ احکامات الہی کی الہی تعبیر عملاً کر کے دکھا دے۔ بصورت دیگر تو کسی بھی حکم کی متعدد تعبیریں کی جانے اور بناویں اشتباہ میں پڑنے کا امکان ہے۔ ہم عصر حاضر کے مسلمان طے شدہ ترتیب و ترکیب کے مطابق صرف قرآنی احکامات کے پابندی نہیں، اسوہ رسول ﷺ کے بھی پابند ہیں۔

جب لازم ٹھہرا کہ ہم مسلمانوں نے کوئی بھی کام کرنا ہے تو مسنون طریقے سے کرنا ہے تو نظام خلافت قائم کرنے کیلئے بھی مسنون طریقے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار نہیں کر سکتے۔ غلط فہمی کی بنا پر کچھ لوگ یہ فرض کر بیٹھے ہیں کہ جیسے نظام خلافت قائم کرنے کا کوئی مسنون طریقہ ہے ہی نہیں۔ حیرانگی کی بات ہے کہ ایسے حضرات یہ نہ سوچ پائے کہ پانی پیتے کھانا کھاتے سونے جاگنے خریدنے بیچنے، کٹنے، سلجھانے وغیرہ غرضیکہ ہر کام کیلئے تو مسنون طریقہ ہے تو طریق قیام خلافت ہی کیا اتنا غیر سنجیدہ اور غیر اہم کام ہے کہ اس کا کوئی مسنون طریقہ نہیں۔ حالانکہ نظام خلافت یا بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ کی فی الارض حکومت قائم کرنے کا کام تو مقصدِ نبوت اور مقصدِ تخلیق آدم ہے۔ دورِ نبوت کے ایک طرف دورِ جہالت تو دوسری طرف دورِ خلافت۔ اسوہ رسول ﷺ کیا ٹھہرا ظاہر ہے کہ نظام خلافت کا قیام۔ پھر یہ بھی کہ جس دین کی تکمیل کا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ سے اعلان کر دیا وہ مکمل کیسے ہوا اگر قیام خلافت کے طریق کار سے عاری ہو؟ آئندہ صفحات میں پیش کی گئی گزارشات سے انشاء اللہ دو اور در چار کی طرح واضح ہو جائے گا کہ قرآن و سنت میں قیام خلافت کا مربوط منضبط اور دو ٹوک مسنون طریقہ موجود ہے۔

## حصولِ اقتدار لازمی

ہمارے ہاں ایک اور غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حصولِ اقتدار اور کارِ سیاست دنیا دارانہ کام ہے جس سے علماء کرام اور دانشورانِ امت کو بھتہ بھتہ کرنا چاہئے۔ یہ غلط سوچ دو برطوکیت میں اس لئے پیدا کی گئی کہ ملوک نہیں چاہتے تھے کہ ان کی من مانیوں میں قرآن و سنت کی پابندیاں حائل ہوں۔ اس کا حل انہوں نے یہ ڈھونڈا کہ دین حق کو سیاست اور مذہب کے دو علیحدہ علیحدہ دوائر میں تقسیم کر دیا۔ انہوں نے خود تو سیاست و اقتدار کی مسند سنبھال لی جبکہ دینی رجحانات رکھنے والے عناصر کو اہل مذہب قرار دے کر مدزموں اور دارالعلوم کی طرف دھکیل دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اہل سیاست سیکولر نظام کے قریب تر ہوتے چلے گئے جبکہ اہل مذہب درس و تدریس اور گفتی کی چند رسومات عبودیت میں منہمک ہو گئے۔ آج دین حق کا وجود زیرِ آسمان مفقود ہے۔ جس دین کو آج کے ہم مسلمان اختیار کئے ہوئے ہیں وہ اس دین سے یکسر مختلف ہے جو رسول ﷺ امت کے پروردگار کے گئے تھے۔ سپرد کردہ دین میں خلیفۃ المسلمین، اولوالامر، شورعی، امت وغیرہ کا وجود تھا ہمارے اختیار کردہ دین میں نہیں۔ لہذا مسلک بھی درجنوں اقوام کا روپ دھار چکی۔ یعنی ہمارا اختیار کردہ دین اس مردے کی مانند ہے جس میں بظاہر تمام اعضاء و جوارح تو موجود ہوتے ہیں نہیں ہوتی تو روح۔ سیاست و مذہب کی یہ تقسیم ہمارے لئے اسی طرح سودمند ہونے کی بجائے مضر ہو گئی ہے جس طرح پانی جیسا انتہائی سودمند مشروب آکسیجن اور بائیڈروجن میں منقسم ہو کر برعکس صفات کا حامل ہو جاتا ہے۔ پانی آگ کو بجھاتا ہے جبکہ آکسیجن دوسری چیزوں کو جلانے میں مددگار ہوتی ہے اور بائیڈروجن گیس خود جلتی ہے۔

حاصلین نظام خلافت صرف مقتدر ہی نہیں ہوتے بلکہ ایسے مقتدر جس کی نظیر کسی دوسرے نظام میں نہیں ملتی۔ اسلام امامِ سیاست (امامِ کبریٰ) اور امامِ صلوة (امامِ صغریٰ) کو اس خلیفۃ المسلمین میں مجتمع کرتا ہے جس کی اولوالامر میں مرکزی حیثیت ہوتے ہوئے، مشروطی اسی طرح طاعت لازم جیسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت۔ خلیفۃ المسلمین پوری اسلامی دنیا کا حکمران بھی ہوتا ہے تو دارالخلافت کی مرکزی مسجد کا خطیب و امام بھی۔ اسلام غلبہ دین حق کو لازم قرار دیتا ہے لیکن یہ غلبہ اس وقت تک حاصل ہی نہیں ہوتا جب تک کہ پہلے خلیفہ و خلافت کا وجود نہ ہو یا نظام خلافت کی طاقت میسر نہ ہو۔ خلافت نام ہے اللہ

کی حکومت کا اور ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کی حکومت صرف مقتدر ہی نہیں ایسی مقتدر ہوتی ہے جس کے پائے کی کوئی دوسری طاقت نہیں ہوتی۔ ایسا ہی ہو تو حق بحق دار رسید کی صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول ﷺ نے اپنے دور نبوت کا ایک ایک لحو نظام خلافت قائم کرنے میں لگایا۔ سلسلہ نبوت ختم ہونے پر یہ کام اب مدج مسلمہ کے فرائض میں اولیں حیثیت کا حامل ہے۔ نظام خلافت قائم کرنے کا مطلب اصل میں اللہ تعالیٰ کے قدر کو قائم کرنا ہے کسی انسان کا اپنا ذاتی اقتدار نہیں۔

### حصول اقتدار کا انوکھا طریق کار

دنیا میں انقلاب لانے کے چار طریقے معروف ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک طاقتور گروہ کسی کمزور گروہ پر قابو پا کر اقتدار حاصل کر لے۔ کسی بیرونی حملہ آور کا اقتدار پر قابض ہو جانا اسی طریقے کی مثال ہے۔ فوج کا سونپیں حکومت کو چلتا کر کے خود قابض ہو جانا بھی اسی کی مثال ہے۔ دوسرا طریقہ بذریعہ سازش اقتدار حاصل کرنے کا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہندوستان پر اور اسرائیل کا فلسطین پر قابض ہو جانا اسی طریقے کی مثالیں ہیں۔ تیسرا طریقہ بذریعہ سڑیٹ پاوریاعوامی بغاوت اقتدار حاصل کرنے کا ہے۔ انقلاب فرانس اور انقلاب روس اسی کی مثالیں ہیں۔ چوتھا طریقہ بذریعہ انتخابات اقتدار حاصل کرنے کا ہے۔ یاد رہے انبیاء نے ان چاروں طریقوں میں سے کسی کو بھی اختیار نہ کیا، انہوں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کو بروئے کار لا کر انقلاب لانے کا ہے۔ آئیے دیکھیں کس قدر یکساں و منفرد طریق کار ہے یہ!

### تین باتوں کا ادراک ضروری

تفصیلات بعد میں پہلے تین بنیادی باتیں نوٹ کر لیں۔ رسول ﷺ کے لائے ہوئے انقلاب کو کما حقہ نہیں سمجھا جاسکتا جب تک ان تین باتوں کا آغاز ہی میں ادراک نہ کر لیا جائے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہجرت مدینہ پر یہ انقلاب وقوع پذیر ہو چکا تھا۔ اس کے بعد مدنی دور نبوت اور دور خلافت راشدہ میں جو جدوجہد ہوئی اور حقیقتاً ہجر پور ہوئی وہ استحکام و وسعت انقلاب اور غلبہ دوسری حق کے لئے تھی۔ اللہ کے رسول ﷺ مکہ سے مدینہ تشریف لے گئے تو ایک پناہ گزین کی حیثیت میں نہیں بلکہ نگران وارد ہوئے۔ مدینہ کی نوزائیدہ و نوخیز اسلامی ریاست خواہ کتنی ہی چھوٹی تھی ایک خود مختار ریاست تھی اور رسول ﷺ اس کے فرمانروا تھے۔ دوسری

بات جس کا ادراک بہت ضروری ہے یہ ہے کہ نظام خلافت کا انعقاد کوئی جزوی نہیں کلی تبدیلی ہے۔ جزوی اصلاح (Patch Work) کی قطعاً اجازت نہیں۔ ”ادخلوا فی الاسلام کافۃ“ سے کم تر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شاخ تراشی وغیرہ سے کام نہیں جتنا شجر خبیثہ کو جڑ سے اکھاڑ کر شجر طیبہ کو نئے سرے سے کاشت کرنا ہوتا ہے۔ تیسری بات جو ذہن میں اُتر رہی ہوئی چاہئے یہ ہے کہ مجموعی طور پر یہ انقلاب دو ادوار میں منقسم ہے دورِ قیام خلافت اور دورِ دوام خلافت۔ دورِ قیام خلافت وہ دور ہے جس کے اختتام پر یہ عظیم انقلاب قیام پذیر ہوگا اور دورِ دوام خلافت وہ دور ہے جس میں اس لئے ہوئے انقلاب کو استحکام و وسعت نصیب ہوئی۔ بالفاظِ دیگر کئی دورِ نبوت، قیام خلافت کا دور ہے تو مدنی دورِ نبوت بشمول دورِ خلافت راشدہ دوام خلافت کا دور ہے۔ قیام خلافت اور دوام خلافت کے ان ادوار کو اس لئے ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ہر دور میں اپنائی گئی حکمتِ عملی اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ آج کی دنیا میں اسلامی انقلاب برپا کرنے والے لوگ کر لیں کہ انہیں دوام خلافت سے پہلے قیام خلافت کا مرحلہ درپیش ہے۔ ان دونوں ادوار میں اپنائی گئی حکمتِ عملیوں کو اگر باہم گڈمڈ کر دیا جائے تو اسلامی انقلاب کا کوئی سوال نہیں۔ قیام خلافت اور دوام خلافت میں اپنائے گئے مسنون طریق کار کا ذکر ہم یہاں پر علیحدہ علیحدہ کرتے ہیں۔

## قیام خلافت کا مسنون طریق کار

### قیام خلافت اور دوام خلافت کی جدوجہد کا فرق

قیام خلافت اور دوام خلافت میں اپنائے گئے طریق کار میں کم از کم دو نمایاں فرق ایسے ہیں جن کا تذکرہ ضروری ہے۔

#### ۱۔ دعوت بلا تشدد

پہلے نمایاں فرق یہ ہے کہ کئی دو رتبہ تسلیم اور قیام خلافت میں جہاد بالسیف نہیں ہوا۔ کلمہ کا استعمال تو درکنار کسی مسلمان نے کبھی کسی دشمن کو پھڑکنے نہیں مارا بلکہ گالی تک نہیں دی۔ قوت بازو کا استعمال قطعاً ممنوع ٹھہرا۔ مسلمانوں نے ماضی و رکھائی اور حقیقتاً خوب کھائی لیکن خود کسی کو نہیں مارا۔ کینگی کا مقابلہ شرافت سے کیا اور بڑی کا جواب نیکی بلکہ بہتر نیکی سے دیا۔ دو قیام خلافت میں اہم کا کوئی سوال نہیں۔

خفیہ دعوت کے دور میں ایک دفعہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے ہاتھوں کسی حملہ آور دشمن کے سر میں معمولی سی چوٹ آگئی تو نبی رحمت ﷺ نے اسے ساتھیوں کی تربیت میں کمی گردانا اور بلا تاخیر دار ارقم کو مسلمانوں کے لئے اجتماع تربیت کا مرکز بنایا۔ دو دعوت میں ہی ایک دفعہ ایک شخص رسول ﷺ کی موجودگی میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کو بے تحاشا گالیاں دینے لگا۔ صدیق اکبرؓ ناموشی سے اس کی گالیاں سنتے رہے اور نبی رحمت ﷺ بھی اس موقع پر مسکراتے رہے۔ آخر کار جب صدیق اکبرؓ کا بیانا نہ صبر لہریز ہو گیا تو انہوں نے بھی جواباً تدریجاً بات کہہ دی۔ رسول ﷺ کو اچھا نہ لگا (لگتا بھی کیسے یہ تو قیام خلافت کا دور تھا) اور وہاں سے تشریف لے گئے۔ حضرت ابو بکرؓ بھی پیچھے ہوئے اور راستے میں ہی جا کر عرض کی کہ یہ کیا ماجرا ہے کہ جب تک وہ مجھے گالیاں دیتا رہا آپ ﷺ مسکراتے رہے اور جب میں نے جواب دیا تو آپ ﷺ مارا رخ ہو گئے؟ فرمایا کہ جب تک تم ناموش تھے ایک فرشتہ تمہاری طرف سے اس کا جواب دیتا رہا مگر جب تم بولے تو فرشتے کی جگہ شیطان آگیا میں شیطان کے ساتھ تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

یاد رہے وہ جہاد جو دور کئی میں ہوا محض بالقلب اور باللسان تھا بالحق وہاں ہی اس وقت جب مدینہ

میں ایک اسلامی ریاست غیر اسلامی ریاستوں کے مقابلہ میں معرض وجود میں آگئی۔

## ۲۔ انقلاب بلا انتخاب

جیسا کہ ہم نے اوپر انقلاب بذریعہ انتخابات غیر مستنون قرار دیا ہے دور قیام خلافت اور دور دوام خلافت کا دوسرا بڑا فرق یہ ہے کہ دور قیام خلافت میں انتخابات کا کوئی سوال نہیں۔ یہ امر بعض لوگوں کے ذہن میں الجھاؤ پیدا کرتا ہے اس لئے کہ وہ سمجھتے بیٹھے ہیں کہ اسلام میں انتخابات تو ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام میں انتخابات ہیں لیکن یہ انتخابات اسلامی نظام کو لانے کیلئے نہیں، اسلامی نظام لانے کے بعد اسے چلانے کے لئے ہیں۔ مکی دور نبوت میں اگر انتخابات کے ذریعہ تبدیلی لائی جاتی تو انقلاب کبھی واقع نہ ہوتا۔ اسی طرح اگر دور خلافت راشدہ یعنی دور دوام خلافت میں انتخابات نہ ہوتے تو بنی بکر جاتی۔ ملکیت اصل میں داخل ہوئی اس وقت جب انتخابات نہ ہوئے۔

یہ دونوں بڑے فرق تو دور قیام خلافت اور دوام خلافت میں حد فاصل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب ہم دو ایسے پہلوؤں کا ذکر کرتے ہیں جن پر عمل تو ہر دو ادوار میں لازمی ہے لیکن دور قیام خلافت میں ان کی اہمیت قدرے زیادہ ہے۔ بالفاظ دیگر ان پر عمل کئے بغیر بھی اسلامی انقلاب نہیں آسکتا۔

### ۱۔ دعوت الی اللہ ہی نہیں، طاغوت سے اجتناب بھی

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا دور قیام خلافت میں جب طاقت کا استعمال ممنوع ہے تو ایک لحاظ سے انقلاب کا وقوع محض دعوت و تبلیغ ہی سے ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے اگر کوئی یہ سمجھ بیٹھے کہ وعظ و نصیحت کرتے جاؤ اور ایک دن انقلاب برپا ہو جائے گا تو وہ بھول کا ہی نہیں ”بڑی بھول“ کا شکار ہے۔ حقیقت میں دعوت الی اللہ سے بھی پہلے اجتناب طاغوت لازم ہے۔ انقلاب کا یہ وہی طریق و فلسفہ ہے جو ”لا الہ الا اللہ“ میں صد فی صد مضمر ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ جب کہتے ”لا الہ الا اللہ“ تو حقیقت میں پورا فلسفہ اسلامی انقلاب ان کے سامنے رکھ دیتے۔ ہر نو مسلم کو یہ انقلابی کلمہ پڑھایا ہی اس لئے جاتا ہے کہ جو تبدیلی اسلام معاشرے میں برپا کرنا چاہتا ہے وہی ہر فرد میں۔ خلافت معاشرے میں بعد میں قائم ہوتی ہے ہر ایمان لانے والے میں پہلے۔ چار الفاظ کے اس کلمے میں ”لا اللہ“ بعد میں چار ”لا الہ“ پہلے۔ اجتناب طاغوت پہلے ہے اور دعوت

ابلی اللہ بعد میں۔ نظام باطل سے مکمل بائیکاٹ پہلے ہے تو نظام حق کی دعوت بعد میں۔ دعوت ابلی اللہ اور اجتناب طاغوت کا اس قدر چوٹی دامن کا ساتھ ہے کہ قرآن میں اسے بار بار مختلف اسلوب میں بیان کیا گیا۔ ایک جگہ پر آیا:

”ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا اور اس کے ذریعہ سب کو خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے اجتناب کرو“ (النحل: 36)۔

ایسی آیات کی رو سے لازمی ٹھہرا کہ اسلامی انقلاب لانے کیلئے دعوت و اصلاح اور اجتناب و برأت کا کام ساتھ ساتھ ہو۔ ضروری ہے کہ داعیان حق اس نظام باطل کا مکمل حد تک خود حصہ نہ بنیں جسے وہ نظام بدل وقت میں بدلنا چاہتے ہیں۔ مکمل حد تک اس لئے کہ رسول ﷺ خود ایک عرصہ تک اسی خانہ کعبہ میں نماز ادا کرتے رہے جس میں کہ 360 بت برائے تھے۔ اسوۂ رسول ﷺ پر ایک سرسری نگاہ بھی ڈالی جائے تو یہ حقیقت دو اور دو چار کی طرح واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ نبی کا نکاح ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں نے اس نظام سے کہ جسے وہ بدلنا چاہتے تھے باعرا کرنا رکھشی کی۔ اجتناب کی تاریخی مثال قریش سے ہے کہ سردارانِ قریش نے نبی رحمت ﷺ کو چند رعایتوں کے حصول کی خاطر اپنا بادشاہ بنانے کی پیشکش کی لیکن آپ ﷺ نے یہ کہہ کر اس پیشکش کو ٹھکرا دیا کہ:

”اگر سورج میرے دائیں ہاتھ اور چاند میرے بائیں ہاتھ پر بھی رکھ دیا جائے تو میں یہ کام نہیں چھوڑوں گا۔ یہاں تک کہ یا تو اللہ اسے کامیاب فرمادے یا میں اس راہ میں ہلاک ہو جاؤں۔“

اس ٹھکرانے کی وجہ یہی تھی کہ اسلام کو یہ تک قبول نہیں کہ حق کی اگر نواہے باتیں مان لی جائیں تو باطل کی کم از کم ایک بات مان لی جائے۔ ظاہر ہے مفاہمت و مصالحت کی صورت میں ایسا ہونا مگریر تھا۔ یہی بڑی وجہ تھی کہ رسول ﷺ نے جب ہجرت کی تو حبشہ کی بجائے مدینہ جانے کو ترجیح دی حالانکہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی اس وقت مسلمان ہو چکے تھے۔ ایسا کرنے میں یعنی حبشہ کی طرف ہجرت کرنے میں جو رکاوٹ تھی وہ یہی تھی کہ نظام حق اور نظام باطل کا ایک قدم بھی ساتھ چلنا ممکن نہ تھا۔ نبوت و بادشاہت میں کیا جوڑ؟

مشرکین مکہ نے لاکھ کوشش کی کہ اللہ کے رسول ان کے ساتھ ”کچھ دو کچھ لو“ کا معاملہ کر لیں۔

قرآن میں آیا ہے۔

”پس اے نبی ﷺ جنھوں نے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ۔ وہ چاہتے ہیں کہ کچھ تم مداخلت کرو تو وہ مداخلت کریں“ (القلم: 8-9)۔

آخر جب اللہ کے رسول ﷺ نے نظام باطل کے ساتھ چلنے سے یک قلم انکار کر ڈالا تو قریش مکہ کم از کم مطالبہ (Minimum Demand) لے کر آ گئے۔ ابو طالب کی وساطت سے انہوں نے چاہا کہ ”آپ ﷺ کا بھتیجا ہمیں ہمارے دین پر چھوڑ دے اور ہم اسے اس کے دین پر چھوڑ دیتے ہیں“ وہ جس معبود کی عبادت کرنا چاہے خوشی کرے ہمیں اس سے کوئی تعرض نہیں مگر وہ ہمارے معبودوں کی مذمت نہ کرے اور یہ کوشش نہ کرنا پھرے کہ ہم اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں“ رسول ﷺ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور قریش کے سرداروں سے فرمایا ”آپ لوگ یہ سورت دیکھ رہے ہیں؟ انہوں نے کہا ہاں“ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس طرح یہ سورت آپ لوگوں سے اپنی روشنی روک لینے پر تیار نہیں اسی طرح میں بھی اس کام کو چھوڑ دینے پر تیار نہیں ہوں۔“ یاد رہے ہجرت حقیقت میں مروجہ باطل نظام سے بایکٹ کی آخری اور حتمی صورت تھی۔ ان حقائق سے نتیجہ جو نکلا تو یہ کہ اسلامی انقلاب نہ انتخاب (Ballot) سے آتا ہے نہ جہاد بالسیف (Bullet) سے۔ آتا ہے تو محض دعوت الی الخیر اور ارجحیت بالظاہر سے۔

## ۲۔ عداوت و مخالفت

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک آدمی کی ایک عادت کو بدلنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ پھر ایک معاشرہ اور معاشرہ بھی وہ جو ہم عصر دنیا میں غلی ترین سطح پر ہو کی ہیئت و ترکیب کو کلیہً بدل دینا تو لاکھ گنا مشکل ہوتا ہے۔ جسے جمائے نظام کب گوارا کرتے ہیں کہ کوئی جب چاہے انہیں ادھیڑ بکھر کر رکھ دے۔ بڑا جان جو کھوں کا کام تھا جو انبیاء کو درپیش رہا ہے۔ سب سے بڑی مشکل جو حائل رہی ہے وہ یہ کہ حاکمین نظام باطل سے نظام حق سمجھ کر اپنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ وہ نظام جو انہیں آبا و اجداد سے ملا ہے کس طور ناقص ہے۔ ایسی ہی صورت حال سے رسول ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو واسطہ پڑا۔ جتنے بھی شرکین کے ہونے ابو طالب کے پاس آئے وہ انہیں زبان حال سے پکار پکار کر کہتے تھے کہ وہ کیسے اس



شخص کو برداشت کریں جو ہمارے معبودوں کی برائی کرتا ہے ہمارے دین میں عیب نکالتا ہے ہماری جماعت میں بھوت ڈالتا ہے ہماری عقلوں کو حماقت قرار دیتا ہے اور ہمارے باپ دادا کو گمراہ ٹھہراتا ہے؟

بگڑے اور بھرے ہوئے غار و شرکین سے نکلی کر وہاں بھی کوئی آسان کام نہ تھا لیکن انتہائی کٹھن کام تو ان سے بڑی کاچھڑا تھا۔ معاملہ محض ایک اللہ کو مان لینے کا ہوتا تو شاید وہاں لیتے کیونکہ پہلے ہی کسی حد تک وہ اسے مانتے تھے لیکن یہ ان کو قطعاً گوارا نہ تھا کہ وہ ان بتوں کو توڑ دیں جنہیں وہ خداؤں کی حیثیت دینے بیٹھے تھے۔ شرکین کے سینوں سے شرک کا پودا کاٹ کر تو حید کا پودا لگایا خود مشکلات کو دعوت دینا تھا۔ پھر بڑے بڑے تیرتھوں اور مزاروں کے سر پرستوں کو کب گوارا تھا کہ کوئی ان کی گدیوں اور سجادہ نشینوں کو چیلنج کرے۔ سردارانِ قریش سوچا تک نہ سکتے تھے کہ کوئی انہیں ان کی سرداریوں، قبیلہ پرستیوں اور شاہ زوریوں سے دست بردار کر دے۔ پھر ان کے لئے اللہ کی توحید کو تو ماننا مشکل تھا ہی اس سے بہت زیادہ مشکل اپنے ہی شہر اور محلے کے ایک شخص کی رسالت کو ماننا تھا۔ قرآن ان کی نفسیات کو یوں بیان کرتا ہے:

”اور یہ ظالم آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ یہ شخص آخر تم جیسا ہی ایک بشر تو ہے۔ پھر کیا تم آنکھوں دیکھتے جادو کے پھندے میں پھنس جاؤ گے؟“ (الانبیاء: 3)۔

”کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص تھا جس پر ذکر نازل کیا گیا؟“ (ص: 8)۔

پھر من مانیوں، ثبوت رانیوں اور مادر پدر آزادیوں کے ولدا وہ شرکین کو یہ بھی کب گوارا تھا کہ وہ قرآن جیسے ضابطے میں کسے جائیں۔ ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی جب انہیں خبر دی گئی کہ ایک ان دیکھی طاقت ہر لمحہ ہر فرد کے ساتھ ہے۔ آخرت پر ایمان لانا، حشر و نشر، جزا اور سزا اور جنت و دوزخ کا تصور انہیں کسی طور قبول نہ تھا۔ ایسا عقیدہ تو ان کی سرشت و خصلت پر شدید وار تھا۔ انہیں قطعاً گوارا نہ تھا کہ وہ کسی ایسے ضابطے کو مان لیں جو ان کے ہاتھ باندھ کر رکھ دے۔ یہی وجہ تھی کہ رسول ﷺ کے خلاف جتنے جھکندے ان کے پاس تھے ان میں سے مؤثر ترین حشر و نشر اور جزا اور سزا کا اسحوا، کرنا تھا۔ چنانچہ وہ کہتے:

”ہم بتائیں تمہیں ایسا شخص کہ جو خبر دیتا ہے کہ جب تمہارے جسم کا ذرہ ذرہ منتشر ہو چکا ہوگا تو اس وقت تم نئے سرے سے پیدا کر دیئے جاؤ گے۔“ علوم یہ شخص اللہ کے کام پر جھوٹ گھڑتا ہے یا اسے جنون لاحق

ہو گیا ہے“ (سبا: 7-8)۔

ایک اور مشکل جس کا شرکیہوں کو سامنا تھا یہ تھی کہ ان کے اپنے بھائی، بیٹے، بیٹیاں اور رشتے دار گھریاں اور ہر رشتہ تیار کر ایک ایک دودو کر کے بدرجہ مدعیان انقلاب کے کھپ میں جا رہے تھے۔ عجب اور متحیر کن صورت حال پیدا ہو چکی تھی کہ ان کے اپنے جگر کے نکلے ان سے برسر پیکار ہو رہے تھے۔ زیرِ فلک تو جیسے شرکیہ کی شامت آگئی وہ کیسے برداشت کرتے کہ کوئی اٹھے اور یوں ان کے مفادات کا قلع قمع کر دے۔ چنانچہ ہر مفاد پرست اسلامی انقلاب کے راستہ میں بھاری پتھر بن گیا۔ مذہبی پیشواؤں اور پجاریوں کو گدیوں کی سرداروں کو اپنی سرداریوں کی سودخواروں اور ساہوکاروں کو اپنی ساہوکاری کی نسل پرستوں کو اپنی نسل پرستی کی رسوم پرستوں کو رسوم پرستی کی بت پرستوں کو بت پرستی کی اجداد پرستوں کو اپنی اجداد پرستی کی غرضیکہ ہر مفاد پرست کو اپنے مفاد کی قربانی ہو گئی۔ نیندیں حرام ہو گئیں دن میں مارے نظر آنے لگے۔ وہ جو آپس میں لڑا کرتے تھے اس نئی تحریک کی مخالفت میں سب متحد ہو کر آہنی دیوار بن گئے۔ ظاہر ہے مخالفت میں جس قدر شدت تھی مخالفت کا مقابلہ کرنے والوں میں اتنی ہی ہلکداس سے بڑھ کر برداشت و استعداد کی ضرورت تھی۔

مقابلہ میں کون تھے؟ رسول ﷺ کے علاوہ گنتی کے چند ہاتھ بندھے نفوس قدیہ جنہیں کسی کے خلاف ہاتھ اٹھانا تو درکنار سخت لہجے میں جواب دینے کی اجازت نہ تھی۔ پھر اسلامی تحریک میں شامل ہونے والے اولیٰ افراد میں سے اکثر و بیشتر یا تو غلام لونڈیاں اور موالیٰ تھے اور یا پھر خانوادہ قریش کے نوخیز چشم و چراغ۔ دونوں طرح کے یہ طبقات خود مختار نہیں کسی نہ کسی طور سر پرستوں کے محتاج تھے۔ ان سر پرستوں نے اپنے زیر دستوں کو اپنی سرپرستی سے کھسکتے دیکھا تو کھلا اٹھے۔ مظالم ڈھائے تو اتنے کو ظلم کرنے والے کبھی کبھار خود دم ہوتے۔ حضرت بلالؓ حضرت خبابؓ حضرت عمارؓ اور ان کے والدین وغیرہ کی داستان الم رتی دنیا تک کے کفر کو شرماتی رہے گی۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ حضرت خالد بن سعیدؓ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسے جلیل القدر صحابہ گویا بار بیٹا گیا۔ اپنے گھریاں اور گلی گلوں کو آسانی سے کون چھوڑتا ہے؟ لیکن اس دور میں تو مسلمانوں کو دودنہ ہجرت کر کے حبشہ جانا پڑا۔

خود رسول ﷺ پر کوزا پھینکا جاتا۔ ان کے راستے میں کانٹے بچھائے جاتے۔ سجدہ میں جاتے تو ان

پر گھنٹی اور جانوروں کی اونچھری ڈال دی جاتی۔ گھٹے میں کپڑا ڈال کر یوں مروڑا جاتا کہ آنکھیں نکل آتیں۔ طائف کے بازاروں میں انہیں لبو لبان کیا گیا، مسلمانوں کا مقاطعہ کر کے دو چار دس دن نہیں مسلسل تین سال انہیں شعب ابی طالب میں محصور کیا گیا۔ اس پر بھی جب مخالفین کو کامیابی نہ ہوئی تو چھپوڑی اور ذلیل حرکتوں پر اتر آئے۔ حضرت زینبؓ کو طلاق دلوانے کی کوشش کی۔ آپؓ کے صاحبزادے کی وفات پر اظہارِ مسرت کیا۔ رسولؐ کی دو بیٹیوں کو ابولہب کے دو بیٹوں سے طلاق دلوا دی۔

جب یوں کرتے بھی بات بنتی نظر نہ آئی تو تحریکِ اسلامی کے خلاف بحرِ پورِ جھوٹ کی مہم شروع کر دی۔ ہر اس قبیلے کے پاس جاتے جہاں نبیؐ کا نکتہؓ بغرضِ دعوت و تبلیغ پہنچنے بیٹھا دینے کے لئے کہ یہ ہم میں سے اچھا بھلا آدمی تھا لیکن (نعوذ باللہ) اب اس کا دماغ چل گیا ہے۔ قرآن کی آواز سنتے ہی شور مچاتے۔ قرآن کو اٹھائے پہناتے۔ نبیؐ کو دہنی زبان میں کچھ کچھ کہہ جاتے۔ صبح ایمان لاتے شام کو کفر جاتے، اللہ کے رسولؐ کو ساحر و مجنون قرار دیتے۔ جب کسی طور ڈال گئی نظر نہ آئی تو داعی حقؐ کو ہی شتم کرنے پر تل گئے تاکہ نہ رہے بانس نہ بیکہ بانسری۔ غرضیکہ انہوں نے کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جس سے کہ اسلامی انقلاب کا راستہ رک سکتا تھا۔ زیرِ فلک اسلام کی مخالفت میں جو کچھ ان کے بس میں تھا کر گزرے۔

### نصرتِ ایزدی حاصل ہوئی تو نویدِ انقلاب

اسلامی انقلاب کے دشمنوں کو گمان تھا کہ شاید وہ انضباطی کاروائیوں اور تشددانہ ہتھکنڈوں سے انقلابِ نبویؐ کا راستہ روک لیں گے۔ ان پگلوں کو کیا خبر کہ اسلامی انقلاب کا راستہ ازل سے ہے ہی نہیں۔ ”زلزلوا، موتی نصر اللہ“ کے مراحل کے بغیر وہ مرحلہ آتا ہی نہیں جسے قرآن ”الا ان نصر اللہ قریب“ کا نام دیتا ہے۔

ایک طرف مخالفین نے اپنی تمام توانائیاں ذرائع اور وسائل اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں صرف کر دیں تو دوسری طرف مسلمانوں کی جانثرو شیاں اور قربانیاں رنگ لائیں۔ معیہ کی شہادتِ بلاؤ و خباب گودی گئیں، حبشہ کی طرف ہجرتیں محبِ ابی طالب کی بھوک و تنگ بس ایک ہی غرض کیلئے تھیں کہ

کسی طرح نصرتِ امیز دی حاصل کی جائے۔ طائف میں خود بعد از بزرگ توئی علیہ السلام کا خون بہا تو ہوا کا رخ ہی نہیں مارخ کا رخ تو اسی وقت بدل گیا۔ رہی کسی کسر جہتِ مدینہ نے پوری کر دی۔ جب اللہ کے بندے اس لئے گھبراہٹ سے محروم کر دیئے گئے کہ وہ کہتے تھے ”اللہ ہمارا رب ہے“ تو نصرتِ امیز دی نہ رک سکی۔ بارش کی طرح چمچ چم برسی۔ جہتِ مدینہ بظاہر تو بزدل دوز واقعہ لیکن حقیقتاً اسلامی انقلاب کی نوید تھا۔ انقلاب آیا اور بیا رنگِ دہل آیا۔

یعنی قرآن مجید خبر دیتا ہے کہ کم از کم دو طریقے ایسے ہیں کہ جنہیں اختیار کر نیوالوں کو اللہ تعالیٰ اپنی نصرت سے نوازنا ہے۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ کچھ اللہ کے بندے اس قدر تن من و جہن اللہ کی راہ میں لگا دیں کہ ”جہادِ واقعی اللہ حق جہاد“ کی شرط پوری ہو جائے۔ ایسا کرتے ہوئے ان کے وسائل ختم ہونے کو ہوں لیکن منزل ابھی کچھ فاصلے پر ہو تو باقی سفر میں اللہ کی نصرت شامل حال ہو جاتی ہے۔ باقائے دیگر پہل بہر حال بندوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ نصرتِ امیز دی جواب کے طور پر آتی ہے۔ قرآن میں آیا:

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا“ (محمد: 7)۔

نصرتِ امیز دی حاصل کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اسلام کی طرف دعوت دینے والے کسی پر کسی قسم کی زیادتی نہ کریں بل ان پر زیادتی ہو تو صبر کریں یعنی زیادتی کا جواب بھی زیادتی سے نہ دیں۔ اس طور پر ظاہر ہے وہ مظلومیت کے شکار قرار پاتے ہیں۔ مظلوم کی آہ بے اثر نہیں جاتی۔ کئی دور نبوت میں چند نفوس قدسیہ جب ظلم کا شکار ہوئے حتیٰ کہ اپنا گھریا رچھوڑ کر مدینہ کو چل دیئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں قتال کی اجازت دیتے ہوئے اس مدد کا ذکر یوں فرمایا:

”اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی تھی کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے“ (حج: 39)۔

دعائے ظلیل کی بدولت مکہ غیر امن تھا۔ اللہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی حرمت پر حرف آئے قیامِ خلافت کا دور..... بغیر اتمام و تشدد کا دور تو یہیں مکمل کیا۔ دوامِ خلافت کا دور..... اتمام و قتال کے دور میں سردارانِ قریش کو مکہ کی سرزمین سے نکالا تو اس طرح کہ پھر انہیں واپس جانا نصیب نہ ہوا۔ اسلامی انقلاب کا جو

راستہ اختیار کیا گیا اسے کامیاب ہوا ہی تھا کیونکہ وہ رب کائنات کا وضع کردہ تھا۔ کوئی وجہ نہیں کہ آج اسلامی انقلاب وقوع پذیر نہ ہو بشرطیکہ وہی مسنون طریقہ اختیار کیا جائے۔

جس طرح آج ہمیں ملکی نظام باطل کے علاوہ امریکہ جیسی سپر طاقتوں کی مزاہمت کا سامنا بھی ہے تاریخ انسانی کے مختلف ادوار میں متسلحین کو ایسی جاہر و ظاہر طاقتوں سے پالا پڑتا رہا ہے۔ خود نبی کائنات ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو دو ربوبت میں فارس و روم جیسی بڑی بڑی طاقتوں کا سامنا تھا۔ ظاہر ہے ایسی مہیب طاقتوں پر غلبہ بھی ممکن ہے کہ مقابلے میں ان سے بھی عظیم تر قوت ہو۔ یہ خلا، اللہ تعالیٰ کی مدد سے ہی پر ہو سکتا ہے اور یہی حکمت مضر ہے اللہ تعالیٰ کی نصرت حاصل کر کے انقلاب لانے میں۔ مکی دور ربوبت اسی مدد کے حصول کی جدوجہد کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ جب مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل ہو گئی تو سارا مسئلہ ہی حل ہو گیا۔ آج بھی بہت سے مصلحت اندیش ڈراتے ہیں کہ اندرونی و بیرونی مہیب طاقتوں سے ٹکرانا اپنے آپ کو پاش پاش کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ ایسے ہی مواقع پر مسلمانوں کو جو راستہ اختیار کرنے کیلئے کہا گیا ہے تو یہ ”اور ہرگز نہ دو کفار و منافقین سے کوئی پروا نہ کرو ان کی اذیت رسائی کی اور بھروسہ کرو اللہ پر اللہ ہی اس کیلئے کافی ہے کہ آدمی اپنے معاملات اس کے سپرد کر دے“ (احزاب: 48)۔

یعنی اللہ تعالیٰ کا فرمانا یہ کہ کوئی سپر طاقت زیرِ آسمان ہے تو ہوا کرے۔ اس کے پاس بڑی فوج، دور مار میزائل، کمپیوٹر کا دفاعی نظام اور ایٹم بم وغیرہ سب لیکن دنیا کے لوگوں کو تمہیں کیا علوم کہ جب کوئی اپنے رب کو اپنا مددگار بنا لے تو مخالفانہ نظام ویسے ہی مفلوج و معطل ہو جاتا ہے۔ یقین نہ آئے تو نمرود سے نعرعون سے بلکہ دور کی کیا بات شریکین مکہ ہی سے پوچھ لو کس طرح مفلوج و مغلوب ہوئے ان کے بڑے بڑے مہیب نظام۔ ہجرت کی رات رسول ﷺ خوفناک محاصرین کا محاصرہ تو ذکر نکل جاتے ہیں خون کے پیاسوں کی تمام تیاریاں اور عیاریاں دھری کی دھری رہ گئیں۔ قرآن خود گواہی دیتا ہے تو اس طرح:

”وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب کہ منکر۔ بنی قریظہ تیرے خلاف تہہ بھری کر رہے تھے کہ تجھے قید کر دیں یا قتل کر ڈالیں یا جلا وطن کر دیں۔ وہ اپنی چالیں چل رہے تھے تو اللہ اپنی چال چلا رہا تھا اور (جانے رہو) اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے“ (انفال: 3)۔

ناشر میں دشمن عین دبانے پر پہنچ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن ہی کی زبان میں ”کمزور ترین کھر“ مکاری کے جانے کا قلعہ بنا دیا۔ سرور عالم ﷺ نے اس موقع پر جو الفاظ فرمائے وہ اسلامی طرز انقلاب کا مرکزی راز ہے۔ فرمایا ”غم نہ کر! اللہ ہمارے ساتھ ہے“۔ یعنی جس فریق میں رب کائنات خود شامل ہو چکا اسے مات کرے گا تو کون؟ اللہ تعالیٰ کا فرمایا تو یہ۔

”اس وقت اللہ نے اپنے طرف سے سکون قلب مازل فرمایا اور اپنے نبی ﷺ کی مدد ایسے لشکروں سے کی جو تم کو نظر نہ آتے تھے۔ اور کافروں کا بول بچا کر دیا۔ اور اللہ کا بول تو اونچا ہی ہونے کو ہے۔ اللہ زیر دست اور دانا و بیبا ہے“ (توبہ: 40)۔

لاریب آج بھی اسلامی انقلاب برپا ہو سکتا ہے بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کو بروئے کار لانے کا مسنون طریقہ اختیار کیا جائے۔ نصر اللہ اور فتح لازم و ملزوم ہیں (صف: 13) ”(نصر: 1)۔ نظام باطل جب یوں بے بس و مغلوب ہو جائے اور زمام کار متسلحین کے ہاتھ آ جائے تو یہ وقت ہے جب دوام خلافت کا دور شروع اور انتخابات کا انعقاد ضروری ہو جاتا ہے۔ وہ بھی قرآن و سنت کے دیئے ہوئے طریقے سے جس کی ایک شکل آگے آ رہی ہے۔

قیام خلافت کے متعلق گزارشات ختم کرنے سے پہلے دو غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے۔ ایک غلط فہمی تو یہ کہ کہا جاتا ہے کہ رسول ﷺ اور صحابہؓ کے مقابل غیر مسلم تھے جب کہ آج ہمیں مسلمانوں سے واسطہ ہے۔ اصل میں افراد سے مقابلہ نظام باطل کے قلع قمع کیلئے ہوتا ہے۔ اگر نظام باطل ہو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کے مخالفین و معاونین غیر مسلم ہیں یا برائے نام مسلمان۔ جس نظام سے آج ہمیں واسطہ ہے یہ بھی کچھ اسلام اور کچھ غیر اسلام کا آمیزہ ہے اور جو نظام اس وقت تھا وہ بھی اسلام و غیر اسلام کا ملغوبہ تھا۔ اس وقت حج اور عمرے کی کوئی نہ کوئی شکل موجود تھی۔ چار مہینے کی حرمت کو تمام قبائل عرب تسلیم کرتے تھے۔ فتنہ غسبل جنابت، جانوروں کو ذبح کرنا، مردوں کو دفن کرنا، نکاح، طلاق، قصاص، دیت وغیرہ کی شکلیں کسی نہ کسی طور موجود تھیں۔ بالفاظِ دیر آج کی طرح ”کفر ملا، اسلام“ تو بدستور موجود تھا، کی گرتھی تو خالص دس حق کی۔

دوسری بات جو کہی جاتی ہے تو یہ کہ اس وقت تو رسول ﷺ خود موجود تھے جب کہ آج مابعد رسالت

کا دور ہے۔ دراصل یہ ایسا ہے کہ کوئی یہ کہے کہ آج دین پر عمل کرنا یا مثال کے طور پر نماز پڑھنا اس لئے ضروری نہیں کہ رسول ﷺ ہم میں نہیں۔ قرآن و سنت کی پیروی کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ قیامت جو بھی کام بھی کیا جائے مسنون طریقے سے کیا جائے۔ مسنون طریقہ سے کیا جائے تو کامیابی و کامرانی لازم ہے، شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ قرآن میں آیا:

”جو شخص اللہ و رسول کی پیروی کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی“ (احزاب: 71)۔

## دوام خلافت کا مسنون طریق کار

یاد رہے چاروں خلفاء راشدین کا انتخاب تو ہوا لیکن قدرے مختلف طریقے سے۔ تاہم طریقہ ہائے انتخاب میں قرآن و سنت پر مبنی چند مشترک اصولی ضوابط اختیار کئے گئے جو یوں ہیں:-

۱۔ کوشش کی گئی کہ قیادت اہل امانت کو سونپی جائے اور اس قرآنی ضابطے کی حرف بہ حرف پیروی ہو جو یوں ہے کہ ”مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔۔۔۔۔“ (النساء: 58)۔

۲۔ حق حکمرانی صرف ایک سربراہ یعنی خلیفہ کو سونپا گیا یا وجود یک اسلامی مملکت کی حدود و بے حدود وسیع ہو گئیں۔ آج اسلامی دنیا پر ایک خلیفہ کا حق حکمرانی چھین کر اگر 57 حکمران مسلط ہیں تو سب کے سب غاصب اور جب اقتدار میں اس لئے کہ رسول ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ ”جب دو خلیفہ سے بیعت کی جائے تو جس سے اخیر میں بیعت ہوئی ہو اسے قتل کرو“ (اس لئے کہ اس کی خلافت پہلے خلیفہ کے ہوتے ہوئے باطل ہے)۔“ (مسلم)۔ باغواظ دیگر اسلام جب ایک سے دو خلفاء ہونے ہی کی اجازت نہیں دیتا تو متعدد حکمرانوں کا کیا سوال؟

۳۔ ولی مہد بنانے کی قطعی ممانعت

۴۔ امیدوار کھڑا ہو کر کسی کو بذریعہ کنوینینگ اپنے حق میں کرنے کی دو ٹوک نگی۔ بادی برحق ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ”خدا کی قسم ہم نہیں دیتے مہد ہاں شخص کو جو اس کی درخواست کرے اور جو اس کی حرص کرے“ (مسلم)۔ یاد رہے آج کی دنیا میں اس دھرتی کے مکینوں کو کسی سیلاب، کسی زلزلے، کسی آگ، کسی انہم بم سے اتنا نقصان نہیں پہنچتا جتنا کہ رسول ﷺ کے اس ارشاد مبارک سے انحراف سے۔ آج دنیا میں جس قدر ظلم و استحصال، فتنہ و شر بد امنی و بے چینی، سفارش و رشوت، اقرباء پروری و ہیرا معیار جدی دشمنیاں اور ہارس ٹریڈنگ وغیرہ ہیں ان سب کا سرچشمہ ایک فرد کا دوسرے فرد کے ووٹ کا محتاج ہو جانا ہے۔

۵۔ خلیفہ کا انتخاب محض اہل حل و عقد کی رائے سے ہوا امانت کے ہر فرد نے ان



انتخابات میں حصہ نہ لیا۔ اصل میں قرآن کے مطابق دنیا میں وقت کے ہر موڑ پر لوگوں کی اکثریت ہمیشہ جاہلوں کی ہوتی ہے (اکثر الناس لا یعلمون) لہذا جس نظام کی انھان لوگوں کی اکثریت پر ہوا اس میں ہمیشہ جاہل ہی آگے آئیں گے۔ ”اناس“ یعنی مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کا انتخاب میں حصہ لینا تو درکنار اسلام تو اس سے بھی ایک قدم آگے جاتا ہے اور وہ پوری مسلم آبادی کو بھی اس کھیزے میں نہیں ڈالتا کہ وہ انتخابات میں حصہ لے چٹاؤ کا بوجھ وہ صرف اربابِ حل و عقد پر ڈالتا ہے۔ یاد رہے اسلام میں خلیفہ کی جگہ خالی ہونے کے تین دن کے اندر اندر اسے پرکرا ہوتا ہے اور ایسا بھی ممکن ہے کہ صرف اربابِ حل و عقد جو حقیقت میں عوام کے معتد ہوتے ہیں اس مرحلہ کو سر کریں۔

۶۔ اہل اور قابل ترین قیادت کو آگے لانے کے لئے قرآنی معیار اہلیت جو پانچ اوصاف ایمان (النور: 55) تقویٰ (الحجرات: 13) صلاح (النور: 55) علم اور جسم (البقرہ: 247) پر مشتمل بنے کی پابندی کی گئی۔

۷۔ ایک دفعہ منتخب ہو جانے والی قیادت کو بنانا درج ذیل صرف تین صورتوں میں جائز ٹھہرا ورنہ حیات قائم دائم۔

- ☆ وفات پا جانے کی صورت میں
  - ☆ از خود معذرت کر لینے کی صورت میں
  - ☆ قرآنی معیار اہلیت میں سے کسی ایک یا کئی اہلیتوں میں کسی آنے کی صورت میں۔
- دور خلافت راشدہ میں مؤخر الذکر دونوں صورتوں کی نوبت نہ آئی لہذا پہلی ہی صورت کو اختیار کیا گیا۔

۸۔ اہل اقتدار تو بہر حال حزب اقتدار باقی پوری امت حزب اختلاف تھی۔ کوئی بھی امتی کسی بھی وقت قیادت کا حساب کر سکتا تھا۔ آج کی طرح کی متحارب حزب اقتدار حزب اختلاف کا کوئی وجود نہ تھا۔

۹۔ منتخب ہونے کی صورت میں خلیفہ وقت پر درج ذیل دوحز یہ قد غنوں کی پابندی لازمی

تھی۔

☆ تریبہا اوسط سطح کے شہری کی بود و باش اختیار کرنا۔

☆ دار الخلافت کی مرکزی مسجد کا خطیب و امام ہونا۔

زمانی و مکانی ضروریات کے پیش نظر نوعیت کے اعتبار سے طریق انتخاب قدرے مختلف تو ہو سکتا ہے لیکن شرعاً وہی طرز انتخاب جائز ہوگا جو مندرجہ بالا شرعی حدود کا پابند ہو ورنہ ناجائز خواہ ایک ہی شرط کی خلاف ورزی کیوں نہ ہو۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کے دور کو اسی لئے دو خلافت راشدہ کا حصہ سمجھا جاتا ہے کہ کچھ عرصہ خراف کے بعد ان کے دور میں ایک دفعہ پھر ان شرائط کی پابندی کی گئی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج کیا کوئی ایسا طرز انتخاب وضع کر لینا ممکن نہیں کہ جس کے ذریعہ قرآن و سنت پر پورا اترنے والی قیادت ہی آگے آئے۔ ایسا کرنا سو فیصد ممکن ہے۔ ذیل میں ہم پاکستان کو بطور مثال لے کر ایک ایسے ہی طرز انتخاب کا ذکر کرتے ہیں۔

### مجوزہ طرز انتخاب

جب معیاری لوگ آگے لانے ہوں تو ضروری ہے کہ وہ ادارہ یا معیار جو اہل لوگوں کی نشاندہی کرنے کا ایک ہی ہو۔ دارالسلام (اسلام کی مملکت واحدہ) کی سطح پر ایسا واحد ادارہ الیکشن کمیشن ہی ہو سکتا ہے یعنی ہر صوبہ میں صوبائی الیکشن کمیشن تو دارالسلام کی سطح پر وفاقی الیکشن کمیشن۔ پہلے مرحلے میں چونکہ صوبائی امراء کا انتخاب مطلوب ہے لہذا ہر صوبے میں مثال کے طور پر پاکستان (پاکستان دارالسلام کا ایک صوبہ ہوگا) میں پاکستان کا الیکشن کمیشن حسب ضرورت یا مثال کے طور پر پچاس الیکشن بینک بنائیگا۔ ہر بینک تین ایسے افراد پر مشتمل ہوگا جن کی شرافت اور دیندارانہ شہرت مسلمہ ہو۔ یا در ہے اسلامی تعلیمات کے مطابق ایسے نیک سیرت انسان وقت کے ہر موسم پر موجود ہوتے ہیں۔ الیکشن بینکوں کی تشکیل کے ساتھ ساتھ پورے پاکستان کو مناسب سائز کے حلقوں میں تقسیم کر لیا جائے (حلقے کا سائز موجودہ قومی اسمبلی کے حلقوں کے برابر بھی ہو سکتا ہے)۔ ہر حلقہ کے لئے مقرر کردہ الیکشن بینک اپنے حلقہ میں سات دن مختلف ریٹ ہاؤسوں یونین کونسل کے دفتر یا دوسری مناسب جگہوں پر اس پروگرام کے تحت قیام کرے کہ جس کا پہلے سے اخبارات و اشتہارات

کے ذریعہ اعلان کیا جائے۔ اس ساری سعی کا مقصد یہ ہے کہ متعلقہ پینل حلقے کے لوگوں سے اس قدر رقبہ تر رابطہ قائم کرے کہ گویا بالیابن حلقہ کا ہی حصہ بن جائے۔ اپنے قیام کے دوران متعلقہ آبادی میں سے بہ مشورہ عوام ایسے لوگوں کی خفیہ فہرست تیار کی جائے کہ جو قرآنی معیار اہلیت کے حامل ہوں۔ فہرست تو پہلے ایسے تقریباً 150 افراد (مردوں) کی تیار کی جائے لیکن کانٹ چھانٹ اور کراس چیکنگ کے بعد اسے 100 افراد تک محدود کر دیا جائے۔ اس طرح سات دنوں میں 50 پینل پچاس حلقوں کی فہرستیں تیار کر لیں گے۔ اسی حساب سے کم و بیش 150 حلقوں کا سروے تقریباً تین ہفتوں میں مکمل ہو جائے گا۔ سروے مکمل ہونے کے سات دن کے اندر راند رصوبائی الیکشن کمیشن انہی ممبران پینل کی خدمات سے استفادہ کرتے ہوئے ہر حلقہ کی فہرست میں شامل کردہ 100 افراد کو متعلقہ حلقہ ہی میں کسی ایک جگہ پر برائے مشورہ طلب کرے۔ ضروری نہیں کہ ایسے تمام اجتماعات پورے صوبے میں ایک ہی دن ہوں۔ لیکن اگر ہوں بھی تو کوئی خرچ نہیں۔

مشورہ کے اغراض و مقاصد بتانے کے بعد بلائے گئے افراد میں سے ہر ایک کو 100 افراد کی تیار کردہ فہرست کی ایک کاپی مہیا کی جائے اور اسے فہرست میں دیئے گئے افراد میں سے مطلوبہ (پاکستان کی صورت میں مثلاً دس) افراد کو جن کو وہ سمجھتا ہے کہ وہ قرآنی معیار اہلیت پر بدرجہا تم پورے مانتے ہیں خفیہ طور پر تک کرنے کو کہا جائے۔ جو شخص اپنے نام کو بھی تک کرے اس کے مشورے کو نہ صرف مسترد کر دیا جائے بلکہ اسے کسی بھی عہدے کے لئے مائل قرار دیا جائے۔ اس طرح سے جو شخصیت سب سے زیادہ تک ہوا سے متعلقہ صوبہ کی طرف سے وفاقی شوری کارکن ہونے کی سعادت ہو۔ جو دوسرے نمبر پر آئے اسے صوبائی شوری کارکن گردانا جائے۔ باقی تک شدہ افراد میں سے مطلوبہ تعداد کو زونل شوری کارکن بنایا جائے۔ اس کے لئے ہر صوبے کو ایک کروڑ آبادی پر مشتمل زونوں میں تقسیم کیا جائے۔ ہر زون کی انتظامیہ علیحدہ اور ایک گورنر کی سربراہی میں ہو (اس مرحلے پر پاکستان کے غالباً 17 زون بنانا ہوں گے) اگر کوئی منتخب شخص معذرت کر لے تو ظاہر ہے پھر فہرست میں تک کردہ نگلے فرد کو لیا جائے گا۔

امیر المؤمنین کا چناؤ وفاقی شوری کے ارکان آپس میں اسی طرح بغیر کسی رکن شوری کے امیدوار کھڑا ہونے کے خفیہ رائے دی سے کریں۔ صوبائی امراء کا چناؤ صوبائی شورائیں کریں اور زونل گورنروں کا

انتخاب زوئل شورا میں کریں۔ وفاقی وزراء کا انتخاب خلیفہ وقت اور صوبائی وزراء کا چناؤ صوبائی امراء کی صوابد پر ہو۔ نیز ملکی سطح پر ایسے انتخابات پوری تاریخ میں صرف ایک ہی دفعہ ہوں۔ کسی رکس شوری کی سیٹ خالی ہونے کی صورت میں صرف متعلقہ حلقہ میں دوبارہ انتخاب ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا تجویز کردہ طرز انتخاب جملہ اسلامی تقاضوں کو پورا کرتا ہے تاہم حرف آخر نہیں۔ قرآن و سنت کی شرائط کی پابندی کرتے ہوئے طرز انتخاب میں حسب ضرورت رد و بدل کیا جاسکتا ہے۔ مذکورہ طرز انتخاب نہ صرف سستا آسان مختصر وقت میں اور معمولی عملہ سے مکمل ہونے والا ہے بلکہ مروجہ انتخابی شور شرابے، گروہی و جماعتی محاذ آرائیوں اور برادریوں کی خاصصحوں سے بھی قطعی پاک ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ دارالسلام صوبائی اور زوئل سطح پر انتخاب صرف ایک ہی دفعہ درکار ہے پھر کبھی نہیں۔ اس کا یہ بھی طرہ امتیاز کہ صرف اہل اور امانتدار افراد ہی قیادت پر متحمل ہو سکتے ہیں ووٹر کی محتاجی کا کوئی سوال نہیں۔ دور دراز کا ایک غریب دیہاتی بھی ذاتی اہلیت کی بنا پر عوامی نمائندہ اور نگران منتخب ہو سکتا ہے۔

## نظام خلافت نہ ہونے کے مضر اثرات

اللہ تعالیٰ نے صرف یہی نہیں کیا کہ انسان کو عین زمین پر بھیجے وقت تکید کی کو زمین پر پہنچ کر الٹی ہدایات و قوانین کی پیروی کرنا (بقرة: 39) "صرف یہی نہ کیا کہ نبی کا ناسطیغہ کو دوسری ہی وحی میں دور نبوت میں جو کرنے کا کام دیا تو دنیا میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی و حاکمیت قائم کرنے کا (مشر: 3) "صرف یہی نہ کیا کہ حصول غلبہ دین کو دوسرے مرحلے پر رکھا، پہلے مرحلے پر رکھا تو قیام خلافت کو (نور: 55) بلکہ اس اشرف المخلوقات کی پیدائش کا مقصد قرار دیا تو جیسے پہلے بیان ہوا "قیام خلافت" کو۔ ایسا کیا گیا تو اس لیے کہ نظام خلافت اگر دنیا میں رواں دواں نہ ہو تو قرآن و سنت کے بیشتر احکامات پر کما حقہ عمل ہو ہی نہیں سکتا بلکہ اس صورت میں انسانی زندگی محض مجبوریوں کا گورکھ و خدا بن کر رہ جاتی ہے۔

سلسلہ نبوت ختم ہونے کے بعد ایک اہم فریضہ اب امت مسلمہ کے ذمہ ہے کہ وہ رہتی دنیا تک دین حق اور دین حق کی برکات و ثمرات کو ہر انسان تک پہنچائے۔ قرآن مجید میں آیا:

"اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کیلئے میدان میں لایا گیا ہے"

(آل عمران: 110)۔

صدیف مدج مسلمہ نے اپنے آپ کو "صیر امت" کے منصب جلیلہ سے نیچے گرایا تو اس قدر کہ خود مدج مسلمہ کا وجود آج زیر آسمان کہیں نہیں۔ نتیجہ اس کا نکلا تو یہ کہ چ جائیکہ مدج مسلمہ دوسری قوم کیلئے ہدایت و اصلاح کا فرض منصبی ادا کرتی خود غیار سے دکٹیشن لینے پر مجبور ہے۔ واقعات کی دنیا میں آج مسلمان عالم خود تو ذلت و خواری سے دوچار ہیں ہی پوری انسانیت کو اسلام کی برکات سے محروم کیے ہوئے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس لیے کہ:

گنوا دی ہم نے اسلاف سے جو میراث پائی تھی  
ٹریا سے زمیں پر آسمان نے ہم کو دے مارا

یہ سودا بڑے خسار کا ہے۔ نظام خلافت قائم و دائم رہتا تو ایسا نہ ہوتا۔ نظام خلافت کو گنوا کر ہم نے کیا کھویا؟ ذیل میں چند مضمر اثرات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے یہی نوٹ فرمائیں کہ اسلام میں نماز، زکوٰۃ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر..... چار امور اس قدر اہم ہیں کہ رب کائنات نے ان امور کو فرض قرار دے رکھا ہے۔ لیکن غور فرمائیں، دوبارہ غور فرمائیں یہ چاروں اہم امور پوری تفصیلات کے ساتھ ادا ہوتے ہی اس وقت ہیں جب مسلمانوں کو حکمین فی الارض حاصل ہو۔ (حج: 41)۔

آج ہمارے ہاں نمازیں بھی پڑھی جا رہی ہیں، زکوٰۃ کی ادائیگی بھی ہو رہی ہے اور اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض کی ادائیگی بھی کسی درجے ہو رہی ہے لیکن یہ سب فرائض آج بطور رسم ادا کیے جا رہے ہیں۔ ان کی اصل ادائیگی نظام خلافت کی موجودگی ہی میں ہو سکتی ہے۔ تفصیل اس کی یوں ہے:

صلوٰۃ

قرآن مجید میں ایک ایسی آیہ مبارکہ کا ذکر آیا ہے جسے مفسرین نے آیہ حکمین فی الارض کا نام دیا ہے۔ ملاحظہ ہو یہ آیت مقدسہ:

”یہ وہ لوگ ہیں جنہیں زمین میں اگر ہم اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے۔ اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔“ (حج: 41)۔

اس آیہ مبارکہ میں امتی سطح کے چار فرائض منہی یعنی نماز، زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذکر آیا ہے۔ فرمایا گیا کہ ان چاروں کی ادائیگی کما حقہ ایک ہی صورت میں ممکن ہے کہ مسلمانوں کو حکمین فی الارض حاصل ہو یا دوسرے نفعوں میں نظام خلافت قائم ہو۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نظام خلافت کے بغیر فرائض نماز کیوں کما حقہ ادا نہیں ہوتا۔ دراصل قرآن مجید میں نماز پڑھنے کا نہیں نماز قائم کرنے کا ذکر ہے۔ یعنی صلوٰۃ خود ایک نظام ہے جس میں خلیفۃ المسلمین کو خود دار الخلافہ کی مرکزی مسجد میں امامت و خلافت کے فرائض ادا کرنے ہوتے ہیں اور دنیا بھر کے آئمہ مساجد کو خلیفۃ المسلمین کی نمائندگی کرتے ہوئے یہ فرائض ادا کرنے

ہوتے ہیں۔ اصل میں اسلام عوام کے مسائل کو حل کرنے کیلئے ان کو زحمت نہیں دیتا کہ وہ حکمرانوں کے دروازے کھٹکھٹاتے پھریں بلکہ شب و روز کے چوبیس گھنٹوں میں کم از کم پانچ وقت خود حکمرانوں کو عوام میں لاتا ہے تاکہ ترجیحاً لوگوں کے مسائل سونے سے پہلے پہلے حل ہوں۔ خلیفہ المسلمین تو مقتدر ہوتے ہوئے اپنے ارد گرد علاقے کے مسائل حل کرتا ہے لیکن ہر مسجد میں اس علاقے کے اعلیٰ ترین افسر کو بطور امام صلوٰۃ خلیفہ المسلمین کی نمائندگی کرتے ہوئے یہی فرائض ادا کرنے ہوتے ہیں تاکہ ہر علاقے کے عوام کو اپنے مسائل حل کروانے کی سہولت میسر ہو۔ یہ ہے مطلب ”قیام صلوٰۃ“ کا۔ ظاہر ہے یہ نظام معرض وجود میں بھی آ سکتا ہے دوسرے لفظوں میں قیام صلوٰۃ کا فریضہ بھی کما حقہ ادا ہو سکتا ہے کہ نظام خلافت بافضل موجود ہو۔

یہ تو ہوئی قرآن مجید کی بات لیکن سب رسول ﷺ بھی یہی ہے۔ گونا گویا معراج کے موقع پر فرض ہو چکی تھی لیکن مکی دور نبوت میں نہ مسجد نبی نہ جماعت کا التزام ہوا۔ مسجد نبی تو مدینہ پہنچ کر اس وقت جب نظام خلافت قائم ہو چکا۔ کس قدر اہم ہے قیام خلافت کا نظام!

### زکوٰۃ

ہم نے ہر چیز کا متبادل انتظام کر لیا ورنہ اس میں کیا شک کہ فریضہ زکوٰۃ کی کما حقہ ادائیگی کے لئے بیت المال کا وجود لازمی ہے۔ بیت المال کے نظام کا مطلب ہے کہ مرکزی بیت المال دارا خلافت میں تو اس کی شخصیات پوری اسلامی دنیا میں موجود ہوں۔ ظاہر ہے بیت المال تو درکنار خود دارا خلافت معرض وجود میں آتا ہے تو اس وقت جب نظام خلافت رواں دواں ہو۔ یہی وجہ ہے کہ زکوٰۃ بھی فرض ہوئی تو مدینہ پہنچ کر اس وقت جب نظام خلافت قائم ہو چکا۔ قرآن و سنت دونوں سے عیاں ہے کہ فریضہ زکوٰۃ کما حقہ ادا ہو سکتا ہے تو اس وقت جب نظام خلافت قائم ہو۔

### امر بالمعروف ونہی عن المنکر

اصل میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی خود ایک فریضہ ہے تو نہی عن المنکر بھی خود ایک فریضہ ہے۔ قرآن مجید نے اکثر و بیشتر ان دونوں فرائض کو اکٹھے بیان کیا ہے۔ بتائیں یہ یوں جیسے ایک ہی فرض کے دو حصے ہوں۔ قرآن

و سنت میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اہمیت اتنی کہ سلوٹ و زکوٰۃ کی طرح اس کی ادائیگی فرد پر بھی واجب ہے معاشرے پر بھی اور عالمی سطح پر بھی۔ ایک فرد مومن کے اوصاف بیان کرتے ہوئے قرآن مجید میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو انفرادی سطح پر ادا کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے (توبہ: 112) "معاشرے کی سطح پر بھی (ال عمران: 104) اور امت کی سطح پر بھی (ال عمران: 110)۔ خود ہی کائنات متعلقہ کے ارشاد مبارک کے الفاظ اس بارے میں اتنے محکم اور پر زور ہیں کہ دل کانپتا ہے اس فریضے کی عدم ادائیگی کی صورت میں فرمایا:

"اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری زندگی ہے (اے مسجدِ مسلمہ!) تم نیکی کا حکم دیتے رہو اور برائی سے روکتے رہو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک ایسے (خطرناک) عذاب میں مبتلا کر دے گا کہ اس سے نجات پانے کیلئے تم اللہ تعالیٰ سے دعا کرو گے مگر وہ تمہاری دعاؤں کو قبول نہیں کرے گا" (ترمذی۔ مسند احمد)۔

اس حدیث پاک کے الفاظ (امر یعنی حکم کرو اور نہی یعنی روکو) نشان دہی کرتے ہیں کہ یہ فریضہ اسی وقت مکمل ہوتا ہے کہ جب کرنے والا مقتدر ہو یعنی اس کا قابل ہو کہ وہ بزد و معروف کا حکم اور نہی سے روک سکے۔ ایک گھر کا سربراہ اپنے گھر والوں کو تو اس کا پابند بنا سکتا ہے پڑوس والوں کو نہیں۔ امتی سطح یا عالمی سطح پر بھی یہ فریضہ مکمل ہوتا ہے تو اس وقت جب نظام خلافت قائم ہو یا دوسرے نقطوں میں فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ادائیگی کے لئے بنیادی ضرورت (Pre-Requisite) یہ ہے کہ نظام خلافت موجود ہو اور مسلمان دنیا میں بطور غالب قوت ہوں۔ مغلوبیت کی صورت میں نہ حکم دیا جاسکتا ہے اور نہ روکا جاسکتا ہے۔

### بیعت کیلئے خلیفۃ المسلمین کا وجود ضروری

بیعت کی بنیاد قرآن مجید کی درج ذیل آیت مقدسہ ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لئے

ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے مارے جاتے اور مرتے ہیں۔ ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمہ ایک پختہ وعدہ ہے تو راۃ اور انجیل اور قرآن میں۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو پورا کرنے والا ہو؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ سے چکا لیا ہے۔ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے" (توبہ: 111)۔

یعنی بیعت ایک معاہدہ ہے اللہ اور بندے کے درمیان بندہ اللہ کیلئے اللہ کی راہ میں اپنی جان اور



مال لگانے کا عہد کرنا ہے اور اللہ اسے اس کی جان اور مال کی قربانی کے صلہ میں جنت عطا کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ بیعت لینے کا اعزاز صرف خلیفۃ المسلمین یا اس کی زندگی میں اس کے مقررہ کردہ کسی نمائندے کو حاصل ہے کہ وہ اللہ کا نمائندہ ہوتے ہوئے اللہ کی طرف سے کسی مومن کو جان اور مال کے عوض جنت عطا کرے۔ پھر اسی لئے جنت کے وعدے کو آخرت میں یا اس دنیا کے بعد کی زندگی میں رکھا گیا ہے تاکہ دیکھا جائے کہ مال اور جان دینے والا آخری دم تک اپنے عہد پر قائم رہتا ہے یا نہیں۔

یہ تو ہے قرآن مجید کی بات رسول ﷺ نے اس وقت تک مسلمان ہونے والوں سے بیعت نہیں لی جب تک مدینہ سے آئے ہوئے لوگوں نے آپ ﷺ کو ایک نظام کے سربراہ کے طور پر تسلیم نہیں کیا۔ بیعت عقبہ کا انعقاد خود دیتا ہے کہ اس کا انعقاد اس وقت ہوا جب قیام خلافت کا مرحلہ جاگڑ ہوا۔

ہم نے ہر چیز کا متبادل ڈھونڈ لیا۔ چونکہ حدیث میں آیا کہ ”جو شخص مر جاوے اور اس نے کسی سے بیعت نہ کی ہو تو اس کی موت جاہلیت کی ہی ہوگی“ (مسلم) ہم نے گلی محلہ کی سطح پر بیعت شروع کر دی۔ یوں ہزاروں لاکھوں بیعت کے سلسلہ اور گلیاں معرض وجود میں آگئیں۔ ہم نے بیعت کا جب یوں خود ساختہ راستہ نکال لیا تو خلیفۃ المسلمین کو لانے کی ضرورت ہی کو اوچھل کر بیٹھے۔

### فرضہ شہادت علی الناس

انسانیت کی سطح پر دنیا میں دو گروہ ہمیشہ رہے ہیں۔ انسانوں کا ایک گروہ جو مسلمان گھرانوں میں پیدا ہوا اور دوسرا گروہ جو غیر مسلم گھرانوں میں پیدا ہوا۔ دونوں گروہوں کے ہر فرد کا حساب کتاب آخرت میں ایک ہی پلیٹ فارم پر ہوا ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ کے ہاں جو وعدہ ہونے کیلئے ہر دو گروہ کے ہر فرد کیلئے یہ جانتا ضروری ہے کہ اس کا رب چاہتا کیا ہے؟ انتخاب و ارادہ اور سزا و جزا کا نظام صرف اسی صورت میں معنی خیز ہو سکتا ہے جب ہر انسان کو یہ اطلاع مل جائے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا؟ اس دنیا میں اسے بھیجنے کا مقصد کیا ہے؟ اس کا آغاز کیسے ہوا اور اس کی انتہا کیا ہے؟ کون سے کام اچھے ہیں اور کون سے برے؟ اچھے کام کرنے سے اسے کیا انعام ملے گا اور برے کاموں کا کیا انجام ہوگا؟ کوئی بتانے والا اسے جنت اور دوزخ کے احوال سے آگاہ کرے اور کوئی باخبر اسے بتا دے کہ اس دنیا کا قیام عارضی ہے اور آخرت کا قیام دائمی۔ پھر چونکہ روزِ محشر کا

حساب کتاب ہر انسان کیلئے یکساں نوعیت کا ہو گا لہذا سب سے پہلے اس دنیا میں وارد ہونے والے انسان کا ان تمام باتوں کو جاننا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ بعد میں آنے والے کسی انسان کا۔ ان میں سے کسی کے پاس یہ عذر نہ ہو کہ اسے تو ان حقائق سے کسی نے آگاہ ہی نہیں کیا۔

ایک وقت تک انسانی تاریخ میں یہ رسالت یعنی انسانوں کو مذکورہ حقائق سے آگاہ کرنے کا کام انبیاء و رسل کرتے رہے ہیں۔ سلسلہ نبوت منقطع ہونے پر بالخصوص غیر مسلمان کھرانوں میں پیدا ہونے والوں تک یہ پہنچانے کا کام وسط یعنی ان انسانوں پر ڈالا گیا ہے جو مسلمان کھرانوں میں پیدا ہوئے اور جنہیں پیدا ہونے سے پہلے وہ ماحول مسموم ہوا کہ وہ مذکورہ حقائق سے از خود آگاہ ہوئے۔ قرآن مجید میں آیا:

”اور اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک ”امتِ وسط“ بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول ﷺ تم پر گواہ ہو“ (بقرہ: 143)۔

قرآن مجید نے اس پہنچانے کے کام کو ”شہادت علی الناس“ کی اصطلاح سے موسوم کیا ہے۔ یہ اس لیے کہ ایک شخص سے دوسرے شخص تک ایسی ہدایات و قوانین پہنچانے کے دو ممکنہ ذرائع ہیں۔ ایک قول سے اور دوسرے فعل سے۔ ذرائع ابلاغ کی گواہی کوئی سے قول سے پہنچاتا تو آج بہت آسان ہو گیا۔ لیکن بذریعہ قول پہنچانے والوں یعنی مسلمانوں کیلئے اسلام ایک بڑی کڑی شرط عائد کرنا ہے اور وہ یہ کہ قول سے پہنچانے والے خود اس پر بالفعل عمل پیرا بھی ہوں۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں“ (صف: 2-3)۔

یعنی مثال کے طور پر اگر کسی نے کسی دوسرے کو نماز پڑھنے کی بات قول تاکید کرنی ہو تو ضروری ہے کہ وہ تاکید کرنے والا پہلے خود نماز کا پابند ہو۔ کسی نے کسی دوسرے کو مسنون طریقے سے پانی پینے کی ہدایت کرنی ہو تو لازمی ہے کہ پہلے وہ خود مسنون طریقے سے پانی پینے کا پابند ہو۔ اسی طور جب امت مسلمہ کیلئے یہ ”شہادت علی الناس“ کا کام بطور فرض منہی قرار دیا جا چکا تو اس کیلئے بطور پیشگی ضرورت (Pre-Requisite) لازمی ٹھہرا کہ جس دین حق کو اس نے دنیا والوں تک پہنچانا ہے بالقول پہنچانے سے پہلے وہ خود اس دین یعنی

اسلام کو بافضل قائم کیے ہوئے ہو۔ دین اسلام کو بافضل قائم کرنا ہی نظام خلافت ہے۔ ”شہادت“ کا مطلب ہے گواہی یعنی ایسا نظام دنیا میں بطور گواہ عملاً موجود ہونا کہ اس کی برکات اور فوائد و فیوض خود دنیا والے لے سکیں۔ دیکھ سکیں۔ نظام خلافت نہ ہونے کی وجہ سے یہ فرض منہی آج مسلمانوں سے نہیں ہو رہا۔ سوختہ سختی قطعاً نہیں ہو رہا۔

### غلبہ دین حق

ساتھ لیچروں میں دو برحاضر کے مسلمانوں کا دنیا میں مغلوب ہونا اور دنیا کی قیادت کا اہل کفر و شر کے ہاتھ میں ہونا کافی زیر بحث آچکا۔ نظام خلافت موجود ہو تو دین حق موجود ہوتا ہے۔ نظام خلافت کی عدم موجودگی میں بددینی کی ایک شکل ہے جسے آج ہم اسلام سمجھ کر اختیار کیے ہوئے ہیں۔ قرآن بڑے دو ٹوک انداز میں پتہ دیتا ہے کہ دین حق کی سرشت میں ہے کہ اسے دنیا میں بطور غالب قوت ہی موجود ہونا ہوتا ہے۔ فرمایا گیا:

”اور اللہ کا بول تو اونچا رہنے والا ہے“ (توبہ: 40)۔

مغلوب ہی رہیں گے دنیا میں مسلمان جب تک یہ نظام خلافت کو بحال کر کے اسے رواں دواں نہیں رکھتے۔ غلبہ دین حق تو ویسے ہی دوسرا مرحلہ ہے جس کی بھی باری آتی ہے کہ قیام خلافت کا پہلا مرحلہ سرانجام ہو۔

### سود، شرک، فحاشی

سود، شرک اور فحاشی تین عالمگیر بیماریاں ہیں۔ یہ عالمی طاقتوں کی پیدا کردہ ہیں اس لیے کہ دنیا کی قیادت ان کے ہاتھ میں نہیں ہے کہ جو ان تینوں بیماریوں کا قلع قمع چاہتے ہیں۔ اہل شرک جن کے ہاتھ میں دنیا کی قیادت ہے اپنے تمام ذرائع اور تمام توانائیاں شرک کو نام کرنے میں صرف کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے میں مسلمان ہونے کے معاملے سود سے نفرت کرتا اور اس سے آخری حدود تک بچتا چاہتا ہوں لیکن میری یہ خواہش ایک سہانی خواہش ہی رہے گی جب تک دنیا کی قیادت اہل خیر کے ہاتھ میں نہیں آ جاتی۔ پوری دنیا اس وقت

سودی نظام میں جکڑی ہوئی ہے۔ مجھے اسی باطل کے نظام میں ہی رہنا پڑا ہے۔ ٹھیک ہے میں بینک میں اپنی بچت جمع نہ کراؤں یا کراؤں تو کرنٹ اکاؤنٹ وغیرہ میں کرا کر کسی حد تک تو میں سود سے بچ سکتا ہوں لیکن اس کا کیا جائے کہ جس قلم سے میں لکھ رہا ہوں اس میں سے سود ہے۔ اس لیے کہ تمام مصنوعات کسی نہ کسی فیکٹری میں بنتی ہیں اور آج کے دور میں کوئی فیکٹری ہے جو سودی نظام سے ماورا ہو۔ تو میں نہ چاہتے ہوئے بھی سود میں ملوث ہوں اور وہ اس لیے کہ سسٹم میں سود ہے اور یہ سودی نظام باطل عالمی طاقتوں کا ہر پا کر رہا ہے۔ میں مجبور ہوں سود سے نہیں بچ سکتا اس لیے کہ موجودہ حالات مجھے جکڑے ہوئے ہیں۔ نظام خلافت نہیں تو نظام جہالت کا دور دورہ ہے۔ بنائیں "I am victim of the system" میں سود سے نہیں بچ سکتا۔

اسی طرح شرک اتنی بڑی خلافتی بیماری ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”اللہ کے ہاں بس شرک ہی کی بخشش نہیں ہے اس کے سوا اور سب کچھ معاف ہو سکتا ہے جسے اللہ بخشنا چاہے۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا وہ تو گمراہی میں بہت دور نکل گیا“ (نساء: 116)۔

جیسے کہ اوپر ذکر ہوا نظام خلافت نہ ہو تو ”پورے کے پورے اسلام میں داخل ہونے“ کی صورت پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ کوئی لاکھ کوشش کرے زیادہ سے زیادہ یہ صورت بن سکتی ہے کہ کچھ اسلام اور کچھ غیر اسلام۔ یہ کچھ اسلام اور کچھ غیر اسلام ہی تو شرک ہے۔ نظام خلافت کی عدم موجودگی میں تو آج کے مسلمان اغیار کی ذنیشن لینے پر مجبور ہیں۔ یہ تو ”مباشر شرک“ ہے جس میں دنیا بھر کے مسلمان ملوث ہیں۔

فاشی، کریانی، بے حیائی، بے غیرتی بلکہ جہت جہتی سے کون سا انسان ہے کہ جو بچا ہوا ہو؟ دنیا بھر کے ذرائع و ابلاغ صبح و شام لگے ہوئے ہیں یہ بد اخلاقیوں پھیلانے..... آپ ٹی وی نہ رکھیں اخبار نہ پڑھیں آپ کی پرہیزگار دور تک نہ ہو لیکن مسجد تک جاتے ہوئے جو طوفان بد تمیزی کھلے ہاتھوں آپ کو دعوت گناہ دے رہا ہوتا ہے کیا ہے کوئی ایسی عینک جو آپ کو امداد دے آتے اس طوفان حیا سوزی سے بچا سکے؟

بس مجبوری ہے مجبوری ہے کی رٹ لگائے ہم قبر میں چلے جائیں گے۔ نظام خلافت ہوتا تو ایسا نہ ہوتا۔

اجتہاد کے دروازے بند

خلافت راشدہ کے مبارک دور کو منقطع کر کے ملوک نے ڈیرے آجائے تو انہیں کمر توڑ مزاحمت کا

سامنا کرنا پڑا۔ یہی وہ وقت تھا جب علماء امت نے سرکاری شوریٰ کو درباری مولویوں کا گھٹے جوڑ قرار دیتے ہوئے مسٹر دکر دیا۔ متبادل انتظام کے طور پر فقہائے اسلام کے متعدد مکتبہ فکر معرض وجود میں آئے جن میں حنفی مالکی شافعی اور ضلی ہمارے ہاں کافی معروف ہیں۔ ان فتنی گروہوں نے گرا فتنہ رکام کیا جو نظام خلافت قائم ہونے والی شوریٰ کیلئے اصول خزانہ ثابت ہو گا۔ بایں ہمہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ فتنی مکتبہ فکر نظام خلافت کی اصل شوریٰ کے نہ ہونے سے متبادل انتظام کے طور پر معرض وجود میں آئے۔ جس حق سے یہ انحراف تھا لہذا وقت گزرنے کے ساتھ یہ گرا فتنہ رکام بھی متعدد دندہ ہی طبقات اور فرقوں کی تخلیق کا باعث بنا۔ خلافت راشدہ کا نظام اگر قائم دائم رہتا تو ان متعدد مکتبہ ہائے فکر کا ظہور ہی نہ ہوتا اور اجتہاد کا کام امتی سطح پر قرآنی شوریٰ سے ہی سرانجام ہوتا رہتا۔ آج ایسی شوریٰ کا وجود نہیں تو اجتہاد کے دروازے بند ہیں۔ مختلف دارالعلوم کی سطح پر یہ مفتی حضرات کی ضرورت نہ پڑتی۔ فتووں سے فتوے نہ نکراتے۔

## جہاد

وقت کے موجودہ موڑ پر مختلف جہادی گروہوں، تنظیموں اور لشکروں کو جو قتال و جہاد کرنا پڑ رہا ہے یہ ”مجبوری“ کا راستہ ہے۔ اس کی حیثیت ایسی ہی ہے کہ کسی کے سامنے اس کی بہن بیٹی یا بیوی وغیرہ کو کوئی جبراً چھین کر بھاگنے کی کوشش کرے تو اس کے پاس چارہا چاراس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہوتا کہ وہ اس کا بھرپور دفاع کرے خواہ اس کی جان جاتی رہے۔ ناقابل فہم تصور ہے کہ مسلم ہو اور جان کو آن پر قربان نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کے خزانے بڑے وسیع ہیں قتال و جہاد کرنے والوں کیلئے اس کے پاس بہت کچھ دینے کو ہے اور راہ جہاد میں جانیں دینے والے، ان شاء اللہ، روز محشر سرخرو ہو گئے۔ لیکن کوئی یہ نہ بھولے کہ نظام خلافت کی عدم موجودگی میں یہ قتال و جہاد کا متبادل راستہ ”مجبوری“ آج کے مسلمانوں کو اختیار کرنا پڑا، ورنہ شرعی قتال و جہاد کیلئے درج ذیل دو شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے۔

۱۔ شرعی قتال و جہاد صرف ملکوں کی سطح (State to State) پر کیا جاتا ضروری ہے، نجی لشکروں اور پرائیویٹ تنظیموں کی سطح پر نہیں۔

۲۔ شرعی قتال و جہاد صرف خلیفہ وقت یا اس کی زندگی میں اسی کے نمائندے کے ایما اور اجازت

پر ہو سکتا ہے ہر آدمی کو اپنی سطح پر جہادی گروہ بنا کر ایسے کرنے کی اجازت نہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے مکی دور نبوت جسے اوپر قیام خلافت کے دور سے موسوم کیا گیا میں قیام نظام خلافت کی جدوجہد تو ہوئی اور حقیقت میں بھرپور ہوئی لیکن قتال والا جہاد نہیں ہوا۔ اس وقت تک مسلمان ہونے والوں کو ذہنی دی گئیں، زیر آسمان بے مثل مارا پیٹا گیا لیکن کسی مسلمان نے غار و شریکین میں سے کسی کو تھپڑ تک نہیں مارا، تھپڑ مارنا تو درکنار مسلمانوں نے ترش کلامی سے اجتناب کیا۔ کیننگی کا مقابلہ شرافت اور ہدی کا مقابلہ نیکی سے کیا۔ دشمنان اسلام نے تو ”بے مبری“ کا مظاہرہ بھرپور کیا، مسلمانوں نے ”مہر“ کا دامن قحار سے رکھا۔ یاد رہے جیسے پہلے ذکر ہو چکا جب نبی کائنات ﷺ کو دوسری ہی وحی میں دنیا میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی و حاکمیت کو قائم کرنے کا حکم دیا تو اسی وحی کے آخری آیہ مبارک یعنی ساتویں آیت میں یہ تاکید بھی کر دی کہ ”اپنے رب کی خاطر مہر کرنا“ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ تبدیلی نظام جان جو کھوں کا کام ہے۔ بڑے مشکل اور بھیا تک مراحل آئیں گے۔ دل دہل جائیں گے اور مومنین بلامارے جائیں گے۔ غزوہ خندق میں ایک ایسا مرحلہ آیا جسے قرآن مجید بیان کرتا ہے تو اس طرح کہ ”اس وقت ایمان والے خوب آزمائے گئے اور بری طرح بلامارے گئے“ (احزاب: 11)۔

لیکن یاد رہے یہ کشت و خون والے مراحل مدینہ میں پیش آئے جب ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست دنیا بھر کی بڑی بڑی مملکتوں کے مقابلے میں معرض وجود میں آگئی۔ مکہ میں ایسا نہ ہوا تو اس لیے کہ ابھی اسلام کی ریاست معرض وجود میں نہ آئی تھی۔ قیام خلافت کے دور میں ”کنوایہ کیم“ کا راستہ اختیار کیا گیا، ظلم کے مقابلے میں مہر کا راستہ اختیار کیا گیا۔ اسلامی ریاست کے وجود پذیر ہوتے ہی اس پابندی کو اٹھالیا گیا اور ابتدا ہی میں اللہ تعالیٰ نے نہ صرف قتال کی اجازت دے دی بلکہ ایسا کرنے کی وجہ کو بھی بیان کیا۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر آیا۔ فرمایا گیا:

”اجازت دے دی گئی (قتال کی) ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے۔ کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے ”اللہ ہمارا رب ہے“۔“ (حج: 39)۔

مظلوم اور اللہ کے درمیان کوئی دیوار نہیں ہوتی۔ مظلوم کی مدد رب کائنات اس طور کرتا ہے جیسے کہ یہ اس پر واجب ہو۔ مکی دور نبوت کے مسلمانوں سے زیادہ اور کون زیادہ مظلوم ہوگا جنہیں اپنے وطن اور اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے۔ ہجرت مدینہ نظام باطل سے اظہار کی آخری صورت تھی ہی اللہ تعالیٰ کی نصرت کو حاصل کرنے کا اعلیٰ ترین ذریعہ بھی تھا۔ قرآن مجید میں ایسے ہی مواقع کیلئے آیا:

”جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کیلئے بہت جگہ اور سہولت کیلئے بڑی گنجائش پائے گا اور جو کوئی اپنے گھر سے اللہ کی طرف ہجرت کے لیے نکلے پھر اسے موت آجائے اس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہوگا، اللہ بہت بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے“ (نساء: 100)۔

وقت آیا مکی دور نبوت میں تشدد کے مقابلہ میں صبر کرنے والوں پر کہ نہ صرف عرب و عجم جیسی وسیع و عریض جگہ نہیں رہنے کو ملی بلکہ نصرت ایزدی بھی ان کے شامل حال ہو گئی۔ قرآن مجید میں آیا:

”یاد کرو وہ وقت جبکہ تم تھوڑے تھے۔ زمین میں تمھیں کو بے زور سمجھا جاتا تھا۔ تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں مٹا دیں۔ پھر اللہ نے تم کو جائے پناہ مہیا کر دی۔ اپنی مدد سے تمہارے ہاتھ مضبوط کیے اور تمہیں اچھا رزق پہنچایا۔ شاید کہ تم شکر گزار بنو“ (انفال: 26)۔

سورہ حج جو ہجرت مدینہ کے کچھ ادھر کچھ ادھر کیا کچھ مکی دور کے آخری ایام میں اور کچھ مدنی دور کے آغاز میں مازل ہوئی میں اس بات کا ذکر کہ ”اجازت دے دی گئی قتال کی“ کیا ملا اس کو واضح نہیں کرنا کہ مکی دور نبوت میں قتال کی اجازت نہ تھی حالانکہ مسلمانوں پر حملے ہو رہے تھے۔ وجہ اس کی صرف یہی تھی کہ قتال والے جہاد کا ہونا ملکوں کی سطح کا کام ہے اور بنائیں جو نبی مدینہ میں اسلامی مملکت معرض وجود میں آگئی قتال کی اجازت دے دی گئی۔ مکہ میں قتال کی اجازت نہ تھی تو اس لیے کہ اسلامی ریاست کا ابھی وجود نہ تھا اور نظام خلافت قائم نہ تھا۔

پھر یہ بھی یاد رہے کہ اسلامی ریاست کے صوبے تو ان گنت ہو سکتے ہیں پوری دنیا کے اسلام خلیفۃ المسلمین کی قیادت میں مملکت واحدہ کی صورت میں رہنے کی پابند ہے۔ آج اسلامی دنیا کا کوئی 57 ممالک میں منقسم ہوا خود قرآن و سنت سے انحراف ہے ورنہ مثال کے طور پر کشمیر کا مسئلہ صرف پاکستان کا مسئلہ نہیں

پوری دنیا کے اسلام کا مسئلہ ہوتا۔ اور یہ بھی کہ جب پوری دنیا کے اسلام کا مسئلہ ہوتا تو اول تو یہ اور اس قبیل کے دوسرے مسائل پیدا ہی نہ ہوتے اور اگر ہوتے تو دنوں بلکہ گھنٹوں میں حل ہوتے سالہا سال وبال جان نہ بنتے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ آج ہمارے بھائی جو مجبوراً قتال کا راستہ اختیار کئے ہوئے ہیں، ایسا جہاد بند کر دیں، البتہ ہم یہ کہتے ہیں اور بجا کہتے ہیں کہ وہ اس ہستی کو لانے کی بھی متوازن کوشش کریں جس کے ایسا و اجازت سے ہی قتال والا جہاد ہوتا ہے اور جسے نبی کائنات ﷺ کے ارشاد کے مطابق وُحال کی حیثیت ہوتی ہے۔ بلکہ جس کی موجودگی میں ہی امت کے جملہ مسائل حل ہوتے ہیں۔ فرمایا گیا:

”امام وُحال ہے جس کے پیچھے مسلمان لڑتے ہیں (کافروں سے) اور اس کے ہوتے ہوئے بچتے ہیں مسائل سے۔ پھر اگر وہ حکم کرے اللہ سے ڈرنے کا اور انصاف کرے تو اس کو ثواب ہوگا اور جو اس کے خلاف حکم دے تو اس پر وبال ہوگا“ (مسلم۔ کتاب الامارت)۔

خرابی ہمارے اپنے گھر میں ہے جس کی وجہ سے دشمنان اسلام کو موقع مل گیا کہ وہ منتشر اجتہادی جتھوں میں شامل ہمارے نوجوان عنصر کی تھوڑے اور بے ہتھیار ہونے کی بنا پر آسانی نکالی کرتے رہیں اور وہ بھی مسلمانوں کی اپنی سرزمینوں میں ماکہ مکمل کو مجتمع ہو کر وہ دشمن کے لیے خطرہ نہ بن سکیں۔ یہ گھر کی خرابی ایک ہی صورت میں دور ہو سکتی ہے کہ نظام خلافت رواں دواں ہو۔

## اتحاد

ہم پہلے ذکر کر آئے کہ اتحاد کی اعلیٰ ترین صورت پوری دنیا کے ذرائع و وسائل کا ایک خلیفہ المسلمین کے ہاتھ میں مجتمع ہونا ہے۔ آج کا غار و شرکین تو متحد ہیں لیکن سوختہ بختی، مسلمان ہیں کہ منتشر۔ اس وقت سے ہم مسلمان فطری اتحاد و یگانگت سے محروم ہیں جب سے فطری نظام..... نظام خلافت کو گنوا چکے ہیں۔ جیسے کہ پہلے ذکر ہو چکا مسلمان ماقیامت درج ذیل آئے کریمہ پر عمل نہیں کر سکتے:

”سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفریق میں نہ پڑو“ (آل عمران: 102)۔

اسی طرح درج ذیل آئے مقدسہ پر بھی اس وقت تک عمل نہیں ہو سکتا جب تک مسلمانان عالم یونی



کمانڈ کی سرکردگی میں نہ ہوں یا باغی خانہ دہر نظام خلافت اس وحرفی کا مقدر نہ بن جائے۔

”(مسلمانوں) شرکوں سے سب مل کر لڑو جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں“ (توبہ: 36)۔

شرکوں کا مل کر لڑنا تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ عراق، افغانستان وغیرہ میں کفار و شرکین باہم اتحادی اور حمایتی بن کر لڑ رہے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں پوری دنیا کے مسلمان منتشر ہیں۔ کسی ایک محاذ پر بھی مسلمان نہ عالم ایک جہت سے تلے متحد ہو کر آگے نہیں بڑھ رہے۔ محاذ پر متحد ہونا تو درکنار وائی سی اور عرب لیگ جیسے بظاہر مشترک پلیٹ فارموں پر اکٹھے ہونے والے بھی یکا گت و یکجہتی کا مظاہرہ نہیں کرتے بلکہ ایسا مٹا چھوڑتے ہیں کہ جیسے ان کی باگ ڈور کسی غیبی ہاتھ میں ہو۔ اجتماع تو مسلمان سربراہان کا ہوتا ہے لیکن ایسے اجتماع میں طاغوتی طاقتوں کے مفادات کی آبیاری کی جارہی ہوتی ہے۔ اصل میں ان کے انتشار نے ہی ان بیرونی طاقتوں کو اس کا مل بنایا کہ وہ انہیں آپس میں لڑا کر مسلمان سرزمینوں کے ذرائع اور وسائل کو لوٹ کر اپنے ہاں کی رونقیں بڑھائیں۔

### امت مسلمہ زیر عتاب

آج ہم زیادہ سے زیادہ ”مسلمانانِ عالم“ کی اصطلاح ہی استعمال کر سکتے ہیں اس لیے کہ جیسے ہم پہلے ذکر کر آئے نظام خلافت کی عدم موجودگی میں اور مرکزیت ختم ہونے سے ”امت مسلمہ“ کا وجود زیر آساں کہیں نہیں اور یہ امت مسلمہ کے وجود کا نہ ہونا بذات خود عذاب کی شکل ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانانِ عالم وقت کے اس موڑ پر تین طرح کے عذاب سے دوچار ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے صدیوں پہلے نشانہ ہی فرمادی تھی کہ جب بھی مسلمان خود پر فلاں فلاں مخصوص حالات مسلط کر لیں گے تو وہ فلاں فلاں قسم کے عذاب سے لانا دوچار ہوں گے۔ پہلی قسم کا عذاب وہ ہے جو مسلمانوں پر اس وقت مازل ہوتا ہے جب مسلمان ایسے نظام کو رواں دواں کیے ہوئے ہوں جو کچھ اسلام اور کچھ غیر اسلام کا ملغوبہ ہو۔ فرمایا گیا:

”تو کیا تم کتاب کے کچھ حصوں پر ایمان لاتے ہو اور کچھ کا انکار کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ

ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں؟ اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو“ (بقرہ: 85)۔

اس آئیہ کریمہ میں دو طرح کے عذاب کی نوید دی گئی ہے۔ ایک طرح اسی دنیا میں ذلت و خواری کی شکل میں مازل ہونے والی اور دوسری طرح شدید ترین صورت میں آخرت میں مسلط ہونے والی ہے۔ ہاتھ کلنگن کو آری کیا جس ذلت و خواری سے دنیا بھر کے مسلمان اس وقت دو چار ہیں اسی وجہ سے ہے۔ اس دنیا میں مسلمانوں کا ذلت و خواری سے دو چار ہونا بتا رہا ہے کہ آخرت کا ”شدید ترین عذاب“ ان کے انتظار میں ہے۔ نظام خلافت قائم ہونا تو عذاب کی یہ صورت کبھی پیدا نہ ہوتی۔

دوسری قسم کا عذاب جو مسلمانانِ عالم پر وقت کے موجودہ موڑ پر مسلط ہے اور جس کا ذکر قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے کر رکھا ہے یوں ہے:

”کہو وہ (اللہ) اس پر قادر ہے کہ تم پر کوئی عذاب اوپر سے مازل کر دے یا تمہارے قدموں کے نیچے سے برا پا کر دے یا تمہیں گروہوں میں تقسیم کر کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی طاقت کا مزا چکھوادے۔ دیکھو ہم کس طرح بار بار مختلف طریقوں سے اپنی نشانیاں ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں شاید کہ یہ حقیقت کو سمجھ لیں“ (انعام: 65)۔

واقعات کی دنیا میں کس قدر کل کر ہمارے سامنے ہے عذاب کی یہ شکل کہ ”تمہیں گروہوں میں تقسیم کر کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی طاقت کا مزا چکھوادے“۔ فلسطین میں عراق میں افغانستان میں بلکہ ہمارے ہاں پاکستان میں مسلمان ہی مسلمان کو مار رہا ہے۔ اور چونکہ ہم نظام خلافت کی طرف نہیں آرہے اور بناہیں ہماری سمت درست نہیں وقت گزرنے کے ساتھ مسلمان سے ”مسلم ماری“ کے عمل میں شدت آ رہی ہے۔ اگر کسی طرح کا کوڑا کہیں زیر آسمان موجود ہوتا تو ایسا ہرگز نہ ہوتا۔

مذکورہ دو عذاب کی اقسام تو وہ ہیں جو نیا دہتر براہ راست مسلمانوں کو متاثر کیے ہوئے ہیں۔ شونی قسمت قرآن مجید عذاب کی ایک ایسی قسم کا ذکر بھی کرتا ہے جو صرف مسلمانوں کو ہی متاثر نہیں کرتی مسلمانوں کی مالی کی وجہ سے آج پوری انسانیت کو ہی متاثر کیے ہوئے ہے۔ فرمایا گیا:

”جو کافر ہیں وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں۔ (مسلمانوں) اگر تم ایسا نہ کرو گے تو یہ زمین بھر جائے گی فتنے اور بے فسادے“ (انفال: 73)۔

پس چہ باندہ کرد (کریں ہم تو کیا؟)

111

کے پیچھے ہی مسلمانوں نے قتال کرنا ہوتا ہے۔ ایسا کریں اس لیے کہ ایسا کرنے سے ہی ہمارے ہاں نظام بیعت بحال ہوتا ہے۔ ایسا کریں اس لیے کہ ایسا کیے بغیر عالمی سطح پر فرقہ شہادت علی الناس کا حقہ ادا نہیں ہوتا۔ ایسا کریں اس لیے کہ ایسا کرنا عالمی سطح پر فرقہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ادائیگی کیلئے ضروری ہے۔ ایسا کریں اس لیے کہ ایسا کیے بغیر غلبہ دین کا حصول ناممکن ہے۔ ایسا کریں ایسا کرنے سے ہی دین حق کی برکات بمثل عدل، امن، خوشحالی، اتحاد وغیرہ حاصل ہوتی ہیں۔ ایسا کریں اس لیے کہ ایسا کریں تو دین بے ورنہ بے دینی اور ایک بڑا فریب۔

جس قدر جلد ممکن ہو عملاً ہمارے کرنے کا کام یہ ہے کہ سازش کے تحت وجود پذیر موجودہ ستاون اٹھاون مسلم ممالک کو صوبوں کا درجہ دے کر اور باہم مدغم کر کے کرہ ارض پر ایک عظیم تر اسلام کی مملکت واحدہ کو معرض وجود میں لایا جائے۔ ایسی مملکت واحدہ ایک خلیفۃ المسلمین کی سربراہی میں ہو۔ اس کا آئین قرآن و سنت اور امام دارالسلام ہو۔

## برکاتِ خلافت

## اسلام انسانیت کا دین ہے

قرآن مجید۔۔ آسمانی کتابوں کے سلسلہ کی آخری کتاب کا آغاز ”رب العالمین“ کی حمد سے ہوتا ہے تو اختتام لفظ ”الکاف“ سے۔ اس کتاب جسے بشمول پہلی مازل شدہ کتب آسمانی قرآن مجید ”الکتاب“ کا نام دیتا ہے میں انسانوں کے خالق و پروردگار سے آغاز اور انسان سے اختتام کیا گیا تو یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اس انوکھی، یکساں اور عظیم کتاب کا موضوع ”انسان“ ہے۔ پھر چونکہ انسانیت اس کرۂ ارض پر وارد ہونے والے پہلے انسان سے لے کر قیامت سے پہلے آخری وارد ہونے والے انسان پر مشتمل ہے لہذا ظاہر ہے کہ جب جملہ آسمانی کتابوں کا مجموعہ یعنی الکتاب انسان کے متعلق ہے تو دوسرے نکتوں میں اس کا مطلب ہے کہ یہ انسانیت کی کتاب ہے۔ اسی بات کا مزید احاطہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ چند بنیادی حقائق کا پہلے ادراک کر لیا جائے۔

پہلی حقیقت یہ ہے کہ جب الکتاب انسان و انسانیت کی کتاب ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ انسان کی تحقیق، دوسری مخلوقات کے بارے میں اسکی حیثیت، مقصد، تخلیق آدم، اس دنیا میں انسانی زندگی گزارنے کے قوانین و ضوابط، انسان اور کائنات کے باہمی تعلق، اللہ اور انسان کے باہمی تعلق کی پوری روئید و ادھم بیان کرتی ہے۔ اسی نظام کا نام ”اسلام“ ہے۔ یہ کتاب پتہ دیتی ہے کہ اللہ کے نزدیک اس دنیا میں وارد ہونے والے پہلے انسان سے لے کر قیامت سے پہلے آخری انسان کے وارد ہونے والے انسان کے لئے زندگی گزارنے کا پسندیدہ نظام ”اسلام“ ہے۔ انسانی تاریخ کے مختلف مرحلوں پر انسان خود بے جا مداخلت کر کے مختلف نہتوں کی آزمائشیں دین اسلام کو اسلام کی بجائے دوسرے ناموں سے موسوم کرتے رہے ہیں، جیسے یہودی کی نسبت سے یہودیت اور عیسیٰ کی نسبت سے عیسائیت وغیرہ۔ بالفاظ دیگر یہ خود ساختہ اصطلاحات انسانی اختراعات ہیں، ہمارے خالق کی طرف سے نہیں، لہذا اللہ کے نزدیک ظاہر ہیں، پسندیدہ ہیں۔

دوسری حقیقت یہ کہ اسلام دین ہے مذہب نہیں۔ قرآن مجید میں مذہب کی اصطلاح کہیں استعمال نہیں ہوئی۔ بتائیں دین اور مذہب کی اصطلاحات کو سمجھنا بڑا ضروری ہے۔ قرآن مجید میں دین کی اصطلاح

کوئی معانی میں استعمال کیا گیا ہے لیکن اکثر و بیشتر یہ اصطلاح ”نظام“ یعنی انسانی نظام زندگی کے معنی میں استعمال ہوئی ہے۔ یعنی اللہ انسان کو پابند کرتا ہے کہ وہ اسی نظام زندگی یا دین کو اپنائے جو ”الکتاب“ میں بیان ہوا ہے۔ نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ الکتاب میں بیان کردہ دین کی جو ایک اہم شق ہے وہ انسان کے مقصد تحقیقی کے متعلق ہے نہ کہ صرف مسلمان کے مقصد تحقیقی کے متعلق۔ اللہ کا فرمانا ہے:

”میں نے جہنم اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں“ (ذاریات ۵۶)

اللہ کی بندگی و عبادت کا حق محض چند مراسم عبودیت یعنی نماز روزے وغیرہ سے پورا نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا ہے تو سچی جب زندگی کے ہر شعبہ بشمل سماجی، معاشرتی، معاشی، سیاسی، تعلیمی، عسکری وغیرہ میں اسی قانون اور اسی نظام کے مطابق عمل پیرا ہوا جائے جو الکتاب میں بیان ہوا ہے۔ یہ ہر دائرہ کار میں اللہ کے عطا کردہ قانون کا کارفرما ہونا دین ہے۔ اس کے مقابلہ میں انسان کا چند لحاظ مراسم عبودیت میں گزارنا اور باقی زندگی الکتاب میں بیان کردہ قوانین و ضوابط کی بجائے اپنی من مرضی یا خود ساختہ قوانین کے مطابق گزارنا ”مذہب“ ہے۔ دین پوری انسانی زندگی کو بطور ”کل“ (As a whole) لیتا ہے جبکہ مذہب چند مراسم عبودیت کے علاوہ پوری زندگی کو الکتاب میں بیان کردہ قوانین و ضوابط سے خارج رکھتا ہے۔ یہ بھی کہ مذہب انسانی زندگی کو دو علیحدہ علیحدہ دائرے یعنی مذہبی زندگی اور سیاسی زندگی میں تقسیم کرتا ہے۔ سیکولرزم بھی بڑی حد تک یہی ہے۔ پھر یہ بھی کہ مذہب صرف یہ دو دائرے ہی پیدا نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے حلقہ اثر میں ”مذہبی لوگ“ اور ”سیاسی لوگ“ جیسے دو تین (Distinct) گروہ بھی پیدا کرتا ہے۔

تیسری حقیقت یہ کہ الکتاب میں دی گئی ہدایات قوانین کا سرچشمہ صرف ایک ذات یعنی اللہ وحدہ لا شریک ہے۔ اس نے دنیا میں پہلے پیدا ہونے والے انسان کو زندگی گزارنے کی وہی سہولتیں اور ہدایات دی ہیں جو کہ اس دنیا میں وارد ہونے والے آخری انسان کو۔ اگر فرق کیا ہے تو صرف اتنا کہ جو تمدنی زندگی کے ارتقاء کے وجہ سے۔ اسی لئے اللہ (سرچشمہ ہدایت) نے پوری انسانی تاریخ پر وقفہ وقفہ سے انبیاء وہ رسل کو مبعوث فرمایا جتنا کہ وقت کے ساتھ اگر ہدایات قوانین میں کوئی تبدیلی ضروری ہو تو دین کی تجدید ہوتی رہے

ایسا کرنے کے لئے دو واضح تبدیلیاں کی گئیں:

پہلی تبدیلی یہ کہ پہلی آسمانی کتابیں بشمل زبور، تورات، انجیل وغیرہ میں وہی ہدایات دی گئی تھیں جن پر اس وقت کے تمدنِ ارتقا کے مطابق عمل کرنا ممکن تھا۔ یعنی وقت کے اس مخصوص موڑ پر مائل کردہ ہدایات و قوانین اس وقت کے لئے تو مکمل تھیں لیکن پوری انسانی تاریخ کے لحاظ سے جزوی تھیں۔ مکمل ہدایات جو پورے کوزہ ارض پر محیط ہو سکتی تھیں بعد میں اس وقت آماری گئیں جب تمدنِ ارتقا، خود اس حد تک ٹھہرا کہ پوری دنیا ”ایک گاؤں“ کی صورت اختیار کرنے کو تھی۔ ذرائع ابلاغ اور آمدورفت میں بے مثل انقلاب آنے کو تھا۔

دوسری تبدیلی یہ کہ جب دین اور الکتاب کی تکمیل ہو گئی تو آسمانی کتابوں کی تزیل کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ پھر جب آسمانی کتابوں کی تزیل کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا تو ظاہر ہے مزید انبیاء و رسل کی بعثت کے سلسلے کی ضرورت نہ ہونے کی بنا پر آخری رسول ﷺ بھیج کر اس سلسلے کو بھی منقطع کر دیا گیا۔ اب بقیامت پائے تکمیل کو پہنچنے والی ہدایات و قوانین پر مشتمل الکتاب ”قرآن مجید“ ہے تو انسانی سطح پر مبعوث ہونے والے آخری نبی ﷺ یا بلکہ ظاہرِ نبی کا ناسا ﷺ ”محمد ﷺ“ ہیں۔ پہلے والی کتابیں بھی اقوام کی سطح کی اور جزوی تھیں اور پہلے والے انبیاء بھی انسانیت کی سطح کے نہ تھے بلکہ اپنی اپنی قوم کی طرف مبعوث تھے۔ تکمیلی کتاب اور تکمیلی نبی ﷺ اس وقت متعارف کرائے گئے جب اللہ کی طرف سے یہ اعلان کر دیا گیا کہ:

”آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے“ (مائتہ: 3)

موضوعِ سخن یعنی ”اسلام انسانیت کا دین ہے“ کی طرف آتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید اور سید رسول ﷺ میں بیشتر اصولی ہدایات و قوانین انسانیت کی سطح کے ہیں نہ کہ محض مسلمان کی سطح کے۔ ان میں چند ایک کا ذکر درج ذیل ہے۔

”اے انسانو! بندگی اختیار کرو اپنے اس رب کی جو تمہارا ورثہ سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں ان سب کا خالق ہے تمہارے بچنے کی توقع اسی صورت سے ہو سکتی ہے“ (بقرہ: 21)۔



”ہم نے کہا تم سب (انسان) یہاں سے اتر جاؤ۔ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہو گا اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے“ (بقرہ: 39)

”ابتدا میں سب انسان ایک ہی طریقہ پر تھے۔ (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر اجازت دینے والے اور کج روی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق مازل کی تاک حق کے بارے میں لوگوں کے مابین جو اختلافات پیدا ہو گئے تھے ان کا فیصلہ کرے“ (بقرہ: 213)

”انسانوں کے لئے مرغوبات نفس۔۔۔ عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ذخیرے، چیدہ گھوڑے، موسیقی اور زرعی زمینیں۔۔۔ بڑی خوش آمد بنا دی گئی ہیں، مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں، بہتر ٹھکانہ تو اللہ کے پاس ہے“ (آل عمران: 14)

”اور وہی (اللہ) ہے جس نے ایک معنفس سے تم کو پیدا کیا۔۔۔“ (انعام: 98) ”ہر شخص کا درجہ اس کے عمل کے لحاظ سے ہے اور تمہارا رب لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے“ (انعام: 132)

”اے بنی آدم، ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو۔ کھاؤ، پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو، اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا“ (اعراف: 31)

”اے انسانو! رب کے غضب سے بچو، حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا زلزلہ بڑی (ہولناک) چیز

ہے۔ جس روز تم اسے دیکھو گے حال یہ ہوگا کہ برودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے سے غافل ہو جائے گی نہ ہر حال کا صلہ کر جائے گا اور انسان تم کو مدہوش نظر آئیں گے حالانکہ وہ نشے میں نہ ہونگے بلکہ اللہ کا عذاب ہی کچھ ایسا ہوگا“ (حج: 1-2)۔

”بعض انسان ایسے ہیں جو علم کے بغیر اللہ کے بارے میں بحثیں کرتے ہیں اور ہر شیطان سرکش کی پیروی کرنے سمجھتے ہیں“ (حج: 3)۔

”اے انسانو! اگر تمہیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے پھر نطفے سے پھر خون کے قطرے سے پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل دہائی ہوئی ہے اور بے شکل بھی تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقت مقررہ تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمہیں پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی پوری جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے باوجود پھر کچھ نہ جانے۔ اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے پھر جہاں ہم نے اس پر مینہ برسایا تو یکایک وہ پھل اٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات انگلی شروع کر دیں۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے۔ اور وہ مردوں کو زندہ کرنا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ (اس بات کی دلیل ہے) کہ قیامت کی گھڑی آکر رہے گی اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں اور اللہ ضرور ان لوگوں کو اٹھائے گا جو قبروں میں پڑے ہیں“ (حج: 4-5)

”بعض اور انسان ایسے ہیں جو کسی علم اور ہدایت اور روشنی بخشنے والی کتاب کے بغیر ہر دن اکڑائے ہوئے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں تاکہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بھٹکادیں“ (حج: 8-9)

”اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں

بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم سب سے عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے“ (حجرات: 13)۔

”کیا نہیں آیا انسان پر ایک لامتناہی زمانہ جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا؟ ہم نے انسان کو ایک محفوظ نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لئے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔ ہم نے اسے راستہ دکھایا، خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا“ (دھر: 1-3)

”اے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے اس رب کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا ہے جس نے تجھے پیدا کیا، تجھے تک شک سے درست کیا۔ تجھے مناسب بنایا اور جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ کر تیار کیا؟“ (اعطاف: 6-8)

”ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا“ (بلد: 4)

”ہم نے انسان کو بہترین ساخت میں پیدا کیا“ (القلم: 4)

”جب زمین اپنی پوری عظمت کے ساتھ بلا ڈالی جائے گی اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی اور انسان کہے گا کہ یہاں کو کیا ہو رہا ہے“ (زلزال: 1-3)

”زمانے کی قسم انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے“ (عصر: 1-3)

”تم سارے انسانوں کو پیدا کرنا اور پھر دوبارہ جلا اٹھانا تو بس ایسا ہے جیسے ایک نفس کو (پیدا کرنا اور جلا اٹھانا)۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ سب کچھ دیکھنے والا اور سننے والا ہے“ (لقمان: 28)

-----

کہنے کو تو یہ چند آیات ہیں لیکن ان میں اسلام کا پورا فلسفہ ہے کہ انسان ہے کیا؟ اس کا اپنے پروردگار اور دوسری مخلوق سے کیا تعلق ہے؟ اسکی ابتدا اور انتہا کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ان آیات سے یہ امر دو اور دو چار کی طرح عیاں کہ قرآن مجید کا موضوع ”انسان“ ہے اور یہ کہ ”اسلام انسانیت کا دین ہے“۔ پھر صواب دہی اختیارات (Discretionary Powers) ہونے کی وجہ سے دنیا میں آنے والے انسان چونکہ دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں ایک ماننے والے اور دوسرے نہ ماننے والے قرآن ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ زیر بحث لاتا ہے۔ یعنی آپ کو اس کتاب میں ماننے والوں (مسلم) اور نہ ماننے والوں (غیر مسلم) کا ذکر علیحدہ علیحدہ ملا ہے۔ البتہ ہر ذکر سے مترشح یہی ہوتا ہے کہ ”اسلام انسانیت کا دین ہے“۔ آئیے پہلے دیکھیں کہ قرآن عورت اور مرد کو کس پیرائے کیا حیثیت سے لیتا ہے؟

### اسلامی معاشرے میں مرد اور عورت کی حیثیت

کوئی بھی کمریلو یونٹ یا کمریلو یونٹوں کے مجموعے سے بننے والا معاشرہ مردوں، عورتوں اور بچوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ معاشرے کے نظم، سکون اور راحت کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ مرد و زن کی باہمی حیثیت فطری یعنی اللہ کی وضع کردہ ہو۔ اسلام یعنی دینِ فطرت میں مرد کے مقابلہ میں عورت کی چار حیثیتیں ہیں۔ بطور انسان، بطور جنس، بطور بیوی اور بطور اولاد۔ بطور انسان، اسلام مرد اور عورت کی حیثیت میں رتی بھر فرق نہیں کرتا۔ دونوں کی حیثیت بالکل یکساں۔ ایسا نہیں کہ عورت کوئی اچھا کام کرے تو ویسا ہی اچھا کام کرنے والے مرد کی بہ نسبت اسے کم اجر و ثواب ہو۔ اسی طرح دونوں میں سے کوئی بھی اگر کسی جرم کا ارتکاب کرے تو اسے یکساں سزا کا مستحق قرار دیا جائے گا۔ اس لحاظ سے مرد سے بھی بطور انسان برتاؤ ہوگا تو عورت سے بھی اسی طرح بطور انسان۔ باقاعظ دیگر بطور انسان دونوں ہر لحاظ سے یکساں۔ قرآن مجید میں آیا:

”ان کے رب نے فرمایا ”میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں۔ خواہ مرد ہو یا

عورت، تم سب ایک دوسرے میں سے ہو“ (بقرہ: 195)۔

بطور جنس اسی طرح ان کے دائرہ کار اور ذمہ داریوں میں فرق ہے جیسے کہ ان کی فطری جنس میں فرق ہے۔ بطور جنس، اسلام نے مرد کو ان کاموں کے لئے مختص کیا ہے جو زیادہ دوزدھوپ اور محنت طلب ہیں۔ دونوں کے دائرہ کاری کو اس طرح مختص کیا ہے کہ قدم قدم پر اس کی داد دینا پڑتی ہے۔ گھر کے باہر کے کام روزی کمانے اور دوسرے مشقت کے کام، زمانے بھر میں دوزدھوپ کر کے گھریلو ضروریات کو پورا کرنے کے کام مرد کے سپرد کئے ہیں۔ حمل و زچگی بچوں کی پرورش و دیکھ بھال، گھر میں مرد کے لئے سہولیات مہیا کرنے کی سعادت عورت کے فرائض قرار دیئے ہیں۔ ایسی بے ترتیبی و بے مروتی نہیں کہ عورت بچہ بھی اٹھائے پھرے اور روزی کمانے کے لئے مرد کے شانہ بہ شانہ گنگ و دو بھی کرے۔ عیدید ایسا بھی نہیں کہ مرد سارا دن بیرونی کاموں میں کھینے کے بعد رات بھر بچوں کی نگہداشت بھی کرے، کھانا بھی پکائے، کپڑے بھی دھوئے اور گھر کی صفائی بھی کرے۔ بنا بریں اسلام نے مرد و زن کے دائرہ کار کو ایک دوسرے سے علیحدہ (Distinct) واضح اور ایسا کہ جو ہر ایک کی جسمانی ساخت اور فطری میلان کے عین مطابق ہو دونوں کو مختص کیا ہے۔ تجربہ شہد کہ جن معاشروں نے اس فطری تقسیم میں مداخلت کرتے ہوئے ان کے کام کے ان مخصوص دائرہ ہائے کار کو درہم برہم کیا ہے نہ گھر کے رہنے نہ گھاٹ کے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھر پر باد سکون تباہ، اولاد گمراہ، والدین یوں جیسے بوجھ ہو گئے۔ ترس گئے کون و نکاں گھریلو چابوت اور سکون کو۔ گھروں میں کتوں اور بلیوں نے ڈیرے آجائے۔

بطور بیوی اسلام عورت کو مرد کی معاون قرار دیتا ہے اور یہ بھی ایک بہت بڑی انسانی ضرورت ہے۔ کوئی چھوٹے سے چھوٹا یا بڑے سے بڑا انتظامی یونٹ، تہجی، سہولت و سلجھاؤ رواں دواں رہ سکتا ہے کہ اس کے دو نہیں صرف ایک سربراہ ہو۔ کسی ادارے یا ڈائریکٹوریٹ کے اگر یکساں اختیارات کے حامل دو ڈائریکٹر ہوں تو ایسا ادارہ نہیں چل سکتا۔ بنا بریں اسلام گھریلو یونٹ، جو درحقیقت بہت اہم اور بنیادی یونٹ ہے، میں مرد کو قوام (سربراہ) تو عورت کو اس کا معاون قرار دیتا ہے۔ قرآن میں آیا:

”مرد عورتوں پر قوام ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے۔ اور

اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ پس جو عورتیں صالح ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور مردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت و نگرانی میں ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں“ (نساء: 43)۔

یعنی شوہر کو بیوی کا نگران و محافظ بنایا ہے تو ایک تو اس بنا پر کہ دونوں کے اختیارات یکساں نہ ہوں بلکہ ایک کو دوسرے پر فضیلت ہو یعنی ان میں سے مرد سرکردہ ہو تو عورت اس کی معاون اور دوسرے یہ فضیلت و قوامیت اس لئے کہ خاوند کا ماں ہے تو بیوی اس کی کمائی سے استفادہ کرتی ہے۔ اصل میں مرد کی کمائی میں عورت کی اپنی محنت کا حصہ بھی ہوتا ہے۔ عورت اگر مرد کی معاونت نہ کرے اور گھریلو کام کاج کو نہ سنبھالے تو مرد کا حصہ اس قابل ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ کمائی کرے۔ یعنی بغرض انسانی ضرورت اگر بیوی کو معاون یا گھریلو یونٹ میں نمبر 2 پر رکھا ہے تو اس کا مداوا (Compensation) اس طور کیا ہے کہ بیوی اولاد اور پوزہ سے والدین کا مان و نفقہ مہیا کرنے کی مشقت مرد پر ڈالی جاوے اور عورت کو یہ سہولت باوجود اس کے دی گئی ہے کہ خود وہ وراثت میں بھر در درجہ حصہ دار ہوتی ہے اور بنامیں حامل ملکیت ہوتی ہے۔

بطور بچوں کی ماں تو اسلام نے تینوں کے تینوں تحفے ماں کے سپرد کر دیئے۔ محروم رکھا ہے ان سے تو والد کو۔ ظاہر ہے کسی بھی کھیل یا مشق میں عموماً پہلا دوسرا و تیسرا انعامات یا تمغات ہوتے ہیں۔ اسلام نے یہ تینوں تمغات والدہ کے سینے پر جہاد دیئے ہیں۔ ملاحظہ ہو اس بارے میں نبی رحمت ﷺ کا ارشاد گرامی فرمایا:

”ایک آدمی نے نبی ﷺ سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ”تیری ماں“۔ اس نے کہا پھر کون؟ فرمایا ”تیری ماں“۔ اس نے کہا پھر کون؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ”پھر تیرا باپ“۔ پھر درجہ بدرجہ جو تیرے قریبی لوگ ہیں“ (بخاری، مسلم)۔

یعنی اس معاملے میں اسلام ماں کو نمبر 1 پر رکھتا ہے تو والد کو نمبر 2 پر۔

## طلاق

ایک اور انسانی ضرورت ازدواجی زندگی میں مشکلا ہونے یا شادی کرنے کی ہے تو اس سے بھی اہم بوقت ضرورت شادی کے بندھن کو توڑنے یعنی طلاق کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شادی بہت اہم

لیکن اس سے بھی اہم تر ہے بوقتِ ضرورت طلاق۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی گاڑی کی اصل خصوصیت اس کا چلنا ہے۔ لیکن کسی بھی گاڑی کا چلنا خود موت کا بندوبست کرنا ہے اگر اس میں بوقتِ ضرورت رکنے کی خصلت نہ ہو۔ میاں بیوی انسان ہیں اور بعض اوقات ان کے مابین حالات اس قدر کشیدہ ہو جاتے ہیں کہ دونوں کو بطور میاں بیوی رہنا مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسے میں دورا سہ ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر کسی دوسری جگہ پر رخصتہ ازواج میں منسلک ہو جائیں یعنی چاہیں تو کوئی اور گھر بسالیں۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ انہیں طلاق کی سہولت یا طلاق کے بعد کسی دوسری جگہ شادی کرنے کی اجازت نہ ہو جیسے کہ آج کی دنیا میں کئی معاشروں میں ایسا ہے۔ آخری صورت میں تو خودکشی تک بھی نوبت پہنچ سکتی ہے۔ ”ستی“ کی رسم اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اسلام نے انسان کی اس ضرورت کو بطریقہ حسن پورا کیا ہے یعنی بوقتِ ضرورت طلاق کی بھی اجازت دی ہے تو طلاق کے بعد مرد و زن ہر ایک کو کسی دوسری جگہ رخصتہ ازواج میں منسلک ہونے کی بھی۔ بایں حمد اللہ تعالیٰ کو جائز کاموں میں سب سے زیادہ کوئی کام مایہ ناز ہے تو ”طلاق“۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ایک انسانی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے طلاق کی اجازت تو دی ہے لیکن آخری چارہ کار کے طور پر۔ اسلام طلاق کی نوبت تک پہنچنے کے لئے متعدد مصالحتی اقدامات کی سفارش کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ کس طرح میاں بیوی کے علیحدہ ہونے کا مرحلہ نل جائے۔ ذیل میں ہم ایسے چند اقدامات کا ذکر کرتے ہیں:

☆ سب سے پہلے شوہر کو خطاب کر کے ہمیشہ ہمیش کے لئے تاکید کی گئی کہ بیوی کی خصلت میں کوئی کمی ہو تو اس کا حل یہ برگز نہیں کہ فوراً علیحدگی اختیار کر لی جائے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہو سکتا ہے کہ دور ہو جائے یا اس کمی کے ہوتے ہوئے اس کو اللہ تعالیٰ نے دوسری ایسی خوبیاں دے رکھی ہوں کہ اس ایک کمی کا احساس ہی نہ رہے۔ چنانچہ قرآن میں آیا:

”اے لوگو جو ایمان لائے ہیں ان بیویوں کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں مایہ ناز ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اسی میں بہت بھلائی رکھ دی ہو“ (نساء: 19)۔

☆ بیوی کو بھی صلح جوئی اور مصالحت کی طرف راغب کیا فرمایا:

”جب کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رخی کا خطرہ ہو تو کوئی مضا کھ نہیں اگر میاں اور بیوی (کچھ حقوق کی کمی بیشی پر) آپس میں صلح کر لیں۔ صلح بہر حال بہتر ہے۔ نفس تنگ دلی کی طرف جلدی مائل ہو جاتے ہیں لیکن اگر تم لوگ احسان سے پیش آؤ اور خدا ترسی سے کام لو تو یقین رکھو اللہ تمہارے اس عمل سے بے خبر نہ ہوگا۔“ (نساء: 128)۔

☆ اکٹھے رہتے ہوئے چھوٹی موٹی تو شکایات پیدا ہوتی رہتی ہیں لہذا میاں بیوی دونوں کو تلقین کی کہ وہ باہم فیاضانہ برتاؤ کا رویہ اپنائیں۔ فرمایا:

”آپس کے معاملات میں فیاضی کو نہ بھولو۔ تمہارے اعمال کو اللہ دیکھ رہا ہے۔“ (بقرہ: 237)۔

☆ رنجش و ناراضگی کی صورت میں اگر بات گھر سے باہر نکل جائے تو اسلام پھر بھی زوجین کو دھیرے دھیرے قریب لانے کی کوشش کرنا اور طلاق کی نوبت کو حتی الوسع مانے کی کوشش کرنا ہے۔ ایسے میں وہ عائشی طریقے کی تلقین کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا:

”اور اگر تم لوگوں کو کہیں میاں اور بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک حکم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کر دو وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کی صورت نکال دے گا۔ اللہ سب کچھ جانتا اور باخبر ہے۔“ (نساء: 35)۔

مطلب یہ ہے کہ میاں اور بیوی میں سے ہر ایک کے خاندان کا ایک ایک فرد مصالحت کے لئے مقرر کیا جائے۔ وہ دونوں معاملے کی تحقیق کریں کہ خرابی کہاں ہے؟ پھر اس خرابی کو حتی المقدور رفع کرنے کی کوشش کریں تا کہ نزاع سے اھطاع کی صورت پیدا نہ ہو۔

ان تمام احتیاطی و مصالحتی اقدامات کے باوجود اگر طلاق کی نوبت آئی جائے تو اسلامی تعلیمات یہ ہیں کہ مرد طلاق ایام ماہواری میں نہیں ایام طہر میں دے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دی۔ حضرت عمرؓ نے اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا۔ آپ ﷺ اس واقعہ پر بہت ناخوش ہوئے اور فرمایا: عبداللہ اپنی بیوی کو واپس کرے اور اس کو چاہیے کہ وہ اس کو اپنے پاس رکھے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائے۔ اس کے بعد طلاق



دینا ضروری ہو تو پاک ہونے کی حالت میں اس کو طلاق دے دے اور اس عرصہ میں اس کو ہاتھ نہ لگائے۔“  
(مشکوٰۃ)

ایسا اس لئے کیا کہ ایام طہر میں میاں بیوی میں رضا مندی کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں۔ مصلحت اس میں یہی ہے کہ کسی طرح وقوع طلاق ٹل جائے۔ طلاق دینے کا جو طریقہ اختیار کیا وہ خود اس مصلحت کو چھپائے ہوئے ہے کہ کسی طرح جدا ہونے والے میاں بیوی کھوت کر کے پھر جو جائیں۔ چنانچہ مجموعی طلاق خود تین طلاقوں پر مشتمل ہے۔ اور ان تین طلاقوں میں وقفہ سالہا سال کا بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ایک صحابی رکانہ نے اپنی بیوی کو عہد رسالت میں طلاق دی لیکن جلد ہی رجوع کر لیا۔ پھر عمرہ کے عہد خلافت میں دوسری دفع طلاق دی اور قریب میں ہی رجوع کر لیا۔ تیسری طلاق انہوں نے حضرت عثمان کے دور میں دی (مشکوٰۃ)۔ مطلب یہی کہ طلاق کا کڑوا گھونٹ نہ ہی پیا جائے تو بہتر۔ اس لئے کہ اصل ضرورت تو کھر کو بسا ہے نہ کہ ویران کرنا۔

یاد رہے تیسری دفع طلاق دینے سے باہم رجوع کرنے کی سہولت ختم ہو جاتی ہے جب تک کہ عورت کسی دوسری جگہ شادی نہ کرے اور دوسری جگہ سے کسی وجہ سے اسے طلاق ٹل جائے۔ ایسا اس لئے کیا گیا کہ طلاق کہیں محض اذیت کا ذریعہ نہ بن جائے جیسے کہ دور جہالت میں ایسا ہی تھا۔ پھر اسلام یہی نہیں کرتا کہ سخت گرفت کرنا ہے مگر طلاق کو ضرر رسانی کا ذریعہ بنایا جائے بلکہ وہ لازم قرار دیتا ہے کہ مطلقہ عورت کی کہیں اپنی مرضی سے شادی کرنے میں رکاوٹ نہ بن جائے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

”اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو تو یا بھلے طریقے سے انہیں روک لو یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔ محض ستانے کی خاطر انہیں نہ روکے رکھنا کہ یہ زیادتی ہوگی اور جو ایسا کرے گا وہ درحقیقت آپ اپنے پر ہی ظلم کرے گا۔ اللہ کی آیات کا کھیل نہ بناؤ۔“ (بقرہ: 231)۔

قربان جائیں اسلام کی انسانیت پروری پر وہ تو جدا ہونے والی ساہتہ بیوی سے حسن سلوک کی تاکید کرتا ہے۔ قرآن میں آیا:

”جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو انہیں بھی مناسب طور پر کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جائے یہ حق

ہے متقی لوگوں پر“ (نقرہ: 241)۔

ایک اور جگہ پر حسن سلوک کی تلقین کی۔ فرمایا: ”اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے کا ارادہ ہی کر لو تو خواہ تم نے اسے (جدا ہونے والی بیوی) ذخیرہ سارا مال ہی کیوں نہ دیا ہو اس میں سے کچھ واپس نہ لے لیا۔ کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لو گے؟ اور آخر تم اسے کس طرح لے لو گے جب کہ تم ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چکے ہو اور وہ تم سے پختہ مہر لے چکی ہے“ (نساء: 20-21)۔

### قیموں کی فلاح و بہبود کا فکر

یہ انسانی سانچہ ہے کہ جدا ہونے والے مرد کو بھی کوئی اور عورت مل جاتی ہے اور جدا ہونے والی عورت کو بھی کوئی اور مرد مل جاتا ہے۔ اصل خسارہ ہوتا ہے یا مشکل میں پڑتے ہیں تو بچے جو حقیقی والدین کے سایہ سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اسلام نے جیسے کہ انسانی تقاضا ہے اس مسئلے کو بھی نہ صرف اپنا موضوع بنایا ہے بلکہ اس کو حل کرنے کی مقدور ہر کوشش بھی کی ہے۔

احرام انسانیت کی یا انتہا ہے کہ یتیم بچے خواہ طلاق کی صورت میں وجود پذیر ہوں یا والد کی وفات کی صورت میں اسلام ان کی بہبود و بقا کی فکر اس وقت سے کرتا ہے جب ابھی وہ رحم مادر میں ہوں۔ اسلام نے اس مقصد کے لئے ایک خاص نظام وضع کیا ہے جسے وہ مدت کا نام دیتا ہے۔ مدت اس پیرئہ کا نام ہے جو طلاق یافتہ عورت یا بیوہ عورت کو دوسری شادی کرنے سے پہلے شادی کے انتظار میں اس لئے گزارا ہوتا ہے کہ صراحت سے واضح ہو سکے کہ عورت کیا حاملہ تو نہیں؟ حاملہ ہونے کی صورت میں تو اسے تا وضع حمل و بچائی صحت دوسری شادی کرنے کی اس لئے اجازت نہیں ہے کہ بچے کی ولدیت اور حق وراثت متاثر نہ ہوں۔ دوسری شادی تو درکنار دورانِ عدت عورت کو مزید نسبت طے کرنے یا دو ٹوک دوسرے مرد سے متعلق کرنے کی اجازت نہیں یعنی اسلام یہ بھی گوارا نہیں کرتا کہ جب بچہ پیٹ میں ہو تو عورت کی رگوں میں دو محبتوں یعنی سابقہ شوہر اور ہونے والے شوہر کی محبت بھرا خون گردش کرے۔ اس لئے کہ اس سے ہونے والے بچے کا وصال پر فرق پڑتا ہے یا دوسرے لفظوں میں اس کی حق تلفی ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا:

”زمانہ عدت میں خواہ تم ان عورتوں کے ساتھ متعلق کا ارادہ اشارے کنایے میں ظاہر کر دو خواہ دل

میں چھپائے رکھو دونوں صورتوں میں کوئی مضا کھ نہیں اللہ جانتا ہے کہ ان کا خیال تو تمہارے دلوں میں آئے گا ہی مگر دیکھو! خفیہ مہدو بیان نہ کرنا اگر کوئی بات کرنی ہے تو معروف طریقے سے کرو اور عقد نکاح باندھنے کا فیصلہ اس وقت تک نہ کرو جب تک کہ عدت پوری نہ ہو جائے۔ خوب سمجھ لو کہ اللہ تمہارے دلوں کا حال تک جانتا ہے۔ لہذا اس سے ڈرو اور یہ بھی جان لو کہ اللہ بردبار ہے چھوٹی چھوٹی باتوں سے درگزر فرماتا ہے۔“ (بقرہ: 235)۔

یہ تو ہوئی یتیم کے حقوق کی اس وقت کی بات جب وہ ابھی رحم مادر میں ہے لیکن اسلام جیسے کہ انسانی مطالبہ ہے یتیموں کی پرورش، دیکھ بھال اور مفادات کی لواحقین و متعلقین کو یزیدی ناکید۔ بعض اوقات تو جذباتی انداز میں ناکید کرنا ہے۔ اس سلسلے میں ہم چند آیات و احادیث کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ترتیب کے لحاظ سے سب سے پہلے ان بچوں کی رضاعت کا مسئلہ حل ہونا چاہئے جن کے والدین غلیہ ہو چکے ہوں۔ اسلام اس انسانی ضرورت کو بطریق احسن پورا کرتا ہے۔ قرآن مجید میں آیا:

”جو باپ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد پوری مدت رضاعت تک دودھ پیے تو مائیں اپنے بچوں کو کابل دو سال دودھ پلائیں۔ اس صورت میں بچے کے باپ کو معروف طریقے سے انہیں کھانا کپڑا دینا ہوگا۔ مگر کسی پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بار نہ ڈالنا چاہئے۔ نہ تو ماں کو اس وجہ سے تکلیف میں ڈالا جائے کہ بچہ اس کا بھروسہ نہ ہی باپ کو اس وجہ سے ٹھک کیا جائے کہ بچہ اس کا ہے۔ دودھ پلانے والی کا یہ حق جیسے بچے کے باپ پر ہے ویسا ہی اس کے وارث پر بھی ہے۔ لیکن اگر فریقین باہمی رضامندی اور مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ایسا کرنے میں کوئی مضا کھ نہیں۔ اور اگر تمہارا خیال اپنی اولاد کو کسی غیر عورت سے دودھ پلوانے کا ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس کا جو معاوضہ ملے کرو وہ معروف طریقے پر ادا کرو۔ اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، سب اللہ کی نظر میں ہے۔“ (بقرہ: 233)۔

پھر اسلام یتیم بچوں کی عمومی فلاح کا ذکر کرتا ہے فرمایا:

”اور یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے سر رشد کو پہنچ جائے۔“ (انعام: 152)۔

”قیموں کے مال ان کو واپس دو۔ اچھے مال کو بڑے سے نہ بدل لو اور ان کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھا جاؤ۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے“ (نساء: 2)۔

”اور قیمتوں کی آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کے قابل عمر کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر تم ان کے اندر رابلیت پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔ ایسا کبھی نہ کرنا کہ جدا انصاف سے تجاوز کر کے اس خوف سے ان کے مال جلدی جلدی بڑپ کر جاؤ کہ وہ بڑے ہو کر اپنے حق کا مطالبہ کریں گے۔ یتیم کا سر پرست جو مال دار ہو وہ پرہیزگاری سے کام لے اور جو غریب ہو وہ معروف طریقے سے معاوضہ کمائے۔ پھر جہان کے مال ان کے حوالے کرنے لگو تو لوگوں کو اس پر گواہ بنالو (یاد رکھو) حساب لینے کے لئے اللہ کافی ہے۔“ (نساء: 6)۔

”اور تقسیم وراثت کے موقع پر کتبہ کے لوگ اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی دو اور ان کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو۔ لوگوں کو اس بات کا خیال کر کے ڈرا چاہئے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت ان کو اپنے بچوں کے حق میں کیسے کچھ اندیشے لاحق ہوتے۔ پس چاہیے کہ وہ اللہ کا خوف کریں اور راستی کی بات کریں۔ جو لوگ ظلم کے ساتھ قیمتوں کے مال کھاتے ہیں وہ درحقیقت اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جمو گے جائیں گے“ (نساء: 8-10)۔

”اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ قیمتوں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو اور جو بھلائی تم کرو گے وہ اللہ کے علم سے چھپی نہ رہ جائے گی۔“ (نساء: 127)۔

ان آیات و احادیث سے اندازہ لگائیں اسلام کی انسانیت پروری کا کراسے ان بچوں کی فلاح و بہبود کا کس قدر فکر ہے جو کسی طور والدین، والد یا والدہ کے سایہِ ماضیت سے محروم ہو جائیں۔ اس کے مقابلہ میں آج ہمارے سامنے ان معاشروں کی بے رشتی، نیکی اور بد قسمتی کا حال دیکھیں جو جیتے جی اور ہستے ہستے اپنی اولاد کو ایک بوجھ سمجھتے ہوئے چلتا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کی یہ بھول اور ان کا یہ غیر فطری عمل بالانجام ان کے اور ان کی اولاد کے لئے تباہ کن ہوتا ہے۔ کتنے معاشرے کتنی بستیاں اور کتنے گھر آج اس لئے ویران پڑے

جس کو اولاد کو ان کے والدین نے خلیے بہانے پانے سے انکار کر رکھا ہے۔

یہ تو جوئی صرف قیہوں کی بات لیکن کسی بھی معاشرے میں مالی طور پر کمزور رشتے دار مالی طور پر کمزور عوام قیدی مسافر، مسایہ وغیرہ جیسے پسماندہ و در ماندہ طبقات ہوتے ہیں۔ انسانی ضرورت ہے کہ ایسے تمام طبقات کی فلاح و بہبود کا بھی فکر کیا جائے۔ اسلام بطور انسانیت کا دین ان تمام طبقات کے دکھوں کا ماحضہ مدا کرتا ہے۔

پوری انسانی تاریخ پر اللہ کے نزدیک پسندیدہ دین چونکہ اسلام ہی تھا اور ہے۔ یہود و نصاریٰ وغیرہ نے انحراف کرتے ہوئے اس کو مختلف نام دے دیئے۔ قرآن بتاتا ہے کہ خود یہود کو ان طبقات کی فلاح و صلاح کی تاکید کی گئی۔ قرآن میں آیا:

”یا ذکرہ اسرائیل کی اولاد سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ رشتے داروں کے ساتھ قیہوں اور مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا، لوگوں سے بھلی بات کہنا، نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا مگر تھوڑے آدمیوں کے سوا تم سب اس عہد سے پھر گئے اور اب تک پھرے ہوئے ہو۔“ (بقرہ: 83)۔

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”میں اور یتیم کا سرپرست یتیم چاہے اس کا رشتہ دار ہو یا اجنبی جنت میں اس طرح ہونگے۔ آپ ﷺ نے اپنی دو انگلیاں ملا کر بتایا۔“ (مسلم۔ موطا امام مالک)۔

”نبی ﷺ نے فرمایا: ”مسلمانوں کے گھروں میں سے بہترین گھر وہ ہے جس میں یتیم ہو اور اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جاتا ہو۔ اور مسلمانوں کے گھروں میں سے برا گھر وہ ہے جس میں یتیم ہو اور اس کے ساتھ بد سلوکی کی جاتی ہو۔“ (ابن ماجہ۔ مسند احمد)۔

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جو شخص تین قیہوں کی معاشی کفالت کرتا ہے وہ اس شخص کی مانند ہے جو رات کو قیام کرتا ہے اور دن میں روزے رکھتا ہے اور صبح و شام اللہ کی راہ میں تلواریں سونٹے رکھتا ہے۔ میں اور وہ جنت میں دو انگلیوں کی طرح کھٹھے ہونگے۔“ (ابن ماجہ)

”ایک آدمی نے نبی ﷺ سے شکایت کی کہ میرا دل سخت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ”یتیم کے سرپر

ہاتھ پھیرا اور مسکین کو کھانا کھلا۔“ (مکتوۃ)

## قیموں کے علاوہ دوسرے محتاجوں کی فلاح و بہبود

جیسے کہ انسانی ضرورت ہے، اسلام صرف قیموں کی دیکھ بھال کا ذکر ہی نہیں کرتا اسے ہر اس فرد اور طبقے کی بھلائی و نفا کی فکر ہے جو کسی طور کمزور و نادار اور اس قابل نہ رہے کہ سلسلہ جسم و جاں اپنی کمائی سے کما حقہ قائم رکھ سکے۔ چنانچہ اسے بوڑھے والدین کا بھی فکر ہے، غربت زدہ رشتے داروں کا بھی، قیدیوں کا بھی، مسافروں کا بھی، غریبہ برہان حاجت کا۔ قرآن و سنت میں سے چند احکامات و ہدایات کا ذکر ذیل میں کرتے ہیں:

”یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لئے ہیں اور ان لوگوں کے لئے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور ان کے لئے جن کی تالیف قلوب مطلوب ہو۔ نیز یہ گردنوں کو چھڑانے، قرضداروں کی مدد کرنے، اللہ کی راہ میں لگانے اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لئے ہیں۔ یہ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بیبا ہے“ (توبہ: 60)۔

”یہ کبھی نہ ہوگا کہ اللہ کی راہ میں تھوڑا یا بہت کوئی خرچہ و اٹھائیں اور (سچی و جہاد میں) کوئی وادی پار کریں اور ان کے حق میں سے لکھ نہ لیا جائے“ (توبہ: 121)۔

”تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک اپنی وہ چیزیں (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے بے خبر نہ ہوگا“ (آل عمران: 92)۔

”نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے شرق کی طرف کر لئے یا مغرب کی طرف بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی مازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں، قیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر مدد کے لئے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے۔ نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور نیک و ہلک ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں اور نیکی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں مہر کریں۔ یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی متقی ہیں“ (بقرہ: 177)۔

”لوگ پوچھتے ہیں ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو کہ جو مال بھی تم خرچ کرو اپنے والدین پر، رشتے داروں پر، قیموں، مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو اور جو بھلائی بھی تم کرو گے اللہ اس سے باخبر ہے“ (بقرہ: 215)۔

”جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات ہائیس ٹنلیں اور ہربائی میں سودا کرنے ہوں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ جس کے عمل کو چاہتا ہے جافزونی عطا فرماتا ہے۔ وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کر کے پھر احسان نہیں جتاتے نہ کھدیتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لئے کسی رنج اور خوف کا موقع نہیں“ (بقرہ: 261-262)۔

”(خاص طور پر مدد کے مستحق وہ لوگ ہیں) جو اللہ کے کام میں ایسے گھر گئے ہیں کہ اپنے ذاتی کسب معاش کے لئے زمین میں کوئی دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ ان کی خودداری دیکھ کر اوقف آدمی گمان کرنا ہے کہ یہ خوش حال ہیں۔ تم ان کے چروں سے ان کی اندرونی حالت پہچان سکتے ہو۔ مگر وہ ایسے لوگ نہیں ہیں کہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کچھ مانگیں۔ ان کی امانت میں جو کچھ مال تم خرچ کرو گے وہ اللہ سے پوشیدہ نہ رہے گا“ (بقرہ: 273)۔

”درناک سزا کی خوشخبری دو ان کو جو سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیٹانیاں اور پہلوؤں اور ٹخنوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا“ (لوہ: 34-35)۔

یہ چند جدید چیدہ آیات اس لئے بیان کی گئی ہیں کہ اندازہ لگائیں اسلام کے انسانیت کے دین ہونے کا کہ ایک طرف وہ جن جن کران محتاجوں کی نشتاندی کرتا ہے جو کسی نہ کسی طور مالی مدد کے مستحق قرار پاتے ہیں تو دوسری طرف دولت مندوں کے لئے واجب قرار دیتا ہے کہ وہ ان مستحقین کی مدد کریں۔ بالفاظ دیگر اسلام دولت مندوں کی دولت میں غرباء و مساکین وغیرہ کا حصہ اسی طرح فرض کرتا ہے جس طرح کہ وراثت میں

حصہ داروں کا۔ چنانچہ قرآن مجید میں دو ٹوک آیا ہے، فرمایا:

”انسان تھرو لاپیدا کیا گیا ہے، جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو نکل کر نکلنے لگتا ہے مگر وہ لوگ (اس عیب سے بچے ہوئے ہیں) جو نماز پڑھنے والے ہیں، جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں، جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے، جو روز جزا کو برحق مانتے ہیں“ (معارف: 19-26)۔

یہاں پر ایک اور انسانی ضرورت سامنے آتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مدد کئے جانے والے کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔ اسلام کا طریق کار یہ ہے کہ صدقات و زکوٰۃ دینے والے براہ راست اپنی رقوم محتاجوں کو نہیں بلکہ وہ یہ رقوم بیت المال میں جمع کرائیں جس کی شاخوں کا پوری اسلامی دنیا میں جال بچھا ہو۔ یہ خلافتِ وقت کا کام ہے کہ وہ بیت المال سے وظائف کی شکل میں مقررہ مارج کو مستحقین تک مختص رقوم پہنچائے۔ یہ بھی کہ کھانا وغیرہ کی شکل میں اگر کوئی دولت مند کسی حاجت مند کی ضرورت کو براہ راست پورا کرنا ہے تو تاکید کر دی کہ وہ احسان جانے اور بیگار لینے جیسی حرکات سے باز رہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا:

”اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان بنا کر اور دکھ دے کر اس شخص کی طرح خاک میں نہ ملا دو جو اپنا مال محض لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے، نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور نہ آخرت پر“ (بقرہ: 264)۔

یہ احسان کا جتنا اور اذیت دینا ہی گوارا نہ کیا، ایک مینھا بول اور ذرا سی چشم پوشی کو خیرات سے زیادہ احسن قرار دیا۔ فرمایا:

”ایک مینھا بول اور کسی مگوار بات پر ذرا سی خاموشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو۔ اللہ بے نیاز ہے اور برہماری اس کی صفت ہے“ (بقرہ: 263)۔

اسلام ”ایک پتھر دو کاف“ کے مصداق صدقہ کو بطور کفارہ استعمال کرنے کی ترغیب دیتا ہے تاکہ گناہوں کا بھی قلع قمع ہو اور غریب کی مدد بھی ہو۔ چنانچہ ارشادِ رب کائنات ہے:

”تورات میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ،



ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لئے برآمد کا بدلہ۔ پھر جو کوئی قصاص کا صدقہ کر دے تو وہ اس کے لئے کفارہ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے مازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں“ (مانندہ: 45)۔

قسم توڑنے تک کا مداوا اتفاق فی سبیل اللہ قرار دیا۔ فرمایا:

”تم لوگ جو مہمل قسمیں کھاتے ہو ان پر اللہ گرفت نہیں کرتا، مگر جو قسمیں تم جان بوجھ کر کھاتے ہو ان پر ضرورت سے مواخذہ کرے گا۔ (ایسی قسم توڑنے کا) کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو وہ اوسط درجے کا کھانا کھلاؤ جو تم اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہو یا انہیں کپڑے پہناؤ، یا ایک غلام آزاد کرو اور جو اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھے“ (مانندہ: 89)۔

انسان کی ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ بوقت ضرورت اسے قرض حاصل ہو لیکن وہ قرض جس میں سود کا عمل دخل ہو انسان کے لئے وبال جان بن جاتا ہے۔ لہذا اسلام نے سود کو دو ٹوک حرام قرار دیا۔ فرمایا:

”جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا غم نہیں مگر جو لوگ سود کھاتے ہیں ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر بلاؤ لا کر دیا ہو اور اس حالت میں ان کے مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں ”تجارت بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے“ حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔ لہذا جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ فیصحت پہنچے اور آئندہ کے لئے وہ سود خوری سے باز آجائے تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا، سو کھا چکا، اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے اور جو اس حکم کے بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ کرے وہ جہنمی ہے جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ (بقرہ: 275)۔

سود کی بجائے اللہ قرض کے لئے ایک حسن اصطلاحی ایجاد نہیں کرتا بلکہ اسے ”قرض حسن“ قرار دے کر یہ بھی قرار دیتا ہے کہ قرض دینے والا اللہ کو قرض حسن دیتا ہے جسے اللہ کئی گنا بڑھا کر واپس کرتا ہے۔ فرمایا:

”تم میں کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس کرے؟ گھٹانا

بھی اللہ کے اختیار میں ہے اور بڑھانا بھی اور اسی کی طرف ہم کو پلٹ کر جانا ہے“ (بقرہ: 245)۔

غریب و مساکین وغیرہ کی مالی اعانت کے لئے نبی کائنات ﷺ کی بھی بہت سی احادیث مبارکہ ہیں۔ ہم طوالت سے بچنے کی خاطر ان احادیث میں سے صرف ایک حدیث کا تذکرہ یہاں پر کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

”بیوہ اور مسکین کے لئے دوڑ دھوپ کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے“ (بخاری و مسلم)۔

### انسان کی دیگر ضروریات

انسان اللہ تعالیٰ کی فیکٹری کا پروڈکٹ ہے۔ وہی اصل جانتا ہے کہ ضروریات کوئی ہیں اور ان کو پورا کیسے کرنا ہے۔ ہم چند ایسی ضروریات اور ان کے پورا کئے جانے کا ذیل میں ذکر کرتے ہیں:

### دھاندلی سے مال ہڑپ کرنے کی ممانعت

دھاندلی اور نیراپھیری سے خواہ مال حاصل کیا جائے، الیکشن جیتا جائے یا کوئی عہدہ وغیرہ حاصل کیا جائے کوئی معاشرہ اس کی اجازت نہیں دیتا اور اگر دیتا ہے تو وہ معاشرہ ایسا بچ بوتا ہے کہ جو سویرا بدیر اس کی تباہی پر بچ بوتا ہے۔ ہر انسان خواہ وہ عربی ہو یا عجمی کالا ہو یا گورا عورت ہو یا مرد بیوی ہو یا خائفہ شامہ ہو یا گدا آجر ہو یا اجیر کبھی یہ سوچ نہیں سکتا کہ اس کا انجام بالآخر برا ہو۔ اسلام واضح اور دونوں طرف بدلتا دیتا ہے۔ قرآن مجید میں آیا:

”اور تم لوگ نہ تو ایک دوسرے کے مال مارو طریقہ سے کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے ان کو اس غرض کے لئے پیش کرو کہ تمہیں دوسروں کے مال کا کوئی حصہ قصداً ظالمانہ طریقے سے کھانے کا موقع مل جائے“ (بقرہ: 188)۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ، نہ کھو اپنے آپ کو خود قتل نہ کرو۔ یقیناً ان کو اللہ تمہارے اوپر مہربان ہے“ (نساء: 29)۔

ان آیات مبارکہ میں ایک بھی ایک معاشرتی روگ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص اگر اپنی جہ بیاہنی سے یا جھوٹی گواہیاں بگلتا کر کوئی ایسی چیز حاصل کر لیتا ہے جو حقیقتاً اس کی نہیں تو وہ کئی معاشرتی بے رابطگیوں بے اعتدالیوں اور دھاندلیوں کی نشو و نما کا ذریعہ بنتا ہے۔ پہلے یہ کہ وہ ایسا مال حاصل کرتا ہے جو اصل میں اس کا نہیں۔ پھر اس بے ربط طریقے سے حاصل کردہ مال کو بالکلے تلے اڑاتا ہے جو خود بڑی بے اعتدالی ہے۔ پھر جس شخص کا مال وہ حلق کھاتا ہے ظاہر ہے وہ متغیر رہتا ہے اور کسی نہ کسی طور اس کا بدلہ لینے کے درپے ہوتا ہے۔ جتنے کسی معاشرے میں ایسے کیس ہو گئے اتنی ہی اس معاشرے میں کشیدگی، سرکشی اور جذبہ انتقام کا دور دورہ ہوگا۔ سب سے بڑا خسارہ یہ کہ جب دھاندلی سے بڑپ کرنے والا شخص اپنے رب کے پیش ہو گا تو ایک غامب کی حیثیت سے یعنی سزاوار سزا۔

کس قدر احسان اسلام کا اور کس قدر اس کی انسان پروری کا اس نے پہلے ہی قدم پر دھاندلی سے مال بڑپ کرنے کی ممانعت کر دی۔ بلکہ اس نے ایک قدم آگے اٹھایا، جب یہ فرمایا کہ ”جو کچھ اپنے لئے پسند کرو وہی دوسرے کے لئے پسند کرو“ کوئی شخص یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ دھاندلی ہو، کیسے وہ دھاندلی کرے گا کسی دوسرے سے؟

احسان کا طریقہ اختیار کرو

قرآن مجید میں آیا:

”احسان کا طریقہ اختیار کرو کہ اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے“ (بقرہ: 195)۔

یا احسان کیا ہوتا ہے؟ اس کو ایک مثال سے سمجھیں۔ فرض کریں ایک شخص نے دوسرے شخص سے ایک کلو دودھ مانگا۔ دودھ کے مالک نے مانگنے والے کو ایک کلو دودھ بھی دیا اور ایک پاؤ اپنی طرف سے زائد دے دیا۔ اب یہ زائد کا دینا ایک بات تو یہ ظاہر کرتا ہے کہ دینے والے نے وہ کلو دودھ بھی بخوشی دیا، کسی جبر سے نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس نے مانگنے والے کے اس عمل کو برا نہیں جانا بلکہ اس کی قدر کی۔ یہی احسان ہے۔ اسے ہم یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ ایک تو ہے کہ کسی کام کا کرنا۔ ایسا کرنا محض کرنا بھی ہو سکتا ہے اور چاروا چار کرنا بھی۔ لیکن جب کرنے والا اس کام کو پوری دلچسپی، لگن اور خوبی سے کرے تو یہی احسان ہے۔

لیکن یہاں پر اللہ تعالیٰ یعنی انسان کی سرشت کو کما حقہ سمجھنے والے نے متنبہ بھی فرمایا کہ احسان کرنے والا اس حد تک آگے نہ جائے کہ وہ مائی طور پر خود کو کمال اور جسمانی طور پر اپنی صحت گنوا دے۔ چنانچہ مذکورہ آیت ہی کے پہلے حصے میں فرمایا:

”اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو بلاکت میں نہ ڈالو“

آیہ مبارکہ کے اس حصے کا ایک مطلب تو وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا لیکن اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ دین کی سر بلندی کی جدوجہد میں اگر تم خرچ نہ کرو گے تو یہ دنیا و آخرت دونوں میں بڑے خسارے کا سودا ہے۔ یعنی اس دنیا میں مغلوبیت اور آخرت میں مقدر ہوگا تو شدید ترین عذاب۔

اسلام کا کس قدر احسان اور اس کی کس قدر انسان پروری کہ وہ دھاندلی والے معاشرے کی نفی کرنا ہے تو دوسری طرف ایسے معاشرے کو جو دین میں لانے کا داعی ہے کہ جو ”احسان“ پر مبنی ہو۔ یا درہے اسلام تو مخالفین تک سے احسان کرنے اور انہیں معاف کرنے کا درس دیتا ہے۔ فرمایا:

”ان (مخالفین) کو معاف کرو اور ان کی حرکات سے چشم پوشی کرتے رہو، اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو احسان کی روش اختیار کرتے ہیں“ (مائدہ: 13)۔

## حق تلفی کی ممانعت

اسلام کی انسانیت پروری کا اندازہ اس سے لگائیں کہ آپ کو حقوق کی اس قسم کی تقسیم کہ (۱) حقوق اللہ (۲) حقوق العباد اور (۳) حقوق النفس بدوں اسلام دنیا بھر کے لڑ پچڑ میں کہیں نہیں ملے گی۔ یہ بھی اسلام ہی کا اعزاز ہے کہ حق تلفی خواہ اللہ کی ہو، بندوں کی ہو یا خود کسی انسان کی اپنے آپ سے اسلام اسے ظلم قرار دیتا ہے۔ حق تلفی کا مطلب ہی یہ ہے کہ جس کا حق ہوا سے تو ادا نہ کیا جائے اور اس کی بجائے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا حق کسی اور کی طرف لوٹا دیا جائے اور ظاہر ہے ایسا کرنا ظلم ہی تو ہے۔ تفصیل ملاحظہ ہو:

## 1۔ حقوق اللہ

اسلام نے جیسے کہ ہونا چاہیے، حقوق اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے حقوق کو سرفہرست رکھا ہے۔ بندوں کی طرف سے حقوق اللہ ادا کرنے کا مطلب ہے کہ بندے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کو کما حقہ اسی طرح تسلیم

کریں جیسے کہ وحی پر مبنی تعلیمات و ہدایات نے اس ہستی کا پتہ دیا ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات ایسی ہیں کہ جو کلیۃً اس کی ذات و صفات کا ہی پتہ دیتی ہیں۔ پھر کتاب اللہ کی بیشتر آیات اس کی صفات پر اختتام پذیر ہوتی ہیں۔ جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ہے ہم یہاں پر صرف تین مقامات سے اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ آیت الکرسی میں فرمایا:

”اللہ زندہ جاوید ہستی جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ وہ نہ سوتا ہے اور نہ اے اگلے لگتی ہے۔ زمین اور آسمان میں جو کچھ بھائی کا ہے۔ کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے۔ جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے، اس سے بھی وہ واقف ہے اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز ان کی گرفت اور اک میں نہیں آ سکتی الا یہ کہ کسی چیز کا ظلم وہ خود ان کو دینا چاہے۔ اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور ان کی تنبیہانی اس کے لئے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں ہے۔ پس وہی ایک بزرگ و برتر ذات ہے“ (بقرہ: 255)۔

سورہ خلاص میں آیا:

”کہو! وہ اللہ ہے یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد اور کوئی اس کا مسر نہیں ہے۔“

سورہ بشر کی آخری تین آیات میں اس کی صفات کا ایک خوبصورت اور بھرپور گلدستہ آیا۔ فرمایا:

”وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، غائب اور حاضر ہر چیز کا جاننے والا، وہی رحمن اور رحیم ہے۔ وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ بادشاہ ہے نہایت مقدس، سراسر سلامتی، امن دینے والا، سب پر غالب، اپنا حکم بے زور نافذ کرنے والا اور بڑا ہی ہو کر رہنے والا، پاک ہے اللہ اس شرک سے جو لوگ کر رہے ہیں۔ وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے۔ اس کے لئے بہترین نام ہیں۔ ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تصنیع کر رہی ہے اور وہی زبردست اور حکیم ہے۔“

جو انسان اللہ کی ان ذات و صفات میں سے کسی ایک صفت کا سہواً حق ادا نہ کرے وہ گناہگار ہے

اور جو کوئی عداوت کا اظہار کرے وہ کافر ہے اور جو کوئی ان صفات میں اللہ کی ذات کے سوا کسی اور چیز کو شامل کرے، وہ مشرک ہے۔ یاد رہے وقت کے اس موڑ پر دنیا میں مشرکین کی تعداد سب سے زیادہ ہے نہ ماننے والوں یعنی کافروں کی اس سے کم اور ماننے والوں یعنی ایمان لانے والوں کی سب سے کم۔

## 2۔ حقوق العباد

حقوق اللہ کی ادائیگی کے ساتھ حقوق العباد یعنی بندوں پر بندوں کے حقوق کی باری آتی ہے۔ والدین کے اولاد پر حقوق ہیں تو اولاد کے والدین پر بیوی کے شوہر پر حقوق ہیں تو شوہر کے بیوی پر امیر کے مامور پر حقوق ہیں تو مامور کے امیر پر۔ آجر کے اجیر پر حقوق ہیں تو اجیر کے آجر پر۔ استاد کے شاگرد پر حقوق ہیں تو شاگرد کے استاد پر۔ اسی طرح جیسے کہ ہم اوپر ذکر کر آئے، یتیم، مسکین، یتیم، مسافر یا قیدی وغیرہ سب کے حقوق ہیں۔ سخت گناہگار ہے وہ جو ان حقوق کی ادائیگی نہ کر پائے یا کوئی غفلت کا شکار ہو جائے۔

زمانہ قدیم سے لوگ بنیوں کو ایک بوجھ سمجھتے رہے ہیں ہم یہاں پر نمونے کے طور پر صرف ان احادیث کا ذکر کرتے ہیں جو رسول ﷺ نے بنیوں کی فلاح و بہبود کے لئے بیان فرمائی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جس شخص کے ہاں بیٹی ہو، وہ اسے زندہ درگور نہ کرے اور اسے ذلیل نہ کرے اور اپنے بیٹے کو اس پر ترجیح نہ دے، اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کریگا“ (ابوداؤد)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جس نے تین بنیوں کو پرورش کیا اور ان سے حسن سلوک کیا وہ جنت میں جائے گا“ (ابوداؤد)۔  
اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ تین سے کم و بیش بنیوں والوں کے لئے یہ بٹا رت نہیں بلکہ مطلب محض بنیوں کا ہے خواہ ان کی تعداد کوئی ہو۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ایک اور موقع پر فرمایا:  
”جس نے دو لڑکیوں کی کفالت کی یہاں تک کہ وہ بالغ ہو گئیں، قیامت کے دن میں اور وہ اس طرح آئیں گے۔ یہ فرما کر آپ ﷺ نے اپنی انگلیاں اکٹھی کر لیں“ (مسلم)۔  
حضرت سراقہ بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

”کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ صدق کا بہترین مستحق کون ہے؟ وہ تمہاری بیٹی ہے جو (مطلقہ یا بیوہ ہونے کے بعد) گھر میں واپس آ جاتی ہے“ (مکتوٰۃ کتاب الاداب)۔

اسی طرح کی احادیثِ رحمتے داروں اور دوسرے انسانوں کی خیر خواہی کے لئے ہیں۔ اسلام تو راستے میں پڑے پتھر کو ہٹانے والے کو صدق کی بنا دیتا ہے۔ خدمتِ خلق کا وسیع دائرہ کار زیادہ تر حقوقِ العباد کے متعلق ہے۔

### 3۔ حقوقِ انفس

انسان کی ایک بہت بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ خود اپنے حقوق کی فکر کرے۔ اس کے جسم کا ہر عضو اس کے وقت کا ایک ایک لحوہ اس کی صلاحیتیں اور توانائیاں اس کے پاس بطور امانت ہیں۔ وہ انہیں سب سے پہلے اپنی، پھر اپنے اعزہ و اقارب، پھر اپنے معاشرے اور بالآخر پوری انسانیت کی فلاح و بہبود میں لگانا انویسٹ کرنے کا پابند ہے۔ جس قدر وہ اس سے انحراف کرے گا اسی قدر وہ خیانت کا مرتکب ہوگا۔ ایک مسلمان تو جنت کے عوض اپنا جان و مال فروخت کر چکا ہوتا ہے جس کا مطلب ہے کہ جان و مال ہوتا تو اس ہی کے پاس ہے لیکن بطور ملکیت نہیں بطور امانت۔ قرآن مجید میں آیا:

”حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لئے ہیں“ (توبہ 111)۔

ایسے میں جب ایک مسلمان خیانت کا مرتکب ہوتا ہے تو سب سے پہلے وہ اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے کسی دوسرے پر بعد میں۔ چنانچہ یہ بھی فرمایا گیا:

”اور جو کوئی اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے گا وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرے گا“ (طلاق 1)۔

پھر یہ تصور امانت ایک انسان کے لئے اپنی ذات کے متعلق بھی ہے تو اجتماعی نظام کے متعلق بھی۔ ایک انسان اپنے اعضاء کو استعمال کرتے ہوئے وہی کام کرتا ہے جس کے لئے اسے یہ عطا کئے گئے ہیں تو درست بصورت دیگر خیانت ہے اور قابلِ گرفت۔ خودکشی اسی لئے حرام ہے کہ یہ اپنے نفس پر ظلم ہے۔ قرآن مجید یہ واضح تصویر پیش کرتا ہے کہ جب بھی کوئی فرد بھلائی کا کام کرتا ہے تو اس بھلائی کا فائدہ خواہ کسی دوسرے کو

پہنچے یا نہ پہنچے، اس کی اپنی ذات کو ضرور پہنچتا ہے اور اسی طرح کوئی برائی کرے تو اس برائی کا نقصان کسی دوسرے کو پہنچے یا نہ پہنچے، خود اس کو ضرور پہنچتا ہے۔ فرمایا گیا:

”جو کوئی راہِ راست اختیار کرے اس کی راست روی اس کے اپنے ہی لئے مفید ہے اور جو گمراہ ہو اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے۔ (قیامت کو) کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا“ (بنی اسرائیل: 15)۔

پھر قرآن یہ بھی پتہ دیتا ہے کہ جو کوئی صرف اپنی اس دنیا کو ہی بنانے میں لگا رہے تو اسے اس کا معاوضہ اس دنیا میں ادا کر دیا جاتا ہے اور آخرت میں اس کے لئے کوئی حصہ نہیں۔ اور جس کی دوزِ صوب اپنی آخرت سنوارنے کے لئے ہو تو ایسا شخص بشرطیکہ وہ مومن ہو آخرت میں انعامات پائے گا۔ فرمایا:

”جو کوئی جلد (سامنے کی دنیا) کا خواہشمند ہو، اسے سبکسپین ہم دے دیتے ہیں جو کچھ بھی دینا چاہیں پھر اس کے حصے میں جہنم لکھ دیتے ہیں جسے وہ ناپے گا۔ ملامت زدہ اور رحمت سے محروم ہو کر اور جو آخرت کا خواہشمند ہو اور اس کے لئے سعی کرے جیسی کہ اس کے لئے سعی کرنی چاہئے اور وہ مومن ہو تو ایسے ہر شخص کی سعی مشکور ہوگی“ (بنی اسرائیل: 18-19)۔

انسان کی خیر خواہی و بھلائی اسی میں ہے کہ نہ تو نکل کا شکار ہو اور نہ اللہ کی راہ میں بھی اتنا خرچ کر دے کہ خود کفالت ہو جائے۔ یعنی اخراجات کرتے وقت اسے اپنی ذات کو نہ بھول جانا چاہئے۔ اپنے نفس کی حفاظت اس کا فرض ہے۔ قرآن کریم نے اسے استعارے کی زبان میں یوں بیان کیا ہے:

”نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو (نکل کرو) اور نہ اسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دو (استطاعت سے زیادہ خرچ کرو) کہ خود ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ“ (بنی اسرائیل: 29)۔

عبادت کتنا محبوب عمل ہے لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس میں بھی اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی تاکید کی ہے۔ مطلب یہ کہ ایک عابد خود پر اتنا بوجھ نہ لادے کہ اس کی ذات کا نقصان ہو۔ ملاحظہ ہو نبی کائنات ﷺ کا اس بارے میں ارشاد:

”حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا ”اے عبداللہ!



مجھ کو ذرا دی گئی ہے کہ تو دن کو روزہ رکھتا اور رات کو (مسل) عبادت کرتا ہے“ میں نے عرض کیا ”ہاں یا رسول اللہ ﷺ“ آپ ﷺ نے فرمایا ”ایسا نہ کرو۔ روزہ بھی رکھنا اور روزہ ترک بھی کر۔ رات کو عبادت بھی کر اور سو بھی۔ اس لئے کہ تیرے جسم کا بھی تجھ پر حق ہے“ (بخاری و مسلم)۔

### بنیادی حقوق

خاقان کائنات نے اپنی کرم حقوق یعنی انسان کو معاشرت پسند بنایا ہے۔ معاشرے کے بغیر وہ اپنی ہستی تک سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ ماں کے پیٹ کے اندر ہونے سے لیکر اس دنیا میں آخری سانس تک اسے بے شمار افراد کی خدمات کی محتاجی ہوتی ہے۔ وہ اپنی پرورش اور زیست کے دوسرے لوازم بشمل خوراک، لباس، رہائش، تعلیم، علاج وغیرہ کے لئے ہی نہیں اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کی نشو و ارتقاء کے لئے وہ لازماً اجتماعی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ اعزہ و اقارب کی ایک خاصی بڑی تعداد اور مختلف انواع و اقسام کی فوج ظفر موج اس کے حقوق و فرائض کو متعین کرتی ہے۔

اسلام کے نقطہ نظر سے حقوق کی تین اقسام ہیں۔ پہلی قسم وہ جن کی حیثیت اخلاقی ہوتی ہے۔ بڑوں کا احترام، چھوٹوں پر شفقت، کمزور کی مدد، واقف یا ماواقف ضرورت مند کی ضرورت کو پورا کرنا وغیرہ۔ دوسرے وہ حقوق ہیں جن میں قانون داخل ہوتا ہے۔ ایسے حقوق کی مزید دو اقسام ہیں۔ ایک قسم وہ جو شہریوں کے مابین ہوتے ہیں جیسے حق نکاح و طلاق، حق مہر، حق اجرت، حق پردہ داری، حق راز داری وغیرہ۔ دوسری قسم حقوق کی وہ ہے جو حکومت وقت اور شہریوں کے مابین ہوتی ہے۔ گزشتہ صفحات میں ہم اخلاقی اور شہریوں کے مابین قانونی حقوق پر کافی بحث کر چکے۔ ذیل میں ہم ان حقوق کا ذکر کرتے ہیں جو شہریوں اور حکمرانوں کے مابین ہوتے ہیں۔ اس میں اندرونی یا بیرونی دونوں قسم کے حکمران شامل ہیں۔

### حق ملکیت

اسلام کا یہ منفرد کردار کہ وہ انفرادی ملکیت کی اجازت دیتا ہے۔ ضرورت سے زائد تو وہ اپنے قبضہ میں نہیں رکھ سکتا لیکن ضرورت ہو یعنی اگر وہ ضروریات زندگی پیدا کرنے کی خاطر قیصریوں اور لہجے چوڑے کاروباروں میں مصروف ہو تو ارب پتی بھی ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس کی آمدنی و اخراجات قرآن و سنت کے مطابق

ہوں اور یہ بھی کہ اس کے کاروبار سے حکومت یا کسی دوسرے شخص کے کاروبار پر برا اثر نہ پڑتا ہو۔ پھر جیسے کہ انسانی ضرورت ہے اسلام حق ملکیت مرد اور عورت دونوں کو دیتا ہے۔ اسلام کی انسان پروری کی یہ بھی ایک روشن مثال کہ وہ وراثت میں مرد اور عورت، لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو شامل کرتا ہے۔ قرآن میں آیا:

”مردوں کے لئے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتے داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لئے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتے داروں نے چھوڑا ہو خواہ چھوڑا ہو یا بہت، حصہ ہے ضرور“ (نساء: 7)۔

اس آیت مبارکہ میں موجودہ دور کی کئی الجھنیں حل کی گئی ہیں۔ پہلی الجھن جس کا حل بتایا گیا ہے یہ کہ عورت خواہ وہ بیٹی، بہن، بیوی، ماں یا کسی حیثیت میں ہو اس کی ایک اپنی حیثیت (Identity) ہے۔ وہ شخص دوسروں پر بوجھ (Dependent) نہیں اور بے سہارا نہیں ہے۔ مرد کی طرح وہ حامل ملکیت ہے اور فرض ہونے پر اسے اپنی ملکیت سے زکوٰۃ ادا کرنی ہے۔ دوسری اس الجھن کا حل کہ میراث کو ہر حال تقسیم ہونا ہے اور اسلام نے تفصیل کے ساتھ مختلف وارثین کے حصوں کا ذکر کیا ہے جو ان کی ذمہ داریوں کے مطابق طے کر دیئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر مرنے والے نے اگر ایک پلاٹ چھوڑا جس کے دس وارث ہیں تو یہ ضرور ہے کہ اسے دس حصوں میں تقسیم کیا جائے گا لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ دس حصے برابر ہوں بلکہ وہ ان ذمہ داریوں کے مطابق کم و بیش ہونگے جو مختلف وارثین نے ادا کرنی ہیں۔ مثال کے طور پر مرد پر تو لواحقین کے مان و نفقہ کا بوجھ ہوتا ہے، عورت پر نہیں۔ پھر یہ بھی کہ عورت کو میکے سے بھی وراثت ملتی ہے تو سسرال سے بھی۔ پھر اس مسئلے کا حل بھی اس آیت میں موجود ہے کہ وراثت کا قانون ہر قسم کے اموال و ملاک پر ہوگا خواہ وہ معقولہ ہو یا غیر معقولہ، مصنوعی ہو یا زرعی وغیرہ۔ پھر یہ تو ظاہر ہے ہی کہ تقسیم وراثت کا مسئلہ پیدا ہوگا تو اس وقت جب مرنے والا کوئی مال و ملکیت چھوڑ کر مرا ہو۔

اسلام نے تحفظ و حق ملکیت کو اس قدر اہم قرار دیا ہے کہ رسول ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”جو شخص اپنا مال بچانے میں مارا جائے وہ شہید ہے“ (بخاری)۔

مال کا اصل تحفظ جس کی اسلام بار بار تاکید کرتا ہے اس کا اللہ کے لئے خرچ کرنا ہے۔ وہ مال جو اللہ

کی راہ میں یا دوسرے نفعوں میں ان مادات میں جو انسانیت کی خیر خواہی کے لئے ہوں خرچ کیا جائے وہ ایسے  
 بانک میں جمع ہو جاتا ہے جہاں نہ چور کا ڈر ہے نہ خسارے کا بلکہ وہاں ہر جمع کیا جانے والا سرمایہ گنتا بڑھا کر  
 واپس کیا جاتا ہے۔ (بقرہ: 261)۔

پھر اسلام کا یہ بھی اعزاز کہ سرمائے و مال پر سانپ بن کر بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ زکوٰۃ و صدقات  
 وغیرہ کی صورت میں ایسا فطری نظام دیتا ہے کہ سرمایہ فطری انداز سے گردش میں رہتا ہے۔ بڑی بھیا تک وعید  
 ہے ان مالداروں کے لئے جو مال نہ دوزی کرتے اور مال کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ فرمایا:

”درناک سزا کی خوشخبری دو ان کو جو سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں  
 خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے اور چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان  
 لوگوں کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پنچھوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا۔ لو اب  
 اپنی سمجھی ہوئی دولت کا مزہ چکھو“ تو یہ (34-35)۔

یہ بھی اسلام کا اعزاز کہ وہ مال و متاع کو بوجہ افتخار بننے کی اجازت نہیں دیتا، وہ تقویٰ کو معیار فضیلت  
 قرار دیتا ہے۔ ایمان، عمل، علم اور صحیح جسم کی قدر کرتا ہے۔ قرآن میں آیا:

”ان کے نبی نے ان سے کہا اللہ نے طاقت کو تمہارے لئے بادشاہ مقرر کیا ہے۔ یہ سن کر وہ بولے  
 ”ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حقدار ہو گیا؟ اس کے مقابلے میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ وہ تو کوئی بڑا  
 مالدار آدمی نہیں ہے۔“ نبی نے جواب دیا ”اللہ نے تمہارے مقابلے میں اسی کو منتخب کیا ہے اور اس کو علم اور جسم  
 کی اہلیوں سے نوازا ہے“ (بقرہ: 247)۔

یہ ہے اسلام! وہ جو اسلام کی مخالفت کرتے ہیں کیا وہ مرد کے ساتھ عورت کو وراثت میں حصہ دار  
 نہیں بنانا چاہتے؟ ذرا تنہائی میں سوچیں تو سہی، آخر انسانیت کی وہ کیا خدمت کر رہے ہیں؟

## حقوقِ جاں

اسلام انسانی جان کو اس قدر محترم قرار دیتا ہے کہ اس کے نزدیک ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا  
 قتل ہے۔ اور ایسا قتل صرف مسلمان کا ہی نہیں، مسلمان اور غیر مسلمان دونوں کا۔ قرآن مجید میں آیا:

”جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کیا اور جس نے کسی کی جان بچائی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخشی“ (مائدہ: 32)۔

ایک اور جگہ پر فرمایا گیا:

”قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو، ایسا کرنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے مگر حق کے ساتھ“ (نہی اسرائیل: 32)۔

انسانی ضرورت ہے کہ بعض صورتوں میں کسی انسان کی جان لینا معاشرے اور بہتر رہن سہن کی ضرورت بن جاتی ہے۔ اسلام نے ان صورتوں کی وضاحت کر دی ہے اور ان کو درج ذیل چھ صورتوں تک محدود کر دیا ہے۔

- 1- قتلِ عمد کے مجرم سے قصاص
  - 2- جہاد میں وہی حق کی راہ میں مزاحم لوگوں سے جنگ۔
  - 3- اسلامی نظامِ حکومت کو لٹنے کی سعی کرنے والوں کو سزا۔
  - 4- شادی شدہ عورت یا مرد کو زنا کی سزا۔
  - 5- ارتداد کی سزا۔
  - 6- شاہراہوں پر ڈاک زنی کرنیوالوں کو سزا
- قتلِ عمد کی سزا لازماً جہنم رسیدگی ہے۔ قرآن مجید میں آیا:
- ”وہ شخص جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے۔ اور اللہ نے اس کے لئے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے“ (نساء: 93)۔
- اسلام کا یہ منفرد پہلو کہ سیکولر نظاموں کے قوانین تحفظِ جان کے حق کو بعد از ولادت لاگو کرتے ہیں اس کے برعکس اسلام اس حق کا اطلاق اس وقت سے کرتا ہے جب ماں کے پیٹ میں توخرا انسان فی شل اختیار کرتا ہے اور اس کی مدتِ اسلام نے استقرارِ حمل سے چار ماہ بعد رکھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک

عورت حاضر ہوئی اور اس نے نہ صرف زنا کا اعتراف کیا بلکہ اپنے آپ کو سزا کے لئے پیش کیا۔ ہادی برحق ﷺ نے اس عورت سے پوچھا کہ کیا وہ حاملہ تو نہیں؟ اس کے اقرار پر اس کی سزا کو نہ صرف بچے کی ولادت تک مؤخر کیا بلکہ رضاعت تک یعنی بچے کی دودھ پینے کی مدت تک جسے بھی اسلام نے دو سال کی مدت سے مختص کر دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی متعدد احادیث بھی حرمتِ جاں پر مصر ہیں۔ چند ایک کا ذکر درج ذیل ہے:

جہ اللوداع پر آپ ﷺ نے ناکید کی فرمایا:

”لوگو! تمہارے خون و مال اور عزتیں ایک دوسرے پر قطعاً حرام کر دی گئی ہیں۔ ہمیشہ کے لئے ان کی حرمت ایسی ہے جیسی آج تمہارے اس دن کی اس ماہ مبارک (ذی الحجہ) کی اور اس شہر کی۔ خبردار! ایسا نہ ہو کہ تم میرے بعد ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو اور غار کے زمرے میں شامل ہو جاؤ (بخاری، ابوداؤد)۔

”کسی مسلمان کے قتل کے مقابلہ میں پوری دنیا کا زوال اللہ کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتا (مسلم)“ اور خونِ عرفِ مسلمان کا ہی محترم نہیں اللہ کے ہر بندے کا خون محترم ہے۔ کسی مسلمان کے ہاتھ سے اگر کسی ذی کفالت کا قتل واقع ہو جائے تو اس پر جنت حرام ہے۔ فرمایا:

”جس نے کسی معاہدہ (وہ جس کے ساتھ معاہدہ ہو) غیر مسلم کو قتل کیا وہ کبھی جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکے گا“ (بخاری)۔

اس موضوع پر اور بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے لیکن ہم ایک اور حکم بیان کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں۔ فرمایا:

”اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو“ (نساء: 29)۔

یعنی اسلام خودکشی کو حرام قرار دیتا ہے۔ یوں خودکشی کا دروازہ اس نے ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ یہ ہے اسلام! اسلام کے مخالفین کیا قتلِ انسانی کے اس قدر متوازن، مربوط اور با مقصد نظام کو نہیں چاہتے؟ ذرا تنہائی میں سوچیں وہ انسانیت کی کوئی خدمت کر رہے ہیں؟

تھکنا آئرو

اسلام کے نزدیک کسی پاکدامن عورت پر تہمت لگانے والا تقریباً اتنا ہی بڑا مجرم ہے کہ جتنا زانیہ یا

زانیہ۔ غیر شادی شدہ زانی اور زانیہ کی سزا اگر سو کوڑے ہے تو تہمت لگا کر اس کا ثبوت پیش نہ کرنے والے کی سزا سی کوڑے ہے۔ قرآن مجید میں آیا:

”اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں ان کو اسی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو“ (نور: 4)۔

اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کو حقیر جانا جائے۔ قرآن میں آیا:

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں نہ ہو سکتا ہے کہ وہ ان (مذاق اڑانے والوں) سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں (حجرات: 11)۔

اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ایک دوسرے پر طعن کی جائے یا ایک دوسرے کو بُرے القاب سے یاد کیا جائے۔ قرآن میں آیا:

”آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے القاب سے یاد کرو“ (حجرات: 11)۔

بد زبانی اور شہد پن میں مام پیدا کرنے کی اجازت نہیں۔ فرمایا:

”ایمان لانے کے بعد فسق و فجور میں مام پیدا نہ کرو۔ یہ بڑی عادت ہے جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہی ظالم ہیں“ (حجرات: 11)۔

کس قدر کمال اسلام کا بد گمانی، تجسس کرنے اور غیبت وغیرہ کرنے سے منع فرمایا۔ قرآن میں آیا:

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ تجسس نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے؟ دیکھو تم خود اس سے گھن کھاتے ہو۔ اللہ سے ڈرو، اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے“ (حجرات: 12)۔

خون، رنگ، نسل، زبان و جہ فضیلت نہیں۔ اللہ کے نزدیک افضل و اعلیٰ وہ ہے جو اس سے ڈرنے والا

ہے۔ وہ اتنا ہی اللہ کے نزدیک جتنا تقویٰ میں زیادہ۔ قرآن میں آیا:

”لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔“ (حجرات: 13)۔

کچھ لوگ عزت حاصل کرنے کی خاطر کسی اونچی کھٹی والے کسی اونچے عہدے والے، کسی اونچی منہ والے کام چھلانے کی سعی کرتے ہیں۔ برعم خویش وہ کسی بلند منصب سے منسلک ہو کر اپنی عزت و بڑائی کے مستاشی ہوتے ہیں۔ یوں معزز ہونے والے اصل میں خود کو معزز بنانے کی دھن میں ذلت و رسوائی کا رستہ اختیار کرتے ہیں۔ اس کے برعکس قرآن مجید پتہ دیتا ہے کہ یوں عزت گوانے والے سن لیں کہ عزت کا سرچشمہ تو صرف ایک اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات ہے۔ عزت بھی اسی ایک کے ہاتھ میں ہے تو ذلت بھی۔ قرآن میں آیا:

”کیو! خدا! ملک کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے۔ جسے چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے۔ بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے (آل عمران: 26)۔“

اور یہ بھی آیا:

”اور جو منافق اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں انہیں یہ خرہ سنا دو کہ ان کے لئے دردناک سزا تیار ہے۔ کیا یہ لوگ عزت کی طلب میں ان کے پاس جاتے ہیں؟ حالانکہ عزت تو ساری کی ساری اللہ ہی کے لئے ہے۔“ (نساء: 139)۔

اسلام نے امیر اور غریب کے مابین فرق کو کم کرنے اور روپے پیسے کو سرکولیشن میں رکھنے کے لئے زکوٰۃ کا نظام اپنا رکھا ہے بلکہ اسے ایک عبادت قرار دیا ہے۔ اس نظام میں سرمائے کا بہاؤ امیر سے غریب کی طرف ہوتا ہے لیکن انتقال مال کا یہ براہ راست یعنی ایک آدمی سے بالمشافہ دوسرے کی طرف نہیں ہوتا بلکہ زکوٰۃ ادا کرنے والا اپنی رقم سرکاری خزانے یعنی بیت المال میں جمع کراتا ہے اور وہاں سے رقوم مستحقین کو بطور

وظائف ادا ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے براہ راست ادائیگی کی صورت میں زکوٰۃ لینے والے کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے جو اسلام کو قطعاً گوارا نہیں۔ ہاں کسی وقت ایمر جنسی میں کوئی صاحب مال اپنا مال کسی غریب کے سپرد کرے تو اس کو ہدایت کی گئی کہ وہ اپنا ثواب احسان جتلا کر اور اذیت دے کر کم نہ کرے۔ فرمایا:

”جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کر کے پھر احسان نہیں جتلاتے نہ دکھ دیتے ہیں، ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لئے کسی رنج اور خوف کا موقع نہیں۔ ایک بیٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو۔ اللہ نے نیاز ہے اور بردباری اس کی صفت ہے“ (بخاری: 263-262)۔

رسول اللہ ﷺ کی متعدد احادیث بھی ایک دوسرے کی عزت و آبرو کے تحفظ کی تاکید میں ہیں۔ چند ایک کا ذکر یہاں کرتے ہیں۔ فرمایا:

”مسلمان کی پشت محترم ہے (اس کی پٹائی نہیں ہونی چاہئے) فلا یہ کہ اس نے سزا کے قابل جرم کیا ہو۔ جس نے بلا وجہ کسی مسلمان کو مارا، اللہ تعالیٰ اس پر سخت غضبناک ہوگا“ (طبرانی)۔

”اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی حمایت ایسے موقع پر نہیں کرتا جہاں اس کی تذلیل کی جارہی ہو اور اس کی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی حمایت ایسے مواقع پر نہیں کرتا ہے جہاں وہ اللہ کی مدد کا خواہاں ہو۔ اور اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی حمایت ایسے مواقع پر کرتا ہے جہاں اس کی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو اور اس کی تذلیل و توہین کی جارہی ہو تو اللہ عز و جل اس کی مدد ایسے مواقع پر کرتا ہے جہاں وہ چاہتا ہے کہ اللہ اس کی مدد کرے“ (داؤد)۔

”بدترین زیادتی کسی مسلمان کی عزت پر حملہ کرنا ہے“ (داؤد)۔

”جس کسی نے دوسرے کی بے عزتی یا آبروریزی کی ہو تو وہ آج معاف کرالے، اس دن سے پہلے جب نہ روپیہ پیسہ ہوگا نہ مال و زر، البتہ نیک عمل اس کے پاس ہوگا جو لے لیا جائے گا اس ظلم کے موافق۔ اور اگر نیک عمل نہ ہوگا تو مظلوم کی برائیاں لے کر اس کے کھاتے میں ڈال دی جائیں گی“۔ (بخاری)۔

یہ ہے اسلام! انسان و انسانیت کا محافظ! کیا اسلام کی مخالفت کرنے والوں کو ایسا تحفظ نہیں چاہئے؟



تجہائی میں ذرا وہ سوچیں کہ وہ انسانیت کی کیا خدمت کر رہے ہیں؟

## نچی زندگی کا تحفظ

نچی زندگی کے تحفظ کا کما حقہ انتظام ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ مرد اور عورت کے درمیان اس تقسیم کار کو مد نظر نہ رکھا جائے جو اسلام کا طرہ امتیاز ہے۔ اسلام عورت کے دائرہ کار کو اس مملکت میں محدود کرتا ہے جس کا نام ”گھر“ ہے۔ یہ وہ گھر جو مختلف نوع کی ذمہ داریاں ہیں وہ مرد کے سپرد کی گئی ہیں۔ دائرہ کار کی اس تقسیم میں غیر معمولی حالات میں تھوڑے بہت انحراف کی اجازت ہے۔ عام حالات میں قطعاً نہیں۔ آج کی دنیا میں بہت سے معاشرہ نے اللہ تعالیٰ کی طے کردہ اس فطری تقسیم کار سے انحراف کر کے پچشم سرد کیلے لیا ہے کہ انہوں نے خود اپنے پاؤں پر کھڑی ماری ہے۔ گھر ویران ہو گئے۔ اولاد بے راہ ہو گئی۔ مرنے جینے پر ایک دوسرے سے رابطے ٹوٹ گئے۔ شوہر کو بیوی اور بیوی کو شوہر پر اعتماد نہ رہا۔ اطمینان قلب جیسی سب قدر گنوا بیٹھے۔ آجاکرتوں اور بلیوں سے دل بہلانے لگے۔ ایسے میں نچی زندگی خود کہیں نہیں اس کے تحفظ کا کیا سوال؟

اسلام اس فطری تقسیم کار کو لے کر نچی زندگی کے تحفظ کے لئے آگے بڑھتا ہے۔ آئیں دیکھیں کیسے؟  
اسلام لازم قرار دیتا ہے کہ جب کسی دوسرے کے گھر جاؤ تو وہاں داخل ہونے سے پہلے اہل خانہ سے اجازت لو اور ان پر سلام بھیجو۔ قرآن مجید میں آیا:

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں اس وقت تک داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ گھر والوں کی رضائے لے لو اور اہل خانہ پر سلام نہ بھیج لو۔ یہ طریقہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ توقع ہے کہ تم اس کا خیال رکھو گے۔ پھر اگر وہاں پر کسی کو نہ پاؤ تو داخل نہ ہو جب تک کہ تم کو اجازت نہ دے دی جائے اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو واپس چلے جاؤ۔ یہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے۔“ (نور: 27-28)۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی تاکید فرمائی ہے کہ کسی کے گھر دستک دینے کے بعد اس کے باہر آنے تک کے انتظار میں دروازے کے سامنے کھڑا ہونے کی بجائے اس سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہونا چاہئے۔ یہ بھی فرمایا کہ اپنے گھر میں داخل ہوتے ہوئے بھی آواز یا دستک دے کر داخل ہوا جائے تاکہ ماں، بہنوں اور بیٹیوں پر ایسی

حالت میں نظر نہ پڑے کہ سخت کا باعث ہو۔

ان۔ کانوں، دکانوں، فستروں وغیرہ کو ایسی پابندیوں سے مستثنیٰ کر دیا جہاں رہائش نہ ہو۔ فرمایا:

”تمہارے لئے اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ایسے گھروں میں داخل ہو جاؤ جو کسی کے رہنے کی جگہ نہ ہوں اور جن میں تمہارے فائدے (یا کام) کی کوئی چیز ہو“ (نور: 29)۔

کسی دوسرے کے گھر داخل ہونے کی اجازت کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی پھر وہاں دھرمادے کر بیٹھ جائے۔ احسن یہ ہے کہ وہاں بقدر ضرورت وقت گزارنے کے بعد فوراً اٹھ جائے۔ ایسا نہ ہو کہ صاحب خانہ وقت محسوس کرے۔ بالخصوص نبی رحمت ﷺ کے گھر کے حوالے سے فرمایا:

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! نبی کے گھروں میں بلا اجازت نہ چلے آیا کرو۔ نہ کھانے کا وقت تاکتے رہو۔ ہاں اگر تمہیں کھانے پر بلایا جائے تو ضرور آؤ مگر جب کھانا کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ! باتیں کرنے میں نہ لگے رہو“ (احزاب: 53)۔

یہ بھی اسلام کی ہدایت ہے کہ اگر دروازے سے ہی کوئی چیز لینی ہے تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔ فرمایا:

”نبی کی بیویوں سے اگر تم نے کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو“ (احزاب: 53)۔

انسان کی ایک اور ضرورت ہے کہ استراحت کے اوقات میں اس کی پرائیویسی میں کوئی ظلم انداز نہ ہو۔ اسلام نے اس معاملے کو بھی ہاتھ میں لیا ہے۔ فرمایا:

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! لازم ہے کہ تمہارے مملوک (نوکر، لونڈی وغیرہ) اور تمہارے وہ بچے جو ابھی عقل کی حد کو نہیں پہنچے ہیں، تین اوقات میں اجازت لے کر تمہارے پاس آیا کریں۔ صبح کی نماز سے پہلے اور دوپہر کو جب تم کپڑے اتار کر رکھ دیتے ہو اور عشاء کی نماز کے بعد۔ یہ تین اوقات تمہارے لئے پردے کے اوقات ہیں۔ ان کے بعد وہ بلا اجازت آئیں تو نہ تم پر کوئی گناہ ہے اور نہ ان پر۔ تمہیں ایک دوسرے کے پاس بار بار آنا ہی ہوتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنے ارشادات کی توضیح کرتا ہے اور وہ عظیم و حکیم ہے۔ (نور: 58)۔

آج کے دور میں حکومتی سطح پر بہت سے ایجنسیاں ایسی ہیں جو شہریوں کی نوہ اور تحس میں لگی رہتی ہیں۔ اسلام یہ خواہ خواہ کا جاسوسی کا جال بچانے، کسی شہری کے پیچھے خبر لگانے، لوگوں کے گھروں میں آلات جاسوسی نصب کرنے، ٹیلیفون ٹیپ کرنے، خطوط منسٹر کرنے اور یوں مخالفین کو بلیک میل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ فرمایا گیا:

”اور تحس نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے“ (حجرات: 12)۔

رسول اللہ ﷺ نے تو فرمایا کہ اگر تم تحس کے درپے ہو گے تو لوگوں کو بگاڑ دو گے۔ ملاحظہ ہو آپ کا ارشاد مبارک:

”تم اگر لوگوں کے خفی حالات معلوم کرنے کے درپے ہو گے تو ان کو بگاڑ دو گے یا کم از کم بگاڑ کے قریب پہنچا دو گے“ (ابوداؤد)۔

حکمرانوں کی طرف سے آج مختلف معاشروں میں ایسے بگاڑ کی شکلیں ہمارے سامنے ہیں۔ ایک اور حدیث میں آیا:

”جس نے کسی کے عیب کو دیکھا اور اس کی پردہ پوشی کی اس نے گویا ایک زندہ درگور انسان کو زندہ کر دیا“ (ابوداؤد نسائی)۔

ایک اور حدیث میں فرمایا:

اگر کوئی شخص کسی کو گھر میں جھانکتے دیکھے اور اس کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔ آپ ﷺ نے کسی کا خط پڑھنے کی بھی ممانعت کی۔

یہ بجا اسلام! کیا اسلام پر یلغار کرنے والوں کو گھر اور گھر والوں کو بیرونی مداخلت سے بچانے، راز ٹٹولنے، کھوج لگانے سے پرہیز کرنے کی ضرورت نہیں۔ ذرا تجاہلی میں غور فرمائیں وہ انسانیت کی کوئی خدمت کر رہے ہیں؟

**حق آزادی**

اس موضوع پر ہم دو ذیلی عنوانات کے تحت بحث کرتے ہیں۔ یعنی آزادی عمل اور آزادی رائے۔

1۔ آزادی عمل: آج کی دنیا میں خواہ وہ مسلم دنیا ہو یا غیر مسلم ایک شخص بھی آزاد نہیں۔

انسان اللہ تعالیٰ کی فیکٹری کا پروڈکٹ ہے۔ جس طرح ایک عام فیکٹری کے پروڈکٹ والے کو اپنی تیار کردہ چیز کو استعمال میں لانے کی ہدایات دی جاتی ہیں اسی طرح فیکٹری میں تیار ہونے والے انسان کو زندگی گزارنے کے قوانین وضوابط دینا صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے۔ اسی مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے پوری انسانی تاریخ پر وقتاً فوقتاً آسمانی کتابیں نازل فرمائی ہیں۔ لیکن دنیا بھر میں ایک انسان بھی آپ کو ایسا نہیں ملے گا جو ایسے نظام زندگی میں رہے جس پر اللہ تعالیٰ نے قوانین پر مبنی ہوئے۔ اس لئے کہ ایسا نظام خود کسی خطہ زمین میں نافذ نہیں۔ دنیا بھر میں دو طرح کے نظام رواں ہیں یعنی یا تو وہ جو خالص ہندوؤں کے خود ساختہ قوانین پر مبنی ہیں جیسے آمریت، جمہوریت یا اشتراکیت وغیرہ اور یا نظام ایسے قوانین پر مبنی ہیں جو کچھ اللہ کے قوانین پر اور کچھ ہندوؤں کے خود ساختہ قوانین پر مبنی ہیں یعنی ان کی حیثیت ملفوظہ کی سی ہے۔ اللہ کے دیئے ہوئے قوانین تو ظاہر ہے آزادی کو یقینی بناتے ہیں اس لئے کہ وہ اس ہستی کے بنے ہیں جو غیر جانبدار ہے جس کا نظام کے ساتھ کوئی مفاد وابستہ نہیں۔ نہ اس کی اولاد ہے نہ برادری۔ اس کے مقابلہ میں جہاں بھی ہندوؤں سے قانون سازی کا عنصر آگھستا ہے وہیں انسانوں اور انسانی طبقتوں کا مفاد چپکے چپکے یا بیاں نہ دل شامل ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب آج کی دنیا میں خالص اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ نظام رائج نہیں تو کسی نہ کسی طور دنیا کا ہر شخص محکوم ہے۔ الٹی قوانین اور انسانی قوانین کی نسبت تناسب کے مطابق کہیں افراد تھوڑے جکڑے ہوئے ہیں کہیں بہت لیکن ہیں ہر جگہ پر محکوم۔

محکوم ہونے کا جو سب سے زیادہ نقصان ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو آزادی عمل کی نعمت سے نوازا رکھا ہے وہ چھینی جاتی ہے اور کوئی بھی فرد ان صوابدیدی اختیارات (Discretionary powers) سے استفادہ نہیں کر سکتا جو اللہ تعالیٰ نے ہر فرد کی آزمائش کے لئے وضع اور عطا کر رکھے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اسلام ہو تو انسانیت اس سہولت سے فائدہ مند ہو سکتی ہے ورنہ نہیں۔

اسلام ان صوابدیدی اختیارات کا بدرجہ اتم تحفظ کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں آیا:

”وین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں۔ صحیح بات غلط خیالات سے علیحدہ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے“

اور کون اس آزادی پر دھوا بول سکتا ہے جب کہ کسی نبی کو بھی ایسا کرنے کا اختیار نہیں۔ قرآن میں آیا:

”کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کی بجائے تم میرے محکم بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ ربانی (اللہ کے محکم) بنو جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو“ (آل عمران: 79)۔

خود رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا:

”اے نبی ﷺ! نصیحت کئے جاؤ، تم بس نصیحت ہی کرنے والے ہو، ان پر جبر کرنے والے نہیں“

(غاشیہ: 21-22)۔

عمل کی یہ آزادی کوئی مادر پدر آزادی نہیں۔ اس پر ایک بڑی قدغن ہے اور وہ قدغن یہ کہ عمل فرد سے ہو یا اجتماعی طور پر کسی ادارے حتیٰ کہ پوری امت مسلمہ سے، یہ اسلام کے کسی ضابطے، چھوٹا ہو یا بڑا، کے خلاف نہ ہو۔ یہ قدغن یا پابندی اسی نوعیت کی ہے جیسے بائی وے پر لگے بدلتی اشارات جن کا مقصد مسافر کے سفر کو محض محفوظ بنانا ہوتا ہے، عمل سفر پر ناجائز پابندی لگانا نہیں۔

2۔ آزادی رائے: کوئی بھی معاشرہ، کوئی بھی گروہ تیزی کے ساتھ تباہی و بربادی کی طرف بڑھتا ہے جب اس کی زبان، قلم پر مالے لگا دیئے جائیں۔ اس لئے اسلام دو بڑے اداروں یا منسویوں کو آزادی رائے اظہار آزادی رائے اور مشاورت کے لئے مختص کرنے کو لازم قرار دیتا ہے۔ یہ قرآنی تقاضا ہے یعنی ان کے وجود کی خود قرآن میں باصرانہ کید کی گئی ہے۔ یہ دو ادارے ہیں:

(i) شوری

(ii) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

ہم ان کی اہمیت اور طریق کار پر مختصر روشنی ڈالتے ہیں۔

(i) شوری: اسلام ایک شورائی نظام ہے یعنی یہ نظام لوگوں کے مشورے سے چلایا جاتا ہے۔

## قرآن میں آیا

”(جو کچھ اللہ کے پاس ہے) کو وہ ان لوگوں کے لئے ہے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر غصہ آجائے تو درگزر کرتے ہیں، جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں۔ ہم نے جو کچھ رزق انہیں دیا ہے اس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں“ (شوری: 37-38)۔

اسلام میں پارلیمنٹ کی بجائے شورائی کا ادارہ ہوتا ہے۔ شورائی کا ادارہ اصل میں مجتہدین کا گروہ ہوتا ہے یعنی ایسے لوگ جن کا قرآن و سنت پر بھی مکمل عبور ہوتا ہے تو حالات حاضرہ پر بھی۔ انہوں نے ہر اس معاملے میں قرآن و سنت کی روشنی میں انبساط کر کے خلیفہ المسلمین کو اپنی رائے اور مشورے سے نوازا ہوتا ہے جس کے متعلق قرآن و سنت میں براہ راست نص یا کوئی ضابطہ نہ ہو۔ اسلام کی یہ عظمت کہ اس نے رائے اور مشورے کو حکمرانی حیثیت میں (Institutionalize) کر دیا ہے۔

خلیفہ المسلمین پوری اسلامی دنیا کا واحد سربراہ، بظاہر علوم ہوتا ہے کہ بہت بڑا آمر ہوگا۔ لیکن وہ اتنا بے بس کہ کوئی فیصلہ اپنی مرضی سے نہیں کر سکتا۔ وہ قرآن و سنت کے احکامات کا پابند ہے خواہ ان کا اطلاق خود اس پر، اس کے بچوں اور دیگر اعزہ و اقارب پر ہو۔ ہاں، ایک شکل ایسی پیدا ہو سکتی ہے کہ کوئی ایسا معاملہ درپیش ہو کہ جس کے متعلق قرآن و سنت میں براہ راست کوئی ضابطہ نہ ملے۔ ایسے میں بھی خلیفہ المسلمین بغیر شورائی کا مشورہ اور رائے لئے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ یہی وہ صورت حال ہے کہ جہاں شورائی اور مشورے کی ضرورت پڑتی ہے۔

ہر رکس شورائی مشورہ دینے میں کلی آزاد ہوتا ہے اس لئے کہ اس کی رائے کا ماخذ اس کی اپنی مرضی نہیں، قرآن و سنت ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ اسلام میں نبی ﷺ کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ عوام سے مشورہ کرے، ظاہر ہے ایسا مشورہ کا رسالت میں نہیں کار خلافت میں درکار ہوتا ہے۔

(ii)۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر: ایک اچھے معاشرے کی علامت یہ ہے کہ وہاں نیکی کو فروغ

تو برائی کا قلع قمع ہو۔ اس کے برعکس اگر کسی معاشرے میں معاملہ الٹ ہو یعنی جہاں برائی کو فروغ اور نیکی کا قلع قمع ہو تو وہ معاشرہ آج گرا یا کل، بس تباہی کی طرف گامزن ہونے کی وجہ سے جلد صفحہ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔ اسلام ایک ایک فرد، ایک ایک اورے اور بالآخر پوری امت کے لئے لازم قرار دیتا ہے کہ وہ نیکی کو فروغ اور برائی کا انسداد کرے۔ ایسا تبھی ممکن ہو سکتا ہے کہ جہاں برائی ہو رہی ہو دیکھنے والا اسے روکے اور جہاں نیکی ہو رہی ہو اس کا معاون بنے۔ یعنی دیکھنے والا محض تماشاخی نہ بنے۔ بھلائی دیکھے یا برائی اپنی رائے کا اظہار ضرور کرے۔ مسلمان سوسائٹی کا فرد یا ادارہ ہوتے ہوئے ایسا کرنا اس کا فرض منصبی ہے۔ رائے کے اظہار کے لئے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر وہ کسی طور نگران اور نگرانی کی پوزیشن میں ہے تو اپنی رائے کو بڑا فائدہ کرے۔ ایسا ممکن نہ ہو تو زبان سے روکے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو دل میں تنگی محسوس کرے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”جو شخص برائی کو دیکھے تو اسے طاقت سے بدل ڈالے، اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو پھر زبان سے (اس کے خلاف) جہاد کرے، اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو پھر کم از کم اپنے دل میں ہی اس سے نفرت کرے اور یہ آخری کیفیت کمزور ایمان کی نشانی ہے“ (مسلم ہرندی)۔

فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اتنا اہم ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول نہیں فرماتا جو یہ فرض منصبی ادا کرنے سے قاصر رہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری زندگی ہے (اے امت مسلمہ!) تم نیکی کا حکم دیتے رہو اور برائی سے روکتے رہو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک ایسے (خطرناک) مہذب میں مبتلا کر دے گا کہ اس سے نجات پانے کے لئے تم اللہ تعالیٰ سے دعا کرو گے مگر وہ تمہاری دعاؤں کو قبول نہیں کرے گا“ (ترمذی، مسند احمد)۔

چونکہ یہ رائے دینا ایک دینی فریضہ ہے اس لئے اسلامی تاریخ میں بسا اوقات ایک عام شہری خلیفہ المسلمین کا حساب تک کر سکتا ہے۔ دو مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ایک غزوہ میں رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ فلاں فلاں مقام پر قیام کریں اور پراؤں ڈالیں۔ ایک صحابیؓ نے دریافت کیا ”یا رسول اللہ ﷺ سے ہے یا آپ ﷺ کی ذاتی رائے ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا یہ میری ذاتی رائے ہے۔ صحابیؓ نے عرض کیا ”پھر تو یہ منزل مناسب نہیں۔ اس کے بجائے فلاں فلاں

منزل مناسب ہوئی۔ چنانچہ اسی کی رائے پر عمل کیا گیا۔ (یہ رائے لینا خلافت کا حصہ تھا رسالت کے معاملہ میں کسی رائے کی ضرورت نہیں ہوتی وہ اللہ اور رسول ﷺ کا معاملہ ہے۔)

ایک خاتون راہ چلتے خلیفہ وقت حضرت عمرؓ پر برس پڑیں اور بولیں ”عمر تمہارے حال پر افسوس ہے میں نے تمہارا وہ زمانہ دیکھا ہے جب تم عمر کہلاتے تھے اور لاٹھی لئے دن بھر عکاظ میں بکریاں چراتے پھرتے تھے۔ اس کے بعد میں نے تمہارا وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب تم عمر کہلانے لگے اور اب یہ زمانہ بھی دیکھ رہی ہوں کہ امیر المومنین بنے پھرتے ہو۔ رعایا کے معاملے میں اللہ سے ڈرو اور اس بات کو یاد رکھو کہ جو اللہ کی وعید سے ڈرے گا اور آخرت کے عید عالم سے اپنے آپ کو بالکل قریب پائے گا اور جس کو موت کا ڈر ہو گا وہ ہمیشہ اسی فکر میں رہے گا کہ اللہ کی دی ہوئی کوئی فرصت رائیگاں نہ جائے۔“

یہ ہے اسلام! پوری انسانی تاریخ میں آزادی عمل، آزادی اظہار رائے، اظہار ضمیر و اعتقاد کے ایسے مناظر اب نہیں ملیں گے۔ کیا مخالفین اسلام کو ایسی آزادی کی ضرورت نہیں؟ تہائی میں ذرا سوچیں اسلام پر یلغار کر کے وہ انسانیت کی کونسی خدمت کر رہے ہیں؟

### ظلم کے خلاف احتجاج کا حق

ظلم کا متبادل مفہوم حق تلفی ہے۔ حق تلفی خواہ کسی فرد کے خلاف ہو، خود کسی کے اپنے خلاف ہو، اللہ تعالیٰ کے خلاف ہو، ظلم ہے۔ شرک کو اسی لئے ”ظلم عظیم“ کہا گیا ہے کہ اس میں وہ اوصاف و اعزازات جو صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہیں کسی دوسرے میں بھی گردانے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر حاکمیت و قانون سازی عرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے۔ لیکن جب انسان اللہ تعالیٰ کے مازل کردہ قوانین کو نافذ نہ کریں جس کا دوسرا مطلب ہے کہ وہ خود ساختہ قوانین نافذ کریں تو ایسوں کو کافر بھی کہا گیا ہے، ظالم بھی اور فاسق بھی۔ (مانندہ: 44، 45، 47)۔ بنامہ قرآن مجید میں کئی مقالات پر گناہ کے لئے ظلم اور گناہگار کے لئے ظالم کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ قرآن مجید میں بار بار صرف یہی نہیں آیا کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو پاسبند کرتا ہے (آل عمران: 57) بلکہ یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا (مانندہ: 52) صرف مظلوم ہے جس کو اللہ تعالیٰ محض احتجاج تو کیا بدکلامی کی اجازت دیتا ہے۔ فرمایا:



”اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بد گوئی پر زبان کھولے، یا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو اور اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے“ (نساء: 148)۔

حدیث میں آیا:

”افضل ترین جہاد اس شخص کا ہے جو کسی حق سے ہٹے ہوئے سلطان کے آگے کلمہ حق کہے“ (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)۔

یہ بھی فرمایا:

”لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کے ہاتھ نہ پکڑیں تو بعید نہیں کہ اللہ ان پر عذاب عام نازل کر دے“ (ابوداؤد، ترمذی)۔

آپ ﷺ کا یہ بھی ارشاد مبارک ہے:

”اے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ عرض کیا گیا، یا رسول اللہ ﷺ وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کریں مگر ظالم کی کیسے مدد کریں؟ فرمایا، اسے ظلم سے روک دو“ (بخاری)۔

ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر قرض کی ادائیگی کا تقاضا کرنے لگا۔ اس نے بھری محفل میں سخت کلامی کی۔ اس کے گستاخانہ طرزِ خطاب پر صحابہ چونک گئے اور وہ اس کی مرمت کے لئے اٹھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا، ”اے کہنے دو، اے کہنے دو، جس کا کچھ حق نکلتا ہو وہ ایسی باتیں کر سکتا ہے“ (بخاری)۔

یہ ہے اسلام! ظلم کے خلاف احتجاج کو نہ صرف حق بلکہ فرض قرار دیتا ہے۔ اسلام پر یلغار کرنے والے سوچیں کہ اسلام پر یلغار کیا انسانیت پر یلغار نہیں؟

## عمل غیر سے برأت

آج کی سیکولر اور جمہوری دنیا میں رواج ہے کہ اگر مجرم ادھر ادھر چھپ جائے تو اس کے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو پکڑ لیا جاتا ہے۔ ان پر تشدد کیا جاتا ہے تاکہ کسی طور مجرم دستیاب ہو جائے۔ اسلام اس کی سختی سے تردید کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا:

”ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا“

ایک اور جگہ پر فرمایا:

”سمجھ لو ظالموں کے سوا کسی اور پر دست درازی روا نہیں“ (بقرہ: 193)۔

یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی اور۔ یہی ضابطہ ہے جو قیامت کے دن بروئے کار لایا جائے گا۔ چنانچہ قرآن میں یہ بھی آیا:

”جو کوئی راہِ راست اختیار کرے اس کی راست روی اس کے اپنے ہی فیصے مفید ہے اور جو گمراہ ہو اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا“ (بنی اسرائیل: 15)۔

جب یوسف نے اپنے بھائی کی خرتی سے اپنا گم شدہ پیالہ برآمد کر لیا تو اس کے بھائیوں نے یوسف سے استمداد کی کہ اس بھائی کی بجائے کسی اور کو محبوس کر لیا جائے لیکن یوسف نے یہاں اسی ضابطے کی وضاحت کی۔ قرآن میں آیا:

”انہوں (یوسف کے بھائیوں) نے کہا ”اے سردار ذی اقتدار، اس کا باپ بہت بزرگ آدمی ہے اس کی جگہ آپ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجئے، ہم آپ کو بڑا ہی نیک نفس انسان پاتے ہیں“ یوسف نے کہا ”اللہ کی پناہ! دوسرے کسی شخص کو ہم کیسے رکھ سکتے ہیں۔ جس کے پاس ہم نے اپنا مال پایا ہے اس کو چھوڑ کر دوسرے کو رکھیں گے تو ہم ظالم ہو گئے“ (یوسف: 78-79)۔

یہ ہے اسلام! اسلام کے مخالفین کیا اس دین کے قلع قمع پر تلے بیٹھے ہیں جو ”حق بحق دار رسید“ کے شہری اصول کا داعی ہے۔ ان کی یلغار کیا اسلام پر یلغار نہیں؟

## حق مساوات

آج کی دنیا میں ”مساوات، مساوات“ کا بہت غوغا ہے۔ ایسا ہی ہے جیسے کہ چور کو احساسِ مذمت ہو تو وہ شور مچاتا شروع کر دے کہ ”چور چور چور“۔ کہنے کو تو جمہوریت کا طرہ امتیازی یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہر کبوتر مہرہ کی برابر کی رائے لیکن خود جمہوریت کو قائم کرنے کے لئے جو طریق انتخاب اختیار کیا جاتا ہے وہ صرف سرمایہ داروں کا من پسند کھیل ہے۔ الیکشن میں لاکھوں کروڑوں کی سرمایہ کاری ہوتی ہے۔ ایک غریب، وہ خواہ

لاکھوں صلاحیتوں کا مالک ہوا نیکشن میں حصہ لینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ سرمایہ داروں کا یہ موت میلہ صرف انتخابات تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس نظام کا ایک لازمی حصہ بن جاتا ہے۔ پارلیمنٹ میں اگر کاشتکاروں کی اکثریت ہو تو قانون سازی خود بخود کاشتکاروں کے حق میں ہوتی ہے۔ اگر تاجروں کا پارلیمنٹ پر قبضہ ہو تو زیادہ تر مراعات تاجروں کے حصہ میں آتی ہیں۔ غرباء، بچارے بس خاموش تماشائی یا بے بس شہریوں کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اسلام ”سرمائے“ کو معیار اہلیت بنانا ہی نہیں بلکہ علم و جسم کی مثبت صلاحیتوں کو بنانا ہے۔ قرآن میں آیا:

” (ان کی درخواست پر) ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے طاقت کو تمہارے لئے بادشاہ مقرر کیا ہے۔ یہ سن کر وہ بولے ”ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حقدار ہو گیا؟ اس کے مقابلے میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ وہ تو کوئی بڑا مالدار آدمی نہیں ہے“ نبی نے جواب دیا ”اللہ نے تمہارے مقابلے میں اسی کو منتخب کیا ہے اس لئے کہ اس کو دماغی اور جسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں اور اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جسے چاہے بڑی وسعت رکھتا ہے اور سب کچھ اس کے علم میں ہے“ (بقرہ: 247)۔

اسلام کے نزدیک اعلیٰ وادنیٰ کا معیار ہے لیکن رنگ نسل، زبان، مہدئے سرمایے وغیرہ کی بنیاد پر نہیں اللہ کے ڈار کی بنا پر پیدا ہونے والے مزاج“ کردار اور ساکھ پر فرمایا گیا:

”لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے معزز وہ ہے جو تمہارے مائیں سب سے زیادہ پرہیزگار (اللہ سے ڈرنے والا) ہے یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے“ (حجرات: 13)۔ یاد رہے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ”کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر اور کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے مگر تقویٰ کے اعتبار سے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو“ (بخاری)۔

دنیا بھر کے دساتیر میں ”مساوات“ کا ذکر اکثر و بیشتر ملتا ہے لیکن انہی دساتیر میں ایک شق یہ بھی ہوتی ہے کہ سربراہ مملکت اور سربراہ حکومت کی ان کے دوران حکومت میں عدالتی حاضری بوقت ضرورت بھی نہیں

ہوگی۔ شاید اسی لئے کہ سیکولر نظام میں یہ عدالت میں حاضری کی نوبت اکثر آتی رہتی ہے۔ اسلام پہلے تو نظام ہی ایسا دیتا ہے کہ خلیفہ المسلمین کی عدالت میں حاضری کی نوبت ہی نہیں پڑتی اس لئے اللہ کا قانون خود اس پر اسی طرح نافذ ہوتا ہے جس طرح کہ عام شہری پر۔ خلیفہ المسلمین اس معاملے میں ایک عام شہری کی طرح ہے بس ہونا ہے۔ قانون سے بچ نہیں سکتا ہے۔ ہائیریں اس پورے نظام کی کارگزاری ایسی ہے کہ خلیفہ المسلمین کو عدالت میں حاضر ہونے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی لیکن اگر کبھی کبھار ایسی ضرورت پڑ جائے تو خلیفہ المسلمین کے عدالت میں حاضر ہونے میں کوئی ضابطہ حائل نہیں۔ شاید تاریخ میں پہلی بار دور خلافت راشدہ میں ضرورت پڑنے پر خلیفہ المسلمین کو عدالت کے کئیرے میں نہ صرف دیکھا گیا بلکہ اس کے خلاف اور ایک یہودی کے حق میں فیصلہ ہوتے بھی دیکھا گیا۔

قریش کی ایک عورت فاطمہ نے چوری کی۔ ایک صحابی حضرت اسامہؓ نے اسے معاف کرنے کی سفارش کی۔ نبی رحمت ﷺ نے بال کو حکم دیا کہ مسلمانوں کو مسجد میں جمع کیا جائے۔ مسلمان جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

”تم سے پہلے جو امتیں گزری ہیں وہ اسی لئے تباہ ہوئی ہیں کہ وہ کم درجے کے لوگوں کو تو قانون کے مطابق سزا دیتی تھیں اونچے درجے کے لوگوں کو چھوڑ دیتی تھیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ بھی ایسا کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا“ (بخاری، مسلم)۔

اسلام کے مخالفین خود تاریخ کی ورق گردانی کریں اور پھر فیصلہ کریں کہ محض وطنی، لسانی، نسلی طرز کی مساوات ہی نہیں کیا انسانی سطح کی مساوات کی ان کو ضرورت نہیں؟ کیا وہ بھول میں نہیں؟

### معاشی تحفظ کا حق

جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر ذی روح بالخصوص انسان تک ہدایت کی رسائی اپنے ذمہ لے رکھی ہے اسی طرح اس نے ہر ذی روح بالخصوص انسان تک رزق رسائی کو اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ قرآن مجید میں آیا:

”زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو اور جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ کہاں وہ رہتا ہے اور کہاں وہ ہونا جاتا ہے۔ سب کچھ ایک صاف دفتر میں درج ہے“ (ہود: 6)۔

ایک اور جگہ پر فرمایا:

”کتنے ہی جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے، اللہ ان کو رزق دیتا ہے اور تمہارا رازق بھی وہی ہے۔ وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے“ (مکھبوت: 60)۔

یعنی اسلام معاشی تحفظ کے حق کو اس قدر ترجیح دیتا ہے کہ ہدایت رسانی کے علاوہ یہ رزق رسانی ہے کہ جس کی ذمہ داری خالق کائنات نے خود اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ ایسے میں ایسا تو نہیں ہونا چاہئے کہ کوئی شخص بھوکا یا تنگ رہے۔ لیکن واقعات کی دنیا میں تو ایسا ہے کہ بھوکا و تنگ رہتا تو درکنار فاقوں سے مرنے والے اور سردی و گرمی کی شدت سے مڑ حال ہونے والے آج ہماری دنیا میں لاکھوں کروڑوں ہیں۔ اصل میں جس ہستی نے یہ رزق رسانی کی ذمہ داری لے رکھی ہے اس نے انسان کے لئے ایک ضابطہ حیات بھی دے رکھا ہے۔ اگر دنیا بھر کے انسان وقت کے کسی بھی موڑ پر اس ضابطہ حیات کو اس کے پورے لوازمات و کوائف کے ساتھ نظام حیات میں تبدیل کئے رکھیں تو دنیا میں کوئی بھوکا یا تنگ نہ رہے۔ بھوکا یا تنگ آج ہے تو اس لئے کہ انسانوں نے یا تو وہ ضابطہ حیات اپنا ہی نہیں رکھا یعنی دیئے گئے ضابطہ حیات کی بجائے خود ساختہ ضابطہ حیات نافذ کر رکھا ہے یا ضابطہ حیات نافذ تو کر رکھا ہے لیکن اس کی پوری تفصیلات کے ساتھ نہیں بلکہ اس اصل ضابطہ حیات کی بجائے اللہ تعالیٰ کے دیئے گئے ضابطہ کے ساتھ اپنی خواہشات و مفادات پر مبنی ضابطہ حیات بنا رکھا ہے۔ بالفاظ دیگر جب بھی دنیا میں معاشی تشیب و فراز ہوتا ہے تو اس وقت جب اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ضابطہ حیات خالص شکل میں نافذ نہیں ہوتا۔ یعنی ضابطہ حیات اور نظام حیات ایسی صورت میں کچھ اسلام اور کچھ غیر اسلام کا ملغوبہ ہوتا ہے۔ یہ وجہ ہے آج ہماری دنیا میں بھوکوں اور تنگوں کے مرنے کی۔ یعنی ہماری اس زمین پر فراہمی رزق تو ہر انسان کے لئے ہے اگر کچھ لوگ بھوکے مارتے ہیں تو اس لئے کہ کچھ لوگوں کے کتے اور بلیاں ان بھوکے مرنے والوں کا رزق کھا جاتے ہیں اور ایسا ہوتا ہے تو اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا نظام جو ہر فرد تک رزق رسانی کرتا ہے بندوں کی نفسانی خواہشات کی تکمیل میں درہم برہم ہوتا ہے جیسے کہ آج کی دنیا میں ہمارے سامنے ہے۔ ہے تو وہ اسلامی نظام حیات انسانی زندگی کے ہر دائرہ کے متعلق لیکن موضوع کے اعتبار سے ہم اب اس کے معاشی پہلو کو اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

اسلام ہر فرد پر واجب کرتا ہے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہ بیٹھے بلکہ بقدر استطاعت اپنی تمام توانائیوں اور صلاحیتوں کو کچھ بہتر پیدا کرنے میں لگا دے۔ قرآن میں آیا:

”انسان کے لئے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی“ (نجم: 39)۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں رہبانیت حرام ہے۔ یعنی اسلام میں پادریوں پر وجہوں پنڈتوں، بیروں وغیرہ جیسی اکاس بیلوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ پرانی روٹیوں پر گزر بسر کرنے والے اسلام کے نہیں غیر اسلام کا جز ہوتے ہیں۔

پھر اسلام ہر فرد کی کمائی میں دوسرے افراد کا حصہ طے کر کے اسے اجتماعی نظام خلافت کا معاون بناتا ہے۔ ایسے اتفاق کی تین اقسام ہیں:

1۔ فقعات واجبہ یعنی ان لوگوں پر خرچ کرنا جو ایسا قرابتی حق رکھتے ہیں جیسے والدین، بیوی بچے بہن بھائی، دادا دادوی، نانا مانی، پوتے نواسے اور دوسرے صلیبی و رحمی رشتے دار۔

2۔ زکوٰۃ جو بیت المال میں جمع ہو کر آگے مستحقین بشمل فقراء، مساکین، ناملین زکوٰۃ، نومسلموں کی تالیف قلوب، غلاموں کو آزاد کرانے، قرضداروں کا قرض ادا کرانے، اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنے اور مسافروں کی ضروریات پوری کرنے وغیرہ میں تقسیم ہوگی۔

3۔ رشتہ داروں کی کفالت اور ادائیگی زکوٰۃ کے علاوہ صدقات و خیرات کی شکل میں ما داروں اور حاجتمندوں کی مدد کرنا۔ سائل محروم کی ایسی مدد کو قرآن مجید اہل ثروت پر یوں فرض کرتا ہے جیسے وراثت میں وارثین کو۔ گوارے چھوڑا گیا ہے ہر اہل ثروت کی اپنی صوابدید پر۔ قرآن میں آیا:

”(نخل سے نیچے والے وہ ہیں) جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے“ (معارف: 24-25) یعنی گو ہے تو صوابدید لیکن ہے ضروری جسے وہ خود طے کرتے ہیں۔

چونکہ سارے معاشی نظام کی بنیاد اس اتفاق پر ہے جو انفرادی سطح سے شروع ہوتا ہے لہذا چند آیات ملاحظہ ہوں جو فرد کو اتفاق پر آمادہ کرتی ہیں:

”تم میں سے کون ہے جو اللہ کو قرض حسد دے کہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس کر دے۔ گھٹانا بھی اللہ

کے اختیار میں ہے اور یہ حال بھی اور تمہیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے (بقرہ: 245)۔

”در دناک سزا کی وعید سنا دو ان لوگوں کو جو سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے اور چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیٹانیوں، پہلوؤں اور ہاتھوں کو دانا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا۔ سو اب اپنی سستی ہوئی دولت کا مزہ چکھو“ (توبہ: 33-36)۔

”اور لوگ پوچھتے ہیں ہم اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں؟ کہو جو کچھ تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو“ (بقرہ: 219)۔

کسی مسلمان کو پھر کھلی چھٹی نہیں کہ وہ حلال و حرام کی تمیز کئے بغیر مکائے خرچ کرے۔ اسے ان حدود کا پابند کیا گیا ہے جو معاشرے کی ترقی و بہبود اور پورے نظام کی صفائی و ستھرائی کے لئے ضروری ہیں۔ ہم چند ایک حدود کا ذکر کرتے ہیں:

- 1۔ شراب، جوا، رشوت، فحاشی و بدکاری کے ذرائع آمدنی، منوعہ اشیاء کی خرید و فروخت، ماپ تول میں کمی، چوبازاری، ذخیرہ اندوزی وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا اور یوں معاشی استحصال کی راہ روک دی گئی۔
  - 2۔ غیر شرعی مصارف، اسراف و فضول خرچی اور تحکم کی ممانعت۔ ضیاع کا اس قدر انسداد کہ اسلام کھانے والے کے لئے لازم قرار دیتا ہے کہ وہ پلیٹ کو خوب صاف کرے، باقیات سے لٹھڑا نہ چھوڑے۔
  - 3۔ وراثت، وصیت، مہر اور طلاق کی صورت میں بیوی بچوں کے لئے مقررہ مدت تک مان و نفقہ وغیرہ کی ادائیگی، غرض یہ کہ سرمایہ چند ہاتھوں میں مجتمع نہ ہو اور یہ بھی کہ گردش میں رہے۔
- اب کچھ ریاست کی ذمہ داریوں کا جائزہ لیجئے۔ ریاست کی اولین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ بیت المال کے نظام کو اس کی پوری تفصیلات کے ساتھ جاری و ساری رکھے۔ پوری اسلامی دنیا میں ایک فرد بھی ایسا نہ ہو کہ جو روٹی، کپڑا، مکان، سواری، علاقہ، تعلیم وغیرہ سے محروم رہے۔ نیز وہ معاشرہ میں کسب حرام کے تمام دروازے بند کرے، کسب حلال کی راہیں کشادہ کرے اور تعلیم و تربیت کے مواقع فراہم کر کے حصول روزگار آسان اور یقینی بنائے۔ خلافتِ وقت کی یہ بھی ذمہ داری کہ وہ لوگوں کو اللہ کے مقرر کردہ حقوق دلانے میں ان کی مدد

کرے۔ کوئی بیٹا باپ کی کفالت سے انکار کرے تو وہ کافرانہ سے کفالت کا پابند کرے۔ کوئی شوہر بیوی اور بال بچوں کے حقوق سے اعراض کرے تو انہیں ان کا حق بزدلایا جائے۔ چوروں، ڈاکوؤں، رہزنوں، راشیوں، بدعنوانی کے مرتکبوں کو شرعی سزائیں دلوانے کا سرعت انتظام کرے۔ نیز معاشی نظام کو اسلام کے دوسرے نظام بائے زندگی سے ہم آہنگ کرے۔

یہ ہے اسلام کا معاشی نظام! ایسے جتن نظام معاشرے کو جنم دیتا ہے جس میں کوئی ایک فرد بھی ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے۔ جس کا کوئی کفیل نہ ہو اس کی کفالت کا بندوبست خلاف وقت کرے۔ کیا انسانیت کو ایسے نظام کی ضرورت نہیں؟ اسلام پر یلغار کرنے والے کیا انسانیت پر یلغار نہیں کرتے؟

### حصول انصاف کا حق

انسان کی ایک بنیادی ضرورت ”حصول انصاف“ ہے۔ جس معاشرے میں انصاف ہوگا وہاں امن ہوگا، راحت و سکون ہوگا، خوشحالی ہوگی، امیر و مامور میں محبت و ہم آہنگی کا ماحول ہوگا اور سب سے بڑھ کر اللہ کی رحمتوں کا نزول ہوگا۔ اسلام نے انسان کے اس حق کو اتنی اہمیت دی ہے کہ انبیاء کی بعثت اور آسمانی کتابوں کے نزول کا مقصد ہی ”قیام انصاف“ قرار دیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا:

”ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان مازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں“ (حدید: 25)۔

رسول ﷺ سے باہتمام اعلان کروایا گیا، فرمایا:

”اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان عدل قائم کروں“ (شوری: 15)۔

حصول عدل کا مقصد پورا نہیں ہوتا جب تک انصاف دینے والا نظام درج ذیل شرائط پر پورا نہ اترے:

1۔ عدل نہ صرف قائم ہو بلکہ اس کا پرچم بلند ہو۔ کسی قسم کا لالچ، دباؤ، خوف، نفاق، انصاف کی راہ میں حائل نہ ہو۔

2۔ گواہی سچی اور ہر قسم کے لالچ، خوف، جانبداری سے پاک ہو خواہ اس کی زرخود گواہ پر، اس کے



والدین اور دیگر اعزہ و اقارب پر پڑتی ہو۔ چچی گواہی دی جائے خواہ اس کے نتیجے میں بیٹے کو پھانسی سے دوچار ہونا پڑے۔

3- گواہی دیتے وقت فریقین کا مقام و منصب، ان کی معاشی و معاشرتی حیثیت کا لحاظ نہ رکھا جائے۔ مقصد صرف اللہ کی رضا ہو۔

4- گواہی و انصاف کو اپنی ذاتی خواہشات سے آلودہ نہ کیا جائے۔

5- گواہی بے لاگ صریح اور واضح ہو۔ ذو معنی، گہلی لپٹی اور لالچی بھی بچ جائے اور سانپ بھی مر جائے جیسی پالیسی سے پاک ہو۔

ملاحظہ ہو اسلام ان شرائط کو کیسے احسن اور بھرپور انداز سے پورا کرتا ہے۔ قرآن مجید میں آیا:

”اے ایمان والو! انصاف کے طہر دار اور اللہ واسطے کے گواہ بنو۔ اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑے۔ فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ اس کا خیر خواہ ہے کہ تم اس کا لحاظ کرو۔ اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے گہلی لپٹی بات کی یا سچائی سے پہلو بھلایا تو جان رکھو کہ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے“ (نساء: 135)۔

قربان جائیں اس دین پر جو یہ بھی یقینی بنانا ہے کہ کسی دشمن کی دشمنی بھی انصاف دہی کی راہ میں حائل نہ ہو۔ فرمایا گیا:

”کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے بھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا پرستی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے“ (مائدہ: 8)۔

اسی آیت کی روشنی میں حضرت عمرؓ نے اپنے قاضیوں کو ہدایات جاری کیں۔ فرمایا:

”دو آدمیوں کے درمیان ایسی حالت میں فیصلہ نہ کرو کہ تم غصہ میں ہو“۔

اسلام بدلہ لینے کا حق تو دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

”جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت

کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لئے برآمد کا بدلہ۔“ (مانندہ: 45)۔

لیکن مغرب کو یہ ترغیب بھی دیتا ہے کہ اگر وہ معاف کر دے تو یہ بڑے دل گردے اور صبر کا کام ہے۔ قرآن میں آیا:

”نیکلی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی ہے وہ جگری دوست بن گیا ہے۔ یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں۔ اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیب والے ہوتے ہیں“ (ہم سجدہ: 34-35)۔

اسی سلسلہ میں یہ بھی فرمایا:

”اللہ عادل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے“ (نحل: 90)۔

یعنی اگر کوئی بدلہ لینے کی بجائے معاف کر دے تو یہ ”احسان“ ہے۔ لیکن یہ احسان اس کا ذاتی اور انفرادی معاملہ ہے ورنہ عدلیہ تو استغاثہ پیش ہونے پر عدلیہ کے مطابق فیصلہ کرنے کی پابند ہے۔ امام عادل تو ہوتا ہی وہ ہے جو عدل سے ہر موادھر ادھر نہ بنے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے اس کی تعریف کی ہے۔ فرمایا: ”امام عادل کا ایک دن ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے“ (مسند احمد)۔

یہ ہے اسلام کا عدل اجتماعی! انسانیت کو کیا ایسے عدل کی ضرورت نہیں؟ اسلام کے مخالفین کچھ تو سمجھ کریں۔

### تنظیم سازی کا حق

اسلام تعمیر و اصلاح کا دین ہے۔ تخریب و فساد کا قلع قمع کرتا ہے۔ جس طرح ایک باغ اپنی ہستی اور خوبصورتی کو قائم اسی صورت میں رکھ سکتا ہے کہ کوئی مالی اس کی دیکھ بھال، کانٹ چھانٹ اور پرورش و پرداخت پر معذور ہو اسی طرح کوئی گھر، کوئی معاشرہ اور خود انسانیت اپنے وجود اور شان کو قائم نہیں رکھ سکتی اگر کوئی نگران اور گروہ اس کو بگاڑ سے بچانے اور سنوار کر رکھنے پر معذور نہ ہو۔ اسلام نے بگاڑ سے بچانے اور سنوار کر رکھنے،

تقریر کرنے اور تحریب سے روکنے کے لئے ”امر بالمعروف ونہی عن المنکر“ جیسے کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کی خاص اصطلاح استعمال کی ہے۔ عام اس کا مطلب نیکی کو فروغ دینے اور برائی کا قلع قمع کرنے کے لئے جانا ہے لیکن ظاہر ہے نیکی کو فروغ دینا اور بدی کا قلع قمع کرنا خود ہی معنی رکھتا ہے کہ سنوار کر رکھا جائے اور ہٹا کر سے بچا جائے۔ یہ کام انفرادی سطح پر بھی کرنے کا ہے معاشرتی سطح پر بھی اور عالمی سطح پر بھی۔ معاشرتی اور عالمی سطح پر ظاہر ہے یہ کام ایک ٹیم، ایک تنظیم اور بالآخر امت کی سطح پر ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ فرد کو بھی اس کا پابند بنایا۔ مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

”رکوع اور سجدے کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، بدی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے اور اے نبی ان مومنوں کو بتا رت دے دو“ (توبہ: 112)۔

معاشرے کی سطح پر ایک ایسی جماعت کا ہونا ضروری قرار دیا جو یہی کام کرے فرمایا:

”تم میں ایک ایسی جماعت ہونی چاہئے جو نیکی کی طرف بلائے، بھلائی کا حکم اور برائیوں سے روکتی رہے۔ جو لوگ یہ کام کریں وہی فلاح پائیں گے“ (آل عمران: 104)۔

یعنی اصلاح و فلاح کی تنظیموں کا ہونا لازمی قرار دیا۔ چنانچہ یہی کام عالمی سطح پر کرنے کے لئے پوری امت مسلمہ کو ذمہ دار قرار دیا۔ فرمایا:

”(اے امت مسلمہ!) اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو“ (آل عمران: 110)۔

مل جل کر اصلاحی و فلاحی کام کرنے والی تنظیموں کے ہونے کو نبی کائنات ﷺ نے بھی لازمی قرار دیا جب فرمایا:

”جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ جو شخص جماعت سے علیحدہ ہوا وہ تجارتی راہ گرد و زخ میں گیا“ (ترمذی)۔

آپ ﷺ نے جماعت ہونے کے ساتھ اس میں لقم و ضبط کی بھی تاکید کی۔ فرمایا:

”جب تین آدمی سفر پر نکلیں تو اپنے میں سے کسی ایک کو امیر بنالیں“ (ابوداؤد)۔

سوال پیدا ہوتا ہے کس کو فکر ہے دنیا والوں کو سنوار کر رکھنے اور بگاڑ سے بچانے کی؟ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ طریق زندگی یعنی اسلام کو۔ اسلام پر حملہ آور ہونے والے کیا ایسی اصلاح و فلاح نہیں چاہتے؟

### معصیت سے اجتناب کا حق

اسلام کا یہ منفرد اعزاز کہ اس نے اپنے ہر شہری کو یہ حق دیا ہے کہ وہ ایسے حکم کی تعمیل سے انکار کر دے جس سے معصیت کا ارتکاب ہوتا ہو۔ ایسا انکار اسلامی قانون کی نگاہ میں کوئی جرم نہیں بلکہ مجرم قرار پائے گی تو وہ اتھارٹی جو ایسا حکم دیتی ہے۔ ایسے میں بوقت ضرورت عدالت سے رجوع کیا جاسکتا ہے جو نہ صرف اطاعت سے انکار کرنے والے کو تحفظ مہیا کرے گی بلکہ معصیت کا حکم کرنے والوں کو سزا بھی دے گی۔ حدیث میں آیا:

”امراء کی اطاعت واجب ہے جب تک کہ اللہ و رسول ﷺ کی مافرمانی کا حکم نہ دیا جائے، جب اللہ و رسول ﷺ کی مافرمانی کا حکم دیا جائے تو پھر نہ سننا ہے نہ ماننا“ (بخاری)۔

قرآن مجید میں اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کے بعد اور تحت اولی الامر (صاحب امر حضرات) کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ یعنی اسلام کا نظام اطاعت محض اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت سے مکمل نہیں ہوتا جب تک اولی الامر کی اطاعت شامل نہ ہو۔ البتہ وہی بات اولی الامر کی اطاعت شروط ہر بات سے کہ وہ خود اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت میں ہوں۔ قرآن میں آیا:

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع (اختلاف) ہو جائے تو اسے اللہ و رسول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقہ کار ہے اور انجام کے لحاظ سے بھی بہتر ہے“ (نساء: 59)۔

یہ جہاں اسلام! کیا اسلام کے مخالفین کو ایسی آزادی عمل کی ضرورت نہیں؟

### سیاسی زندگی میں شرکت کا حق

انسانیت کی ایک اور اہم ضرورت ہے کہ اجتماعی معاملات طے کرنے میں ہر کس و ماکس کو شمولیت کا

حق ہو۔ اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا:

”اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں“ (شوری: 38)۔

البتہ جیسے کہ ایک عمارت کی تعمیر میں متعلقہ انجینئروں اور ماہرین سے مشورہ لینا ہی سودمند ہوتا ہے کار خلافت چلانے کے لئے اگر کبھی قرآن و سنت سے براہ راست کوئی نص نہ ملے تو خلیفۃ المسلمین کو مشورہ ارکان شوریٰ سے لینا ہوتا ہے جو پوری امت کے اسی طرح معتمد نمائندے ہوتے ہیں جس طرح کہ خود خلیفۃ المسلمین۔ ان حضرات کو ان کی اہلیت کی بنا پر آگے لایا جاتا ہے جو قرآنی معیار اہلیت کے مطابق پانچ اوصاف یعنی ایمان (نور: 55)، تقویٰ (حجرات: 13)، صلاح (نور: 55)، علم اور جسم (بقرہ: 247) پر مشتمل ہے۔ ارکان شوریٰ ہوں یا اور عہدے دار اسلام لازم قرار دیتا ہے کہ ان پر صرف اہل حضرات کو تعینات کیا جائے۔ قرآن میں آیا:

”مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانت (بشمول عہدے) اہل امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔ اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے اور یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے“ (نساء: 58)۔

مطلب یہ کہ سیاسی زندگی میں شرکت کا حق تو اسلام ہر کس واکس کو دیتا ہے لیکن ایسے معتمد نمائندوں کے ذریعہ سے جو قرآنی معیار اہلیت پر پورے اترتے ہوں۔ یاد رہے آج کی رواں دواں جمہوریت میں ”سرمایہ“ ہی عوامی نمائندوں کے انتخاب میں واحد اہلیت کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اسلام ایک تو ”سرمائے“ کو معیار اہلیت ہی قرار نہیں دیتا، ایک محنت کش اور دروازہ کا دیہاتی بھی معتمد نمائندہ چنا جاسکتا ہے بشرطیکہ وہ قرآنی معیار اہلیت پر پورا اترتا ہو۔ دوسرے اسلام میں کسی بھی عہدے کے لئے کوئی بطور امیدوار کھڑا ہو کر عہدہ حاصل کرنے کی ٹنگ و دو ٹنگ نہیں کر سکتا۔ اسلام کسی بھی شہری کو ووٹ کا محتاج بنانا ہی نہیں اس لئے کہ چھلکی ووٹ ہی سب خرابیوں کی جڑ ہے۔ رسول ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

”نہیں دیتے ہم عہدہ اسے جو اسے مانگتا اور مانگتا پھرتے“ (بخاری و مسلم)۔

اسلام ہر کس واکس کو ایک اور ذریعہ سے سیاسی زندگی میں شرکت کا حق دیتا ہے اور وہ ہے بطور

مختص۔ اسلام میں مروجہ مختار حزب اقتدار اور حزب اختلاف کا کوئی وجود نہیں۔ صاحب اقتدار لوگ تو حزب اقتدار ہوتے ہی ہیں باقی ساری امت حزب اختلاف ہوتی ہے۔ کوئی بھی شہری خود خلیفۃ المسلمین کا احساب کر سکتا ہے، دامن پکڑ کر یا بذریعہ عدالت۔ اس کے لئے اسلام لازم قرار دیتا ہے کہ خلیفۃ المسلمین روز و شب کے چوبیس گھنٹوں میں کم از کم پانچ دفعہ خود دار الخلافہ کی مرکزی مسجد میں حاضر ہوا اور امامت کرے۔ یہ بھی اسلام کا اعزاز کہ وہ سالوں اور درخواست گزاروں کو زحمت نہیں دیتا کہ وہ ہکمرانوں کے پاس جائیں بلکہ ہکمرانوں کو کم از کم پانچ اوقات میں لوگوں کے درمیان لانا ہے اور وہ بھی ایک پاکیزہ اور خدا ترس ماحول میں۔ یہ ہے اسلام! ہر کس واکس کو سیاسی زندگی میں بھرپور شرکت کا حق دینے والا۔ اصل میں اسلام کی مخالفت کرنے والے نہ صرف پوری انسانیت کی بلکہ بالواسطہ خود اپنی مخالفت کرتے ہیں، اکثر و بیشتر انجان پن میں۔

### آزادیِ نقل و حرکت اور سکونت کا حق

اسلام اپنے ہر شہری کو نہ صرف اپنی مرضی کی جگہ آنے جانے اور وہاں سکونت اختیار کرنے کی اجازت دیتا ہے بلکہ ایسا کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا:

”تم سے پہلے بہت سے دور گزر چکے ہیں، زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جنہوں نے اللہ کے احکامات و ہدایات کو جھٹلایا“ (آل عمران: 137)۔

بوقتِ ضرورت ہجرت کرنے کی ترغیب دی۔ فرمایا:

”جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کے لئے بہت جگہ اور مسرعات کے لئے بڑی گنجائش پائے گا۔ اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کے لئے نکلے پھر راستے ہی میں اسے موت آ جائے، اس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہو گیا۔ اللہ بہت بخشنے والا اور رحیم ہے“ (نساء: 100)۔

کسی جگہ پر اگر رواں دواں نظام ایسا ہو کہ وہ کسی کو اسلامی زندگی گزارنے کی راہ میں حائل ہو تو ایسی جگہ سے کسی ایسی جگہ پر ہجرت کرنا کہ جہاں اسلامی زندگی گزارنا ممکن ہو لازم قرار دے دیا بلکہ ایسے میں ہجرت نہ کرنا خود پر ظلم قرار دیا۔ قرآن میں آیا:

”جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے ہیں ان کی رو میں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔ فرشتوں نے کہا کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنکا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بڑا ہی بُرا ٹھکانہ ہے“ (نساء: 97)۔

اس آئے مبارک سے یہ بھی ماخوذ ہوتا ہے کہ ایسی جگہ جہاں پر اسلامی زندگی گزارنے کے زیادہ مواقع ہوں کو چھوڑ کر ایسی جگہ پر جانا کہ جہاں مقابلہ مواقع کم ہوں نہ صرف ممنوع بلکہ خود پر ظلم کرنا ہے۔ یہی وہ ایک شکل ہے جو من مرضی کی جگہ جانے کی اجازت نہیں دیتی اور یہ بھی اس لئے کہ ایسی صورت میں ایک مسلمان اپنے آپ پر خود ظلم کرنا ہے۔ البتہ یہ بھی کہ ایسی جگہ پر بغرض تعلیم، علاج، تبلیغ جانے اور مقصد حاصل ہوتے ہی اولین فرصت میں واپسی کی اجازت ہے۔ جس خوبصورت انداز سے اسلام دنیا بھر میں نقل و حرکت اور سکونت کی اجازت دیتا ہے، سلام کے مخالفین کو کیا ایسی انسانی ضرورت کے پورا ہونے کے حق میں نہیں؟

### اجرت اور معاوضہ کا حق

آج کی دنیا میں آجر و اجیر، مالک و مزدور کے درمیان اکثر و بیشتر کشیدگی کی صورت پائی جاتی ہے۔ جن وجوہات کی بنا پر ایسی صورت حال پیدا ہوتی ہے مثالوں اور تالہ بندیوں تک نوبت آئی ہے، اسلام ان میں سے ایک ایک کا مداوا کرتا ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ پیشہ مزدوری کو حقیر سمجھا جاتا ہے۔ کئی معاشروں میں تو ان سے جانوروں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ اسلام نہ صرف ایسی ذہنیت کا سخت مخالف ہے بالخصوص وہ ہاتھ سے کمائی کرنے والے کو عزت بخشتا ہے۔ نئی کائنات ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”ہاتھ سے کمائی کرنے والا اللہ کا محبوب ہے“

اسلام میں، جیسے کہ پہلے ذکر ہوا رنگ، نسل، زبان، علاقہ، عہدہ وغیرہ معیار فضیلت نہیں، ادنیٰ و اعلیٰ ہونے کا معیار صرف تقویٰ ہے۔

دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ کارکن کا استحصال کرتے ہوئے اس سے طے شدہ جہز ارادہ سے زیادہ کام لیا

جاتا ہے۔ اسلام نے اس رجحان کا سختی سے قلع قمع کیا ہے۔ فرمایا:

”ہم کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔“ (مومنون: 62)۔

اسی بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”مزدوروں کو معروف کے مطابق مناسب نقد اور لباس دیا جائے اور ان پر کام کا اتنا ہی بار ڈالا جائے جتنا کہ وہ برداشت کر سکتے ہوں“ (موطا امام مالک)۔

یعنی اس حدیث پاک میں یہ بھی تاکید کی گئی کہ کارکن کو مناسب معاوضہ دیا جائے اس لیے کہ معاوضے کا پہلو بھی اکثر مالک و مزدور میں نزاع کا باعث بنا رہتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ مزدور کو مزدوری کی ادائیگی میں تاخیر کی جاتی ہے۔ اس بارے میں اسلام نے جو نہری اصول دیئے ان میں سے محض ایک اصول صنعت و حرفت کے پورے نظام کو رحمت و شفقت کا مظہر بنا دیتا ہے۔ فرمایا:

”مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کی جائے“ (تہی، ابن ماجہ)۔

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ”مزدور کی اجرت طے کئے بغیر اسے کام پر نہ لگایا جائے“ (تہی)۔

ایک اور موقع پر فرمایا:

”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قیامت کے دن میں تین آدمیوں کا دشمن ہو گا۔ ایک وہ جس نے میرا مال لے کر ہمد کیا اور اس سے پھر گیا۔ دوسرا وہ جس نے آزاد کو بیچ کر اس کا مول کھلایا اور تیسرا وہ جس نے مزدور سے پوری محنت لی اور پھر اس کی اجرت ادا نہ کی“ (بخاری)۔

ایک اور پہلو جو مالک و مزدور میں نزاع کا باعث بن جاتا ہے یہ ہوتا ہے کہ مزدور مزدوری تو لینے کے درپے ہوتا ہے لیکن کام کرنے میں ڈنڈی مانتا ہے یعنی کام چور ہوتا ہے۔ اسلام نے اس ذہنیت کا بھی نوٹس لیا ہے۔ فرمایا:

”اور یہ کہ انسان کو وہی ملے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی پھر اس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا“ (نجم: 39-41)۔



یعنی معاملہ صرف اس دنیا تک محدود نہیں۔ واسطہ اس ہستی سے ہے جو اندرون دل اور نیتوں تک کو جاننے والا ہے۔ جان بوجھ کر کام میں ڈنڈی مارنے والے کو اپنے بر عمل کا حساب ایک دن بھگتنا ہے۔ ایک اور وجہ جو آج اور اجیر کے مابین اکثر کشیدگی و نفرت کا باعث بنتی ہے وہ ہے آج کی بلا دینی (High handedness) اور اجیر کا گستاخانہ رویہ (Rudeness) اسلام ان امراض کا مجموعی زندگی میں مداوا کرتا ہے۔ فرمایا:

”ایک مینھا بول اور غلطی معاف کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو۔ اللہ بے نیاز ہے اور بردباری اس کی صفت ہے۔“ (بقرہ: 263)۔

قرآن مجید بڑے پیار سے رسول اللہ ﷺ کی ایک صفت کو بیان کرتا ہے۔ فرمایا:

”(اے پیغمبر!) یا اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو اگر کہیں تم تند خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔ ان کی غلطیوں سے درگزر کرو۔ ان کے حق میں دنائے مغفرت کرو اور معاملات میں ان کو بھی شریک مشورہ کرو۔“ (بقرہ: 159)۔

دنیا میں اسلام کے علاوہ کیا کوئی دوسرا نظام ایسا ہے جو آج و آجیر کے مابین اس قدر خیر خواہی، الفت اور جذبہ محبت پیدا کرے؟ کیا اسلام کی مخالفت کرنے والوں کو ایسے مبارک نظام کی ضرورت نہیں؟ کس قدر نادانی اسلام پر یلغار کرنے والوں کی!

### خلاصہ کلام و چند شبہات اور ان کی وضاحت

اسلام کیا ہے؟ انسانیت کی بھلائی، خیر خواہی اور بہتری کا دوسرا نام اسلام ہے۔ مثال کے طور پر اسلام کا صرف یہ مطالبہ ہی نہیں کہ صاف ستھرے رہو بلکہ اس کے نزدیک صفائی نصف ایمان ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ صفائی کیا انسانیت کی ضرورت نہیں؟ کیا انسان کو غلط رہنا چاہئے؟ اسلام کا کہنا یہ ہے کہ حلال کمائی کرو۔ مباحز ذرائع سے یا کسی کو دھوکا فریب دے کر یا کسی دوسرے کے نقصان پر خود فائدہ حاصل نہ کرو۔ ذخیرہ اندوزی مت کرو یعنی مال کو اس لئے نہ روکو کہ مہنگا ہوگا تو دو گئے کمائیں گے۔ ملاوٹ، سنگٹنگ، رشوت، بدعنوانی، کام چوری وغیرہ یعنی ہر وہ روش جس سے دوسرے کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو اسلام اسے مباحز اور گناہ

قرار دیتا ہے۔ کیا رزق حلال کے متعلق یہ تعلیمات انسانیت کے حق میں سراپا رحمت نہیں؟ اسلام چائی کے ساتھ معاملہ کرنے والے ماجر کو قیامت کے دن نبیوں، صدیقیوں اور شہیدوں کا ساتھی قرار دیتا ہے تو کیا یہ امانت دارانہ تجارت انسانیت ہی کی بھلائی کے لئے نہیں؟ اسلام کا مطالبہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے پر ظلم نہ کرے۔ یہاں تک فرمایا کہ ”جو شخص کسی کی بالشت بھر زمین نظماً لے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سات زمینوں کا طوق اس کی گردن میں ڈالے گا۔ ظلم کا قلع قمع کرنا کیا انسانیت کے حق میں مفید نہیں؟ اسلام کی ہدایت یہ بھی ہے کہ مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔ یقین جانیں اگر پوری انسانیت اس ایک اصول کی پابندی کرتی تو سرمائے اور محنت کے درمیان آج جو گہرے مسائل پیدا ہو چکے ہیں کبھی پیدا نہ ہوتے۔ اسلام کی یہ بھی تعلیم ہے کہ ضرورت سے زائد پانی نہ روکو یعنی اپنا حصہ تو ضرور لو لیکن دوسروں کا حصہ ان کو دو۔ اسلام کا یہ بھی سنہری اصول ہے کہ جو کچھ تم اپنے لئے پسند کرو، اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند کرو۔ جنت بنتا بن جائے یہ دنیا اگر اس بے مثل اصول پر پوری انسانیت عمل پیرا ہو۔ اسلام کا یہ بھی قانون ہے کہ مرنے والے کی جائیداد اس کے وارثوں میں، مردہوں یا عورتیں تقسیم کرو۔ پھر اسلام اس تقسیم کو یوں مناسب و متوازن بناتا ہے کہ معاشرے میں جتنا کسی پر زیادہ بوجھ ہے اتنی ہی وراثت میں اسے زیادہ حصہ دیا گیا ہے۔ ورنہ کوئی اپنا اپنا مقرر حصہ و حق کا حصول کیا انسانی فلاح کا ضامن نہیں؟ اسلام سود کو حرام قرار دیتا ہے۔ دیکھئے اسلام کی اس ایک تعلیم سے انحراف نے آج پوری دنیا کو عالمی سودی نظام کی شکل میں جس قدر تباہی کے دبانے لاکھڑا کیا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ اسلام رشوت لینے والے اور دینے والے دونوں پر لعنت بھیجتا ہے تو کیا یہ حقیقت نہیں کہ رشوت کا وجود انسانیت کے خلاف ایک بہت بڑی سازش ہے؟

اسلام نکاح کی ترغیب داتا کید اور زنا کی قطعاً ممانعت کرتا ہے۔ مغربی دنیا اس کے برعکس اگر آج عمل پیرا ہے تو خود محسوس کر رہی ہے کہ یہ ایک گمراہی شاید اسے صفیر ہستی سے منادے۔ انسانی رشتوں کا تقدس ماضی کی داستان بن چکا ہے۔ گھر ویران ہو گئے۔ خاندانی یونٹ کا شیرازہ بکھر گیا۔ بظاہر انسان لیکن گرے تو اس حد تک کہ بلیوں اور کتوں سے دل بہلانے لگے۔ پھر یہ بھی اسلامی ہدایت ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ اس ہدایت سے بھی مغرب والوں نے روگردانی کی تو آج بڑی عمر والے ”معمرخانوں“ میں مقید

اپنی اپنی اولاد کا منہ دیکھنے کو ترس گئے۔ اسلام کا یہ بھی مطالبہ ہے کہ ہر زیر دست و ماتحت یعنی نوکر، خادم وغیرہ سے شفقت سے پیش آؤ تو کیا ایسا کرنا انسانیت کے حق میں نہیں؟ اسلامی امت کا ایک فرض منہی یہ ہے کہ وہ اپنے ہاں کفالت عامہ کا نظام رائج کرے یعنی ہر معذور بے روزگار بے سہارا وغیرہ کا وظیفہ مقرر کرے تو کیا ایسا پروگرام انسانیت کی فلاح و بہبود کا ضامن نہیں؟ اسلام کا یہ بھی دستور ہے کہ ہر اس فرد کی طرف جو گردشِ دوراں کا شکار ہو گیا ہو مثلاً بیوہ ہو یا بے سہارا بیٹی، مسکین ہو یا یتیم، مسافر ہو یا قیدی دستِ تعاون بڑھاؤ۔ سائل و حرم کو تو کھاتے پیتے لوگوں کا شریک دولت بنادیا۔ دنیا بھر کے اقتصادیات کے ماہرین اگر صرف اسلام کے نظامِ زکوٰۃ کا تجزیہ کریں تو مانے بغیر نہ رہیں کہ کتنا بڑے کتوں اور سعادوں بھرا ہے یہ نظام بے بدل۔ والدین، اولاد، رشتے داروں، استاد شاگرد، آجر مزدور، میاں بیوی کے حقوق کی فہرست دی تو لمبی چوڑی۔ کیا ایسا نظام انسانیت ہی کے حق میں سراپا رحمت نہیں؟

اسلام ہی کی یہ تعلیمات ہیں کہ وقت کی پابندی کرو، عہد کا پاس کرو، بیچ بولو، جھوٹ مت بولو، جھوٹی گواہی نہ دو، فریب و دھوکا دی کے قریب نہ جاؤ، عجز و انکساری کا دامن قدامت و تکبر و غرور کو قریب نہ پہنچنے دو، حق سے زیادہ کی حرص نہ کرو، عہدوں کو چھلانی ہوئی نگاہوں سے نہ دیکھو، بے جا حمایت اور طرفداری نہ کرو، لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف سے کرو، چغل خوری اور غیبت سے پرہیز کرو، کسی کو گالی نہ بکھو، نہ کسی کو برے القاب سے یاد کرو، کسی کی حقیر نہ کرو، کم درجے والوں کا احترام کرو، بے جا تعریف نہ کرو، حسد سے بچو، بد نگاہی سے بچو، جذبات کا شکار نہ ہو، وقار اور سنجیدگی کا دامن قدامت و زبان کی حفاظت کرو، ایذا رسانی کا رویہ ممنوع، آشنا ہو یا ما آشنا جو سامنے آئے اسے سلام کرو، خیر خواہی و بھلائی کا وسیلہ اختیار کرو، علم حاصل کرو، جہالت سے بچو، جماعتی زندگی گزارو، ایک دوسرے کے ہمدرد و سناٹھی بنو، ضبط و تحس کا دامن باتھ سے نہ چھوٹنے پائے، انکم و ضبط کی پابندی کرو، امیر کی اطاعت لازم، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض ہیں۔ بتائیے ان احکامات میں سے کوئی ایک بھی ہے جو انسانیت کے حق میں سراپا خیر نہ ہو؟ اسلام کا تو یہ بھی طرہ امتیاز ہے کہ وہ ان احسن اوصاف و عادات کو ایک یا چند افراد تک محدود نہیں کرتا، لازمی قرار دیتا ہے کہ دنیا کے ہر فرد تک خواہ وہ کہیں ہمالہ پر ہی کیوں نہ ہو پہنچایا جائے تاکہ یہ پوری دنیا حسن و خوبی کا مرقع ہو۔

پھر جس حق..... اسلام شکر نعمت کی تعلیم دیتا ہے، ممبر و استقامت کا درس دیتا ہے۔ شرم و حیا کی تلقین کرتا ہے۔ عریانی و فحاشی کو انسانیت کے لئے تباہی و مہربادی ٹھہراتا ہے۔ پردے کے مفصل قوانین دیتا ہے۔ انسانیت کو بے راہ روی سے روکنے کے لئے عبادات کا ایک جامع اور مستقل پروگرام دیتا ہے۔ اللہ پر بھروسے کی تلقین کرتا ہے۔ خدمت خلق، امن و سلامتی، علم و برداری کی تاکید کرتا ہے۔ شراب، جوئے، سنے وغیرہ کو حرام قرار دیتا ہے۔ جزا و سزا، جہنم و دوزخ کا نظام وضع کر کے بندوبست کرتا ہے کہ ہر انسان اپنی خیر خواہی و فلاح کی خاطر مذکورہ احکامات کو اپنی زندگی میں نافذ کرے۔ شتر بے مہار اور مادر پدر آزاد ہو کر من مانیوں نہ کرے۔

ایک طرف تو اس سے انکار ناممکن ہے کہ اسلام ہے ہی سچائیوں، بھلائیوں اور خیر خواہیوں کا دوسرا نام لیکن دوسری طرف اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ دنیا کی ایک عظیم آبادی اسلام کے فیوض و بہ کات سے محروم ہی نہیں بلکہ اس کی مخالف ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر کیوں؟ تجزیہ کریں تو بات دواور دو چار کی طرح واضح ہے کہ سچائیوں کا حصول اس کے بغیر ممکن ہی نہیں کہ انسان کچھ پابندیاں قبول کرے، کچھ قربانیاں دے اور کچھ مشقتیں جھیلے۔ سڑک پر نصب کردہ ٹریفک کے اشارات یوں تو پابندیاں لگاتے ہیں لیکن ظاہر ہے منزل مقصود پر یہ حفاظت پہنچنے کے لئے ان کی پابندی کرنا از بس ضروری ہے۔ اس طرح پابندیاں قبول کرنا، قربانیاں دینا اور مشقتیں جھیلنا ہے تو انسانی فلاح و بہبود کا ضامن لیکن سب پسند انسان ان سے حیلے بہانے فرار کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ ٹریفک کے اشارات کی پابندی نہ کرنے کے نتائج تو خیر فوراً سامنے آ جاتے ہیں لیکن اخلاقی اقدار کو المیامت کرنے کے نتائج آخرت میں تو یقیناً برآمد ہوں گے ہی اس دنیا میں بھی برآمد ہو کر رہتے ہیں خواہ کچھ دیر کے بعد ہی کیوں نہ ہوں۔ آج کی دنیا اگر ظلم و ستم، امتیاز و خلفشار، جس کی لالچی اس کی بھینس، دوہرے معیار، نفسا نفسی اور افراط و تفریط کا شکار ہے تو اس کی بنیادی وجہ انسانوں کی ایک عظیم اکثریت کا سچائیوں سے فرار ہے۔ ایسے دانشور بھی آدھمکے ہیں جنہوں نے اسلام ہی کو متنازع و حرف تنقید بنادیا تا کہ فرار فرار ہی نظر نہ آئے بالکل اسی طرح جس طرح کہ کوئی غاصب اپنے دل کو مطمئن کرنے کے لئے کئی جواز ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔ جیسے کوئی شرابی شراب پی کر جب احساس گناہ سے مغلوب ہونے لگتا ہے تو خود کو یہ کہہ کر اس احساس سے بچانے کی کوشش کرتا ہے کہ ”پلو شراب ہی پی ہے کسی کا خون تو نہیں پیا“۔

اسلام کے چند ایسے پہلوؤں کو جنہیں ان دانشوروں نے ہدف تنقید ہی نہیں ہدف تحقیر و استہزاء بھی بنایا ہے کا ذیل میں ذکر اس لئے کیا جاتا ہے کہ ان کی اصلیت سے آگاہی ہو۔ یعنی یہ وضاحتیں بس معترضین کے ایک خاص طبقہ کے لئے ہیں ورنہ ایک مسلمان کے لئے اللہ و رسول ﷺ کی طرف سے ثابت ہونے کے بعد کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

- ☆ تعدد ازواج یعنی ایک سے زیادہ بیویوں کا ہونا۔
- ☆ مرد و عورت کے حقوق میں عدم مساوات۔
- ☆ اسلامی سزاؤں کا سخت ہونا۔
- ☆ جہاد فی سبیل اللہ یعنی اللہ کے راستے میں مسلح جدوجہد۔

ذیل میں ان پہلوؤں میں سے ہر ایک کا ہم جائزہ لیتے ہیں یہ جاننے کے لئے کہ آیا زیر بحث و تنقید یہ پہلو انسانیہ کے حق میں ہیں یا کہ مخالف۔ پیشتر اس کے کہ ہم ان موضوعات کی طرف آئیں دو بنیادی باتوں کا ذکر ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام کا مرکزی تصور یہ ہے کہ انسان اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو کیا میت نہیں ہو جاتا بلکہ ایک ایسی زندگی میں داخل ہوتا ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ اس دنیا میں کینے گئے اس کے ہر فعل کو ریکارڈ کیا جا رہا ہے اور قیامت کے دن یہ ریکارڈ نکال لایا جائے گا یہ طے کرنے کے لئے کہ اس انسان کی نیکیاں زیادہ ہیں یا برائیاں؟ نیکیوں کا پلڑا جھک گیا تو اسے جہنم نصیب ہوگی اور برائیوں کا پلڑا جھکا تو دوزخ اس کا مقدر ٹھہرے گا۔ دوسری بات جو نوٹ کرنے کے قابل ہے یہ ہے کہ اسلام کا یہ منفرد اعزاز ہے کہ وہ ہر فرد مرد و عورت کو وراثت میں حصہ دار بناتا ہے اور وراثت کا یہ نظام ظاہر ہے سچی چل سکتا ہے جب ہر فرد کی نسلی شناخت ہو یعنی چینی پتہ ہو کہ اس کی ماں کون ہے اور باپ کون؟ اب تفصیل ملاحظہ ہو:

### تعدد ازواج

تعدد ازواج (polygamy) کے بارے میں یہ ذہن میں رہے کہ اسلام نے اسے دنیا میں متعارف نہیں کرایا بلکہ ان گنت معاشروں میں یہ پہلے سے موجود تھی۔ اسلام نے صرف اسے محدود و باقاعدہ کیا۔ اس میں سب سے بڑی جو بے قاعدگی موجود تھی وہ بیک وقت بیویوں کی تعداد میں کسی حد (Ceiling)

کانہ ہوتا تھا۔ کھاتے پیتے حضرات سینکڑوں بلکہ ہزاروں بیویوں کی فوج ظفر موج کشمی کر لیتے تھے اور اس جھوم بے کنار کے لئے ایک خاص اصطلاح یعنی ”حرم“ کا چرچا تھا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں عورت کی حیثیت ایک محترم و معزز انسان سے کم ہو کر صرف ایک قابل استعمال چیز (Commodity) کی رہ جاتی تھی۔ اسلام نے تعدد وازواج پر پابندی لگائی اور اب کوئی ارب پتی مسلمان بھی کہ جس کی جائیداد دنیا کے مختلف حصوں میں موجود ہو بیک وقت چار بیویوں سے زیادہ نہیں رکھ سکتا۔ تاہم ہمارا آج کا موضوع، بحرف یہ ہے کہ یہ چار بیویاں بھی شروع کیوں ہیں ایک ہی کیوں نہیں؟

ابتدا ہی میں یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ دنیا میں کوئی معاشرہ خالص یک زوجگی (mono gamous) نہیں رہا اور نہ ہے۔ جس طرح اس دنیا کے کئی معاشروں نے رہبانیت اور بے زوجگی کا تجربہ کیا لیکن انجام کار فطرت سے اس انحراف کو نباہ نہ سکے بلکہ اکثر و بیشتر نے ازدواجی تعلقات کو عبادت ہی کا حصہ بنا دیا اسی طرح دعویٰ تو آج بھی کئی معاشرے یک زوجگی کا کرتے ہیں لیکن واقعات کی دنیا میں متعدد بیویوں کا کسی نہ کسی طور رستہ نکال لیا ہے۔ یہ عصمت فروشی (prostitution) زنا (adultery) اغوا (abduction) ورنٹا (seduction) عارضی شادی (temporary marriage) آزمائشی شادی (Trial marriage) محبت کی شادی (love marriage) مخلوط رہائش (mixed living) مشترکہ رہائش (cohabitation) ہم روانہ شادی (week-end compassionate marriage)، آخر ہفتہ آوارہ گردیاں (one sex wanderings) ساحلی عیاشیاں (beach picnics) ہم جنس شادیاں (re marriages) بعد از طلاق شادیاں (re marriages) آخر کس شرارت اور کس رجحان کا شاخسانہ ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب انسانی فطرت پر مصنوعی پابندیاں لگائی گئیں تو اس ایک سر اور دو ہاتھوں والے انسان نے کئی راستے خود نکال لیے۔

اسلام جو دہی فطرت ہے کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ وہ انسانوں کو بے قاعدہ گیوں، بے ہودگیوں اور بے راہ رویوں کے حوالے کر دیتا؟ اس نے اس بے ہنگم و بے قاعدہ ڈرامے کو باقاعدہ (systematize)

کیا ہے۔ آپ اس بارے میں جتنا بھی سوچیں بلاآخر اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکیں گے کہ اسلام نے تعدد ازواج کی اجازت دے کر اور اس اجازت کو ایک حد یعنی چار بیویوں تک محدود کر کے انسانیت کی بے مثل خدمت کی ہے۔

مذکور بالا بحث تو ہم نے محض انسانی سرشت کے حوالہ سے کی ہے لیکن واقعات کی دنیا میں ان گنت ایسے عملی حقائق ہیں جن سے بہر حال اس دنیا کے مکینوں کو واسطہ پڑتا ہے۔ چند ایسے حقائق، جن سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں، کا ذکر ہم ذیل میں کرتے ہیں۔

پہلی حقیقت تو یہ ہے کہ گویا نسل پر اس دنیا میں مردوں اور عورتوں کی تعداد پچاس پچاس فیصد ہوتی ہے لیکن چونکہ مرد حضرات اپنے فرائض کی نوعیت کے اعتبار سے ساوی بلاؤں اور حادثات سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں لہذا وقت کے کسی بھی موڑ پر دنیا میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں ہمارے ہاں پاکستان میں مثال کے طور پر عورتوں کی تعداد 52 فیصد ہے تو مردوں کی 48 فیصد۔ اس طرح دنیا بھر میں عورتوں کی تعداد مردوں کی تعداد سے کروڑوں زیادہ ہے۔ لیکن اگر ایک کروڑ زائد بھی فرض کر لی جائے تو اس کا مطلب ہے کہ ایک زوجگی کی صورت میں ایک کروڑ عورت کا یہ حق چھن جائے گا کہ وہ شوہر والی ہو۔ بتائیے اس سے بڑا ظلم کسی عورت پر اور کیا ہو سکتا ہے کہ اسے ماحیات حق زوجیت سے محروم کر دیا جائے۔ وہ بے شوہر، بے اولاد اور بے گھر رہے۔ اگر تعدد ازواج کو ایک برائی فرض کر لیا جائے تو یہ بے زوجگی تو اس سے کئی گنا بڑی برائی ہے۔ جنگ عظیم اول و دوم میں جب عورتوں اور مردوں کا باہمی تناسب غیر معمولی طور پر درہم برہم ہو گیا یعنی مردوں کی تعداد عورتوں کے مقابلہ میں متحدہ کم ہو گئی تو اس مسئلے کو جس طرح کئی غیر مسلم معاشروں نے حل کیا ہے حل ہی رہنے دیا، انسانیت کے ماتھے پر وہ کلک کے ٹپکے سے کم نہیں۔

کہا جاسکتا ہے کہ جنگ تو کبھی کسی ایک ملک میں ہو گئی یا نہ ہی ہوئی لیکن تعدد ازواج کو ہمیشہ کے لئے ایک ضابطے کی حیثیت دے دینا کیا حماقت نہیں؟ یاد رہے اول تو کوئی جنگ کسی ایک ملک تک محدود نہیں رہتی اور اگر رہے بھی تو بین الاقوامی شادیوں کی اس دنیا میں ایک عام ریت ہے۔ پھر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ آج کی دنیا کا کوئی نہ کوئی حصہ ضرور جنگ و جدل کی زد میں رہتا ہے۔ پھر مرد و پانٹ بھی ہوتے ہیں، ڈرائیور

بھی، ملاج بھی، مزدور بھی، ملکینک بھی اور فوجی جوان بھی بتائیے بالعموم حادثات کا شکار مرد زیادہ ہوتے ہیں یا عورتیں؟

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ اگر ہر آدمی چار چار شادیاں کرے تو کیا اس صورت میں عورتوں کی کمی واقع نہیں ہو جائے گی؟ ایسا نہ ہونے کا ویسے تو یہی ثبوت کافی ہے کہ دنیا کی شادیاں کا جائزہ نہیں غیر مسلم دنیا کی تو بات درکنار، مسلم ممالک میں بھی باوجود چار بیویوں کی اجازت کے عورتوں کی تعداد اکثر و بیشتر مردوں سے زیادہ ہے۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ دنیا میں 99.9 فیصد مسلمان ایسے ہیں کہ جو یک زواج ہیں۔ اصل میں دو، تین یا زیادہ سے زیادہ چار بیویوں کی اجازت ہے، حکم نہیں اور یہ اجازت بھی غیر معمولی حالات کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہے ورنہ اس میں کیا شک ہے کہ یک زواج ہونا ایک بہت بڑی نعمت ہے (nothing like one wife)۔ عمل کی دنیا میں جتنا کھریلو سکون و راحت ایک بیوی سے ہوتا ہے، دو یا دو سے زیادہ سے نہیں ہوتا۔ کسی کو شک ہو تو تجربہ کر کے دیکھ لے۔ تعدد زواج کی صورت میں ویسے تو بے اعتدالی کی فضا کا ہونا ایک لازمی امر ہے، پھر اکثر و بیشتر اولاد کی باہمی چپقلش اور جائیدادوں کے جھگڑے بسا اوقات بڑے ہولناک نتائج کو جنم دیتے ہیں۔

ایک اعتراض یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب (چار تک) متعدد بیویاں ہوں گی تو امکان اغلب ہے کہ شوہر کسی ایک بیوی کو دوسری پر ترجیح دے اور اس طرح دوسری بیوی ایویوں کی حق تلفی بلکہ دل شکنی ہو۔ اجازت دینے والا اللہ اس جھول کو خوب جانتا تھا لہذا اس نے متعدد بیویوں کی اجازت غیر مشروط نہیں مشروط دی ہے اور اس بارے میں شرط ہے یہ کہ ہر بیوی سے مساوی سلوک کیا جائے۔ قرآن میں آیا:

”اور اگر تم قیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو تین تین چار چار سے نکاح کر لو۔ لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو“ (النساء: 3)۔

بالفاظ دیگر دو اور دو سے زیادہ بیویاں اور چار تک رکھنے کی اجازت عدل کی شرط کے ساتھ ہے۔ اگر کوئی عدل کی شرط پوری نہ کر سکے تو اس کے لئے تعدد زواج کی اجازت ہے ہی نہیں۔ کوئی معترض یہ بھی کہہ



سکتا ہے کہ چلو اجازت شروع ہو لیکن کوئی مرد اس اجازت سے اجازت فائدہ بھی تو اٹھا سکتا ہے یعنی وہ دوسری شادی تو شرط قبول کرتے ہوئے کرتا ہے لیکن بعد میں شرط پر قائم نہیں رہتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کوئی شوہر ایسا بھی کر سکتا ہے لیکن اگر وہ ایسا کرے تو اسلام کی نگاہ میں اسی طرح گناہگار اور مجرم ہے جیسے کہ وہ کوئی اور گناہ کرے۔ گناہ کے مرتکب کو تو بہر حال روزِ محشر احتساب کی چٹائی سے گزرنا ہے وہ کسی طور اپنے کئے کی سزا سے بچ نہیں سکتا۔ تاہم اسلام ایسے شخص کی گرفت کو صرف آخرت میں ہی یقینی نہیں بناتا اس دنیا میں اسلامی حکومت کو حق حاصل ہے کہ جس بیوی یا جن بیویوں کے ساتھ وہ انصاف کرنے سے قاصر رہا ہو ان کی وادری کرے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو شخص تعددِ زوجات کی سہولت کو مفلاً استعمال کر سکتا ہے وہ تو یک زوجی کو بھی مفلاً استعمال کر سکتا ہے۔ کیا دنیا میں ایسے انسانوں کا وجود نہیں کہ جو طلاق پر طلاق دے کر نئی شادیاں کرتے ہیں؟ تاریخ میں ایسے ایسے ایک زوج بھی پائے گئے ہیں کہ جنہوں نے سو سو تک شادیاں کیں۔

انسانوں کی دوسری ضرورت جس کے لئے تعددِ زوجات کی سہولت ایک نعمتِ غیر مترقبہ بتا ہو سکتی ہے وہ صورت ہے کہ جب بیوی بانجھ ہو، بیمار ہو یا مجذوب وغیرہ ہو۔ ایسے میں ایک شخص کو مجبور و محدود رکھنا کہ وہ دوسری شادی نہ کرے ظاہر ہے اسے ایک بڑے انسانی حق سے محروم رکھنا ہے۔ فطرت کے خلاف لڑنے کے عادی معاشرے تو شاید اس حق کو غصب ہونے دیں لیکن اللہ کی دی ہوئی شریعت یہ برداشت کرے تو کیسے؟

آخر میں ہم ایک اور اعتراض کا جائزہ لینا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ کوئی شریعہ یا اعتراض بھی تو کر سکتا ہے کہ جب شوہر کو چار تک متعدد بیویاں رکھنے کی اجازت ہے تو بیوی کو ایسی اجازت کیوں نہیں کہ وہ متعدد شوہر (polyandry) رکھے؟ بظاہر یہ اعتراض ذہن کو بڑا اچیل کرتا ہے۔ لیکن ذرا گہرائی میں جائیں تو اس حماقت کا بھید کھل جاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، اسلام کا یہ منفرد پہلو کہ وہ مرد ہو یا عورت کسی کو وراثت سے محروم نہیں کرتا۔ قرآن میں آیا:

”مردوں کے لئے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لئے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو۔ تھوڑا ہو یا بہت حصہ۔ (ہر دو کا) بہر

حال ہے“ (النساء: 7)۔

لاریب، وراثت کا یہ نظام بھی رو بہ عمل ہو سکتا ہے جب کہ ہر فرد، مرد و عورت کا نسلی شخص ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہو یعنی روز روشن کی طرح واضح اور مسلمہ ہو کہ اس کا باپ فلاں ہے اور ماں فلاں۔ اس میں بھی کیا شک کہ متعدد شوہروں کی صورت میں یہ نسلی شخص مشکوک و مبہم ہی نہیں کلیتہً درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ متعدد شوہروں میں سے ہر ایک کی یہ حتمی کوشش ہوتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اولاد کا بوجھ اس کی بجائے، کسی دوسرے شوہر پر پڑے۔ یہی نہیں بلکہ ہر شوہر کی کوشش و خواہش ہوگی کہ گھریلو اخراجات اسے کم سے کم برداشت کرنے پڑیں۔ شاید یہاں تک نوبت آجائے کہ بیوی کو ان شوہروں کے زرخے سے نکل کر اور خود ماکر اولاد کا پیٹ پالنا پڑے۔ اسلام تو بیوی اور اولاد کے ان و نفقہ کا ذمہ دار مرد کو قرار دیتا ہے لیکن متعدد شوہروں والے گھر میں صورت حال بالکل اس کے برعکس ہو جائے گی۔ زیر آسمان شاید ظلم کی اس سے بڑی انتہا کوئی نہ ہو۔ تجربہ شائد فطری ظلم میں انسانی مداخلت ہوئی تو بد قسمتی، بے چینی، بے سکونی، بربادی و تباہی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔

اصل میں کئی معاشروں میں شروع سے متعدد شوہروں کا رواج رہا ہے لیکن بتدریج گھٹتا گیا اور آج نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ خود اس بات کا بین ثبوت ہے کہ یہ روش اور طریق تہذیب و تمدن ہے ہی ماحول عمل۔ بھلا ہوا اسلام کا دنیا والے تو تجربات کر کے اس نتیجے پر پہنچے لیکن اسلام نے اول روزی سے اس کی نشاندہی کر دی۔ کیوں نہ انسانیت ممنون احسان ہوا اسلام کی؟

### مرد و عورت کے حقوق میں عدم مساوات

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا اسلام نے راجی و رعیت، آجر و مزدور، سرمایہ و محنت، یتیم و یتیم، معذور و محروم، مسافر و قیدی وغیرہ میں سے ہر ایک کے حقوق کی پاسداری کی ہے۔ ایسے میں یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ عورت اور مرد میں سے ہر ایک کے حقوق کا منصفانہ تعین نہ کرتا۔ ان کے مابین انصاف ہی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے تو اسلام کا یہ منفر د کردار ہے کہ اس نے مرد و عورت دونوں کو وراثت میں حصہ دار بنا دیا۔ اصل میں سطح میں لوگوں کو ان کے حقوق کے بارے میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی یا کی گئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مرد کی شخصیت کے

بہت سے پہلو ہیں اور عورت کی شخصیت کے بھی۔ جس طرح مرد کی ایک حیثیت انسان کی ہے اور دوسری باپ، شوہر، بیٹے وغیرہ کی اسی طرح عورت کی بھی ایک حیثیت انسان کی ہے اور دوسری ماں، بیوی اور بیٹی وغیرہ کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بطور انسان باپ اور بیٹے کے حقوق یکساں ہیں لیکن کوئی بالکل پاگل نہ ہو گیا ہو ورنہ سوچے گا بھی نہیں کہ بطور باپ کے حقوق بھی وہی ہوں جو بیٹے کے۔ گھریلو نظام میں ہی اگر آپ باپ اور بیٹے کے حقوق ایک جیسے کر دیں، گھریلو نظام ہو جائے گا۔ اسی طرح اس میں کوئی شک نہیں کہ بطور انسان میاں بیوی کی حیثیت میں رتی بھر فرق نہیں۔ ایسا نہیں کہ کوئی شوہر نکلی کرے تو اسے دوہرا جر ملے اور وہی نکلی بیوی کرے تو اسے اکہرا جر۔ البتہ گھریلو نظام میں جیسے باپ اور بیٹے کے حقوق یکساں نہیں ہو سکتے، میاں بیوی کے حقوق بھی یکساں نہیں ہو سکتے۔ جیسے کہ دختر یا کوئی اور ایسا ادارہ عمل کی دنیا میں چند دن نہیں چل سکتا جس کے یکساں اختیارات کے دو انچارج ہوں۔ بالکل اسی طرح ایسے گھر کو تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا جس میں شوہر اور بیوی یکساں حقوق کے دعوے دار ہوں۔ مغربی دنیا نے ایسا تجربہ کرنے کی کوشش کی لیکن نتائج جو اس تجربے سے برآمد ہوئے تو یہ کہ وہاں گھریلو وجود برائے نام ہو کر رہ گیا۔ یاد رہے گھر معاشرے کی بنیادی اکائی ہے۔ بالفاظ دیگر متعدد دگرمل کر معاشرے کو جنم دیتے ہیں اور متعدد معاشرے ملیں تو قوم بنتی ہے اور متعدد اقوام باہم ملیں تو انسانیت معرض وجود میں آتی ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ اگر گھریلو بنیادی اکائی کا ادارہ درہم برہم ہو جائے تو انجام کار پوری انسانیت کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ گھر کی بے سکونی بالآخر پوری انسانیت کو بے سکون کر دیتی ہے جیسے کہ آج پوری انسانیت بے سکون ہے۔ وقت کے اس موڑ پر مغربی دنیا کی بالادستی نے اس بے سکونی کے عمل کو یقینی ہی نہیں تیز کر دیا ہے۔

اسلام اسی لئے تو دس فطرت ہے کہ وہ ہر چیز کو اپنی فطری جگہ پر رکھتا ہے اسے یہ قطعاً گوارا نہیں کہ کوئی چیز اپنی فطرت سے تجاوز کرے۔ گھریلو نظام میں شوہر، بیوی، بیٹے اور بیٹیوں وغیرہ کا اپنا اپنا ایک مقام تو بطور انسان ہے۔ اس حیثیت میں اسلام مرد اور عورت ہر دو کو مساوی حقوق دیتا ہے۔ گھر میں اہل خانہ کی دوسری حیثیت بطور شوہر، بیوی، بیٹیوں اور بیٹوں کی ہے۔ ان حیثیتوں میں اسلام انہیں مختلف حقوق دیتا ہے ایک جیسے ہرگز نہیں۔ اصل میں ایسا کرنا گھر کے ادارے کی پیش رفت کے لئے از بس ضروری ہے۔ ثبوت اس

کا یہی ہے کہ اسلامی ممالک میں گھر کا دارہ آج بھی کامیابی سے رواں دواں ہے جب کہ کفریہ نظام کی تباہی نے مغربی دنیا کو کتوں اور بلیوں کی قوم بنا دیا ہے۔

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ غیر اسلامی معاشرے مرد و زن کے حقوق کے بارے میں ہمیشہ افراط و تفریط کا شکار رہے ہیں یعنی کچھ معاشرے تو ایسے ہیں کہ جنہوں نے مرد و عورت کو بطور انسان بھی مساوی حقوق نہیں دیئے اور کچھ دوسرے غیر اسلامی معاشرے اس حد تک آگے چلے گئے کہ جیسا اوپر ذکر ہوا انہوں نے مرد و زن کو بطور میاں بیوی بھی مساوی حقوق دیئے۔ جن معاشروں نے مرد و عورت کو کفریہ نظام میں مساوی حقوق دیئے ان کی کفریہ زندگی کیسے ایجن ہوئی، اس کا تو اوپر ذکر ہو چکا یعنی کفریہ نظام کا جنازہ ہی نکل گیا، گھر سے میاں بیوی، بچے ویسے ہی راہ فرار اختیار کر گئے۔ اپنے گھر حوالے کر گئے، کتوں اور بلیوں کے۔ کسی گھر میں چلے جائیں اس میں انسان تو کم ملیں گے ہاں حیوان بہت۔ ذیل میں ایک جھلک ان معاشروں کی بھی پیش کی جاتی ہے جنہوں نے مرد و عورت کو بطور انسان بھی مساوی قرار نہ دیا۔

دل خون کے آنسو روتا ہے یہ سپردِ قلم کرتے ہوئے کہ دنیا میں ایسے غیر اسلامی اور غیر فطری معاشرے رہے ہیں (بلکہ کسی نہ کسی شکل میں آج بھی موجود ہیں) کہ جن میں لڑکی کو پیدا ہوتے ہی بوجہ زندہ درگور کر دیا جاتا رہا ہے۔ ”سٹی“ کی رسم کہ جس میں زندہ بیوی کو مرنے والے خاوند کے ساتھ شعلوں کی نذر کر دیا جاتا ہے کم ہی سہی، لیکن کئی معاشروں میں آج تک موجود ہے۔ زیر آسمان عورت کو ہر معصیت وحشی گردانا گیا ہے۔ دنیا میں آج بھی جتنی طلاق شدہ عورتیں ہیں طلاق سے جدا ہونے والوں مردوں کی تعداد اس کا عشرِ عشر بھی نہیں۔ گم گشتہ معاشروں نے تعددِ ازواج کا انکار تو کیا لیکن طلاق کو نئی شادیاں کرنے کے لئے بطور ہتھیار استعمال کیا۔ امریکہ جیسا ملک تو اس سے بھی ایک قدم آگے چلا گیا۔ طلاق فی اور دی ہی اس لئے جاتی ہے کہ پھر شادی کی نوبت ہی نہ آئے کیونکہ تمام ضروریات جب بغیر شادی کے پوری ہو جاتی ہیں تو پھر شادی کی بندشیں گوارا کی جائیں تو کیوں؟ کئی ممالک میں تو عورت کو ایک ایسی نقد آور فصل کی شکل دے دی گئی ہے جس کی برآمد درآمد ہوتی ہے۔ ڈھونڈ کر اور تلاش کر کے ایسے مام رکھے جاتے ہیں جیسے کتوں اور بلیوں کے۔

"Marriage East & West" کا مصنف ایسے معاشروں کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ جن میں

عورت اور مرد کے کپڑے اکٹھے پانی میں نہیں ڈالے جاتے۔ ایک ہی بائنی میں لے جائے نہیں جاتے اور ایک ہی تار پر سکھائے نہیں جاتے۔ عورت کے کپڑوں والی تار کو مرد کے کپڑوں والی تار سے نیچے رکھا جاتا ہے۔ آت کی دنیا کے کئی مذاہب عورت کو گناہ کی دیوی تصور کرتے ہیں۔ ممنوع ہے کئی مذہبی رسومات شادی شدہ مرد اور عورتوں کو اس لئے کہ وہ تو عورت سے ملوث ہو کر پاک ہو گئے۔ ایسی رسومات کے لئے غیر شادی شدہ مردوں کو موزوں گردانا جاتا ہے۔ پنڈتوں اور راہبوں کی فوج ظفر موت جو کئی معاشروں میں گھر کر آئی ہے تو آخر اس کی کوئی وجہ تو ہے؟ کئی معاشروں میں بیوی کو خاندان کے ساتھ بیٹو کرکھانا کھانے کی اجازت نہیں۔ ظلم کی انتہا ہے کہ کئی معاشروں میں بیوہ عورت کو دوبارہ شادی کرنے کی اجازت نہیں۔ ایسے بھی معاشروں کی کمی نہیں جن میں عورت کے لئے پیٹ پالنے کے لئے کوئی آمد و مندانہ راستہ نہیں۔ راستہ کھلا ہے تو ایک اور وہ راستہ ہے عصمت فروشی کا۔ پھر ایک طرح کی ڈیوٹی کے لئے بھی اسے مرد سے آدھا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ اس بچاری کو بچوں میں سے ایک بچہ سمجھا جاتا ہے۔ کئی شوہر یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ میں بچوں کو چھوڑ کر آیا ہوں حالانکہ ان بچوں میں بیوی بھی شامل ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات تو بیوی ہی بیوی ہوتی ہے بچوں کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ امریکا میں چچی ایک کتاب بعنوان "The Underside of History" عورت کے مقام و حیثیت کو مرد کے مقابلے میں یوں بیان کرتی ہے:

Life	Death	Right	Left
Good	Bad	Male	Female
High	Low	Strong	Weak
Sacred	Profane	Day	Night

الغرض کس قدر بھیا تک حیثیت ہے جو مختلف ادوار میں مختلف معاشروں نے عورت کو دی لیکن شومنی قسمت ابھی شاید اس بچاری کے دن مزید گردش میں ہیں کہ رسی سہی کسر مغربی دنیا نے آت کے جدید دور میں پوری کر دی ہے۔ قدرت نے مرد و زن کی جسمانی ساخت اور جذباتی پرواخت کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کے مابین ایک موزوں و قدرتی تقسیم کار کر رکھی ہے۔ مرد کا دائرہ کار اگر گھر سے باہر ہے تو عورت کا گھر کے اندر۔

ایسی تقسیم کار کسی مخصوص اعزاز کی وجہ سے نہیں پیدا ہوتی صلاحیتوں کی وجہ سے ہے۔ مغرب والوں نے اس نظری تقسیم کار کو بالائے طاق رکھتے ہوئے عورت کو گھر کی سلطنت سے اٹھا کر بیرون خانہ مردوں کی طرح مشقت میں لگا دیا اور ستم بالائے ستم یہ کہ اسے ”مساوات“ کا نام دے دیا۔ عورت پتھری قیصری یا کھیت میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ بچے بھی جنے اور پالنے بھی لیکن مرد کی موت ہی موت، اپنے فرائض کا بوجھ بھی صدف مارک پر ڈال دیا۔ یہ کیسی مساوات ہے؟ مساوات کا نام ہی دینا تھا تو پھر چاہئے تو یہ تھا کہ مرد بھی اپنی ازلی تقسیم کار یعنی کمانے کے ساتھ ساتھ بچے جتنا بھی اور پالتا بھی۔ عورت کی تقسیم کار کو بدلاتو وہ پھر بھی کسی طور ہی سہی نباہ کر رہی ہے مرد کے فرائض کو بدل کر دیکھیں مذکی کھائے گا نام کام و ما مراد ہوگا۔

دنیا کی آدمی آبادی سے زیادہ پر مشتمل اور فرائض و فرائض کی شکار عورت کو اسلام قصر مذلت سے اٹھا کر بطور انسان مرد کے برابر لانا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے کہ:

”جو اب میں ان کے رب نے فرمایا! میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں، خواہ مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے سے ہو“ (ایک سطر پر ہو) (آل عمران: 195)۔

مرد ہو یا عورت ہر دو کو وراثت میں حصہ دار بنادیا۔ فرمایا:

”مردوں کے لئے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتے داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لئے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتے داروں نے چھوڑا ہو۔ چھوڑا ہو یا بہت حصہ (ہر دو کا) مقرر ہے“ (النساء: 7)۔

مرد و عورت کو مساوی قرار دیا تو اس حد تک جیسے کہ ایک گاڑی کے دو پیسے، لازم و ملزوم۔ فرمایا: وہ (عورتیں) تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے (البقرہ: 87)۔

یہ تو ہے مرد و عورت کی وہ حیثیت جو اسلام ان دونوں کو بطور انسان دیتا ہے لیکن گھر کے ادارے کو چلانے کے لئے چونکہ ضروری تھا کہ دونوں میں سے ایک کو گھر کا سربراہ و نگران بنادیا جاتا ہے اور متبادل راستے تھے ایک یہ کہ گھر کی سربراہی و نگرانی کا یہ منصب عورت کو دے دیا جاتا اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ یہ منصب مرد کو دیا جاتا۔ اسلام نے یہ منصب مرد کو تفویض فرمایا تو اس کی کئی وجوہات ہیں لیکن جو سب سے بڑی وجہ ہے وہ یہ ہے

کہ مرد جسمانی طور پر عورت سے قوی ہے۔ اگر جسمانی طور پر کمزور کو قوی کا نگران بنا دیا جائے تو آج بھی کوئی یہ تجربہ کر کے دیکھ لے، بیل کبھی منڈھے ہی نہ چڑھے۔ یہ منصب دیا تو بوجہ مرد کو دیا لیکن مرد کو یہ اعزاز مفت میں نہ دیا گیا بلکہ وہی فطرت نے شوہر و بیوی کے درمیان توازن اس طرح کیا کہ مرد کو عورت اور بچوں کے مان و نفقہ کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ صورت حال متوازن کی تو اس حد تک کہ شوہر اگر کسی وجہ سے عورت کو طلاق بھی دے دے تو مطلقہ بیوی کے جملہ اخراجات ایک وقت تک سابقہ شوہر کو برداشت کرنے ہوتے ہیں۔

پھر یہی نہیں بلکہ کھریلو نظام میں تو ماں کا درجہ باپ سے بڑھا ہوا قرار دیا۔ کھریلو نظام میں تین فریق ہوتے ہیں ماں باپ اور بچے۔ اس انتظامی یونٹ میں بغرض انتظامی امور مرد کو جیسے قوام یعنی نگران و مددگار ٹھہرایا گیا، اولاد کو بھی پابند کیا گیا کہ وہ والدین کا احترام بھی کریں اور خدمت بھی۔ خدمت کے لحاظ سے ماں کو باپ پر ترجیح دی گئی۔ چنانچہ سورہ لقمان میں اللہ تعالیٰ نے جہاں والدین کی شکرگزاری کا تاکید حکم دیا وہاں فوراً بعد یہ فرمایا ”اس کی ماں نے اس کو تکلیف پر تکلیف جمیل کر نو مینے تک اپنے حکم میں اٹھایا“ پھر دو سال تک اپنے خون سے اس کو پالا“ یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث میں یوں آیا:

”ایک آدمی نے نبی ﷺ سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ”تیری ماں“ اس نے کہا پھر کون؟ فرمایا ”تیری ماں“۔ اس نے کہا پھر کون؟ فرمایا ”تیری ماں“۔ اس نے کہا پھر کون؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ”پھر تیرا باپ“ پھر درجہ بدرجہ جو تیرے قریبی لوگ ہیں“ (بخاری مسلم)۔

ایک مسلمان کے لئے دنیا و آخرت میں جتن ایک ایسی نعمت ہے کہ جس کے حصول کو رب کائنات ”بڑی کامیابی“ قرار دیتا ہے۔ ایک طرف یہ بہت بڑی نعمت اور بہت بڑی کامیابی ہے اور دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ یہ ”جنت تمہاری ماؤں کے پاؤں تلے ہے“۔

یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے اس حیثیت و مقام کا جو اسلام عورت کو بطور انسان، بطور بیوی اور بطور ماں دیتا ہے۔ مرد و عورت کی ان مختلف حیثیتوں اور ذمہ داریوں کو الٹ کر دیکھیں، منفی نتائج فوراً سامنے آئیں گے۔ کئی نادان معاشرے ایسے تجربات کر بھی چکے۔ پچھتاوا ہی ان کا مقدر ٹھہرا تو پھر کیوں نہ انسانیت ممنون ہوا اسلام کی۔

## اسلامی سزاؤں کا سخت ہونا

جرائم پر دی جانے والی سزاؤں کو بھی اسلام کے مخالفین نے اکثر و بیشتر اپنے دلائل کا موضوع بنایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اسلامی سزائیں :-

☆ ایک تو بڑی ظالمانہ بلکہ وحشیانہ ہیں اور

☆ دوسرے یہ کہ یہ ساتویں صدی کے وحشی، بدوی اور غیر مہذب قبائل کے لئے وضع کی گئی تھیں لہذا آج کی مہذب دنیا میں ان کی کوئی جگہ نہیں۔

پیشتر اس کے کہ ہم ان سزاؤں کے محاسن و قبائح کی طرف آئیں یہ جان لینا از بس ضروری ہے کہ اسلامی سزائیں واقعی بہت کڑی ہیں۔ مثال کے طور پر زنا کی سزا یہ ہے کہ :

”زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو اگر تم اللہ تعالیٰ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ اور ان کو سزا دیجئے وقتِ اولِ ایمان کا ایک گروہ موجود ہے“ (النور: 2)۔

پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے کی سزا یہ ہے :

”اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں ان کو اسی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو اور وہ خود ہی فاسق ہیں سوائے ان لوگوں کے جو اس حرکت کے بعد تائب ہو جائیں اور اصلاح کر لیں۔ اللہ بخیر و رحیم ہے“ (النور: 5)۔

چور کی سزا یہ ہے :

”اور چور، خواہ عورت ہو یا مرد، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے عبرت تاکہ سزا۔ اللہ کی قدرت سب پر غالب ہے اور وہ دانا و بینا ہے“ (المائدہ: 38)۔

انسانی اعضاء ضائع کرنے کی سزا :

”توراۃ میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان دانت کے بدلے دانت اور تمام رتھوں کے لئے برابر کا بدلہ۔ پھر جو



قصاص کا بدلہ صحت کر دے تو وہ اس کے لئے کفارہ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے مازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ ظالم ہیں“ (المائدہ: 45)۔

قتل کی سزا یہ ہے:

”اور کسی مومن کے لئے روایتیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے مگر یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔ اور جو کوئی کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کے ذمہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا اور خون بہا ہے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے گا یہ کہ وہ معاف کر دیں۔ پس اگر مقتول تمہاری دشمن قوم کا فرد ہو لیکن وہ بذاتہ خود مسلمان ہو تو ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا ہے۔ اور اگر وہ کسی ایسی قوم کا فرد ہے جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے تو خون بہا بھی ہے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے اور ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا بھی۔ جس کو یہ استطاعت نہ ہو تو وہ لگاتار دو مہینے کے روزے رکھے۔ یہ اللہ کی طرف سے اس گناہ پر توبہ کرنے کا طریقہ ہے۔ اللہ علیم و حلیم ہے۔ اور جو کوئی کسی مسلمان کو عمدتاً قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس پر خدا کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لئے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے“ (النساء: 92-93)۔

اسلامی نظام حکومت کو درہم برہم کرنے کی سزا:

”جو لوگ اللہ اور رسول کے ساتھ لڑتے ہیں اور زمین میں اس لئے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کئے جائیں یا سوئی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں میں کائے جائیں یا وہ جاوطن کر دیئے جائیں۔ یہ ذلت و رسوائی تو ان کے لئے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لئے اس سے بڑی سزا ہے۔ مگر جو لوگ توبہ کر لیں قتل اس کے کہ تم ان پر کاہو پاؤ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے“ (المائدہ: 33-34)۔

روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ سزائیں جن کا اوپر ذکر ہوا سخت بھی ہیں اور شدید بھی لیکن سخت اور کڑی ہونے کے علاوہ ان کے درج ذیل تین اور اوصاف بھی ہیں جن کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو اسلامی سزائوں کی نوعیت کو سمجھا نہیں جاسکتا۔

1۔ یہ سزائیں آخری چارہ کار ہیں۔

- 2- یہ سزائیں جرائم کے راستے میں بھاری پتھر ہیں (Deterrent) ہیں۔  
 3- یہ سزائیں اصلاحی (Reformative) ہیں۔  
 ضرورت ہے کہ اسلامی سزائوں کے ان تین پہلوؤں کو ذرا تفصیل سے زیر بحث لایا جائے۔

### سزائیں بطور آخری چارہ کار

ایسا نہیں ہے کہ اسلام مستثنیٰ رہتا ہو کہ کوئی مجرم ہاتھ لگے تاکہ اسے سزا دی جائے۔ اس کے برعکس اسلام کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا اس کوشش میں کہ کوئی جرم کرنے ہی نہ پائے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ جس کھیت میں تم چاہتے ہو کہ کوئی چرنے والا مویشی منہ نہ مارے اسے اس کھیت کے نزدیک چرنے ہی نہ دوتا کہ اسے منہ مارنے کا موقع ہی نہ ملے۔ مثال کے طور پر فعل زنا کو روکنے کے لئے اسلام جو ان گنت رکاوٹیں اور مشکلات اس رجحان کے راستے میں حائل کرتا ہے کہ جو بالآخر اس فعل پر بیچ ہوتی ہیں ان پر ایک طائرانہ نظر دوڑائیں۔

☆ بدکاری کے راستے میں سب سے بڑی چٹان جو اسلام رکھتا ہے وہ آخرت میں جواب دہی کا تصور ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق جیسے کہ پہلے ذکر ہو چکا ہر فرد کا ہر فعل چھوٹا ہو یا بڑا ریکارڈ کیا جا رہا ہے۔ جب کوئی شخص فوت ہوتا ہے تو اس کا یہ ریکارڈ محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ قیامت کو ہر فرد کا ریکارڈ اس کے سامنے رکھا جائے گا اور اسے کہا جائے گا کہ آج تو اپنا محتسب خود ہی ہے۔ نتیجہ کے طور پر کسی بھی فرد کا کوئی بھی عمل اچھا ہو یا برا دنیا کی کسی عدالت کے نوٹس میں نہ آئے تو نہ آئے قیامت کے دن جزا و سزا کی چٹانی سے ضرور گزرے گا۔ جزا کی صورت میں صاحب عمل کو جہنم میں داخلہ ملے گا اور سزا کی صورت میں دوزخ میں۔

☆ خوف خدا اور آخرت کی اس ”بڑی روک“ کے علاوہ جو بطور پولیس چوکی ہر مسلمان کے دل میں ہر وقت جاگزیں رہتی ہے اسلام یہ وئی رکاوٹیں بھی کھڑی کرتا ہے۔ یہ رکاوٹیں مزید دھڑک کی ہیں۔ ایک پہلو تو مثبت رکاوٹوں کا ہے یعنی اسلام ہر فرد کو شادی کی ترغیب دیتا ہے اور مجرد رہنے کو پسند نہیں کرتا اور دوسری رکاوٹیں اپنے اندر منفی پہلو رکھتی ہیں یعنی وہ گناہ کے راستے کا پتھر بنتی ہیں۔ جہاں تک شادی کرنے کی ترغیبات کا تعلق ہے ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

- غیر شادی شدہ رہنا اسلامی تعلیمات کے مطابق احسن نہیں گردانا گیا۔ قرآن و سنت میں شادی کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک تو یہاں تک ہے کہ جو کوئی شادی کرتا ہے، آدھا دین مکمل کر لیتا ہے۔

- رہبانیت اور تہجد کی کوئی گنجائش نہیں۔

- بیوہ کو دوبارہ شادی کی کھلی اجازت دی گئی ہے۔

- اگر کوئی جوڑا ایک دوسرے سے ملاں ہو جائے تو طلاق کی اجازت دی گئی ہے۔ طلاق کا حق شوہر اور بیوی میں سے کوئی بھی استعمال کر سکتا ہے گواہ کا طریقہ کار ذرا مختلف ہے۔

- جلد شادی کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ان باپوں کو آخرت میں انعامات سے نوازا جائے گا جو اپنی بیٹیوں کی شادی بلوغت ہوتے ہی کر دیں۔

- جائز ازدواجی تعلقات کو عبادت گردانا گیا ہے۔

ہر فی رکاوٹوں کی دوسری قسم وہ ہے جس میں مردوں اور عورتوں کے عمومی اخلاق کی ممانعت کی گئی ہے۔ ایسی چند بندشیں درج ذیل ہیں

- بدکاری اور زنا کے لئے سخت ترین سزا مقرر کی گئی ہے۔

- عورت کے دائرہ کار کو زیادہ تر گھر کی چار دیواری کے اندر محدود کر دیا گیا ہے۔ کبھی کبھار اگر اسے گھر سے باہر جانے کی ضرورت ہو تو اسے شافقی کا دامن تھامنے کی تاکید کی گئی ہے۔ لازم قرار دیا ہے کہ وہ ہاتھ پاؤں اور منہ کے کچھ حصوں کے علاوہ پورے جسم کو ڈھیلی دھلی چادر سے ڈھانپ کر رکھے۔ کسی قسم کی زینت کی نمائش نہ کرے۔ زیورات پہنے تو ایسے کہ جن کی کوئی جھٹکارہ غیرہ نہ ہو۔ کسی سے بات کرے تو مضبوط طور پر نہ کہ لوجھار لہجے میں کرے۔

- محرم اور غیر محرم رشتوں کی باقاعدہ تقسیم و تخصیص کی گئی ہے۔ محرم رشتے وہ ہیں کہ جن کے ساتھ کسی عورت کی شادی ممنوع ہے جیسے باپ، بھائی، بیٹا وغیرہ۔ تمام وہ رشتے جن کے ساتھ شادی کی اجازت دی گئی ہے محرم کی فہرست میں آتے ہیں۔

- ایسی محفلوں، مجلسوں اور نشستوں میں مسلمان مرد و عورت کی شمولیت ممنوع جو ماحرموں پر یا ماحرموں اور محرموں دونوں پر مشتمل ہوں۔

- کوئی غیر محرم مرد اور غیر محرم عورت تنہائی میں نشست نہیں کر سکتے۔

- ہدایات دی گئی ہیں کہ عورتیں اور مرد جب آمنے سامنے گزریں تو نظریں نیچی رکھیں۔ ثبوت بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنا گناہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمانا تو یہاں تک ہے کہ غیر محرم مردوں اور عورتوں کا ایک دوسرے کو دیکھنا آنکھوں کا زنا ہے (پہلی سرسری نظر پر جائے تو البتہ معاف ہے)۔ غیر شائستہ گفتگو زبان کا زنا ہے۔ بے ہودہ اور شہوت بھری سامت کانوں کا زنا ہے۔ غیر محرم کو چھونا اور اس کی طرف عیا شائستہ پیش رفت ہاتھوں اور پاؤں کا زنا ہے۔

- اسلام کمریلو خلوت اور رازداری (Privacy) پر بہت زور دیتا ہے۔ بغیر اجازت کسی دوسرے کے کمر داخل ہونے کی اور کمر کے اندر جھانکنے کی قطعاً ممانعت ہے۔ کسی دوسرے کے کمر میں داخلے کے لئے تین دفعہ اجازت مانگنے کے باوجود اگر جواب نہ ملے اور اگر ملے تو معذرت کا تو پھر واپس جانا ہوتا ہے۔ اجازت لیتے وقت کسی کے دروازے کے سامنے کھڑے ہونے کی ممانعت ہے۔ اپنے ہی کمر کے مبالغوں کو منع کیا گیا ہے کہ وہ تین اوقات یعنی صبح کی نماز سے پہلے، گرمیوں میں دوپہر کے وقت جب نیا دھڑکپڑے اتارے ہوتے ہیں اور عشاء کی نماز کے بعد مبالغوں کے کمروں میں نہ جائیں۔ دوسروں کے خطوط ان کی اجازت کے بغیر پڑھنا ممنوع ہے۔ صرف دوسروں کے ہی نہیں بغیر اجازت کے ماں اور بہن کے کمر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔

- اسلام جب ماحرموں کو چھوٹے مجلسوں اور روئے و گفتگو کرنے کی ممانعت کرتا ہے تو ظاہر ہے چھوٹے تعلیم، چھوٹے کاروبار، چھوٹے اور مشترکہ رہائش وغیرہ کا قطعاً کوئی سوال نہیں۔

- ان تمام بندشوں کے علاوہ اسلام لازم قرار دیتا ہے کہ مسلم معاشروں کا عمومی اور مجموعی ماحول خدا ترسی، بھائی چارے اور خیر خواہی کا مظہر ہو۔ جنسی افواہوں، فحش گانوں، لہجہ تصویروں، مبالغہ وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہتھتیں داغنا تو اس قدر گناہ گردا گیا کہ تقریباً تقریباً جیسے بدکاری وزنا۔ اندازہ لگائیں اس ماحول کا کہ

جس میں بعض حالتوں میں آنکھوں دیکھے زنا کاروں کا بھی اس وقت تک انکشاف نہیں کیا جائے گا جب تک کہ چار گواہ نہ ہوں۔

رکاوٹوں، مزاحمتوں اور بندشوں کا یہ بھرپور بندوبست صرف ایک جرم یعنی زنا کو روکنے کے لئے کیا گیا۔ دوسرے بڑے بڑے جرائم کی راہ میں بھی اسی طرح کی بندشوں کا ایک لمبا چوڑا سلسلہ قرآن و سنت نے حائل کر رکھا ہے۔ ظاہر ہے ان بھرپور رکاوٹوں اور پھاؤ کی ترغیبوں کے علی الرغم اگر پھر بھی کوئی جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ تو ایسا گلاہڑا پھل ہے کہ جس کا درخت پر رہتا سدرست پھلوں کے ساتھ انتہائی ظلم و زیادتی ہے۔ ضروری ہے کہ ایسے گلے سڑے پھل کو صرف درخت سے علیحدہ ہی نہ کیا جائے بلکہ اسے اس طور مر وڑا، کچلا اور زیر زمین دفن کر دیا جائے کہ اس کی ہوا تک سدرست پھلوں کو نہ گلے۔ اسی طرح ایک ایسا فرد جو ان تمام رکاوٹوں اور ترغیبات کے باوجود گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، ظاہر تو چلتا پھرتا انسان ہوتا ہے حقیقتاً ایک ایسی لاش ہوتا ہے جس کی انسانیت طبعی موت سے بہت پہلے مر چکی ہوتی ہے۔ ایسی لاش کو زندہ انسانوں کے درمیان رہنے دینا معاشرے اور انسانیت پر ظلم ہے۔ وہی فطرت ایسے ظلم کی کیسے اجازت دیتا؟

### اسلامی سزاؤں کا مزاحمتی پہلو

اس میں کسی کو کوئی کلام نہ ہو گا کہ انٹیم بم ایک انتہائی بھیا تک، مہلک اور تباہ کن ہتھیار ہے لیکن اس میں کیا شک ہے کہ اس دنیا میں اس کا موجود ہونا عالمی جنگ کے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ (Deterrent) ہے۔ اسی طرح اسلامی سزاؤں کا بظاہر سخت اور کڑا ہونا تو ایک مسلمہ امر ہے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان کا یہی بظاہر سخت اور بھیا تک ہونا جرائم کے راستے کا بھاری پتھر ہوتا ہے۔ جرم کرنے والے کو سوبار سوچنا پڑتا ہے کہ کیا وہ ان سزاؤں کا تحمل ہو سکتا ہے؟ ان سزاؤں کے کڑا ہونے کی افادیت تو اب تجربے سے بھی عیاں ہے۔ ایسے ممالک میں خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں، جہاں اسلامی سزائیں نافذ نہیں جرائم کا تناسب سعودی عرب سے کئی گنا زیادہ ہے کیونکہ سعودی عرب میں اسلامی سزائیں عملاً نافذ ہیں۔ کسی بھی نظام کی خوبی تو یہی ہو سکتی ہے کہ جرائم کی وجہ سے وہاں انسانی جانوں کا ضیاع کم سے کم ہو۔ سعودی عرب میں ان جانوں کا ضیاع جو جرائم کی وجہ سے ہوتی ہیں یا جرائم کی سزا کے طور پر وارد کی جاتی ہیں کی تعداد

امریکہ میں انہی مدات میں ضائع ہونے والی جانوں کا عشر عشر بھی نہیں۔ بتائیے ظالمانہ و وحشیانہ سزاؤں کا نظام امریکہ میں ہوا یا سعودی عرب میں؟ کس قدر ضرورت ہے انسانیت کو اسلام اور اسلامی سزاؤں کے نفاذ کی؟

### اسلامی سزاؤں کا اصلاحی اور تطہیری پہلو

گلے سڑے انسان کو ٹھکانے تو لگایا ہی ہوتا ہے لیکن اسلام کی یہ عظمت و اعزاز دیکھئے کہ وہ اس ضائع کی جانے والی انسانی جان سے بھی فائدہ اٹھانا لازمی سمجھتا ہے۔ اسلام اس مقصد کو کئی پہلوؤں سے حاصل کرتا ہے جن میں سے کم از کم تین کا ذکر ہم ذیل میں کرتے ہیں:

1۔ اسلام ایسا نہیں کرتا کہ مجرم کو رات کے اندھیرے اور کسی کال کوٹھڑی میں سزا دے دے۔ بلکہ اکثر و بیشتر وہ لازم قرار دیتا ہے کہ مجرم کو کھلے عام سزا دی جائے اور سزا دیتے وقت عوام کا ایک جم غیر موجود ہونا کہ دنیا کے انسان پر چشم سر دیکھ لیں کہ جرم کرنا کتنا مہنگا پڑتا ہے۔ اسلام کا یہ کہنا کہ سزا دیتے وقت سزا دینے والوں کے دل میں مجرم کے لئے کوئی نرم گوشہ پیدا نہیں ہونا چاہئے اسی لئے کہ کہ درس عبرت حاصل ہو تو مکمل اور حتمی۔ ہاتھ پاؤں کا کاٹنا بھی اسی لئے ہے کہ ہاتھ پاؤں کتنا جلدھرے بھی گزرے تو ساتھ ساتھ یا شتہا بھی لئے پھرے کہ چوری کرنے کا انجام کیا ہوتا ہے؟

2۔ ہاتھ کٹوائے جانے والے شخص کے لئے ہاتھ کے کٹنے سے لازم نہیں آتا کہ اس کے نفس کی اصلاح بھی ہو گئی ہو۔ لہذا اسلام کی رو سے ہاتھ پاؤں کا غارہ دے دینے والوں سے بھی آخرت میں جرم کے بارے میں مزید باز پرس ہوگی۔ ایسی باز پرس سے چھٹکارا ممکن ہے بشرطیکہ مجرم اس دنیا کی سزا پانے کے ساتھ ساتھ توبہ بھی کرے اور سچی توبہ کی ایک علامت یہ ہے کہ اس کی اس قدر اصلاح ہو چکی ہو کہ باقی عمر میں پھر کبھی اس سے وہ جرم صادر نہ ہو۔ یہی مطلب ہے یہ کہنے کا کہ ”مجرموں کی شہادت قبول نہ کرو سوائے ان لوگوں کے کہ جو (مجرمانہ) حرکت کے بعد تائب ہو جائیں اور اپنی اصلاح کر لیں۔“

3۔ اسلام مجرموں کو مایوس نہیں کرتا کہ وہ اپنے اندر یہ احساس لیئے ہوئے رہیں کہ اب وہ سوسائٹی میں ہمیشہ کے لئے عضو فاسد ہیں۔ وہ سزا پانے والوں اور تائب ہو جانے والوں کو معافی کی بشارت

دیتا ہے۔ یہ ایسی ہی بنا رت کے حصول کا مظہر تھا کہ زیر آسمان کئی مجرم جو انسانی نگاہ سے بچ گئے ہزار پانے کے لئے خود حاضر ہوتے رہے۔ بہت سی آیات جن میں اسلامی قوانین کی مزایا بیان ہوئی ہیں وہی وجہ سے ایسے الفاظ سے ختم کی گئی ہیں جیسے ”اللہ غفور ورحیم ہے“ ”اللہ دانا و عیا ہے“ وغیرہ۔ ایک جگہ پر تو ایسے الفاظ آئے کہ ”جو لوگ توبہ کر لیں قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔“

مذکور بالا بدایات سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اسلام مجرموں کو محض ہزا دینے کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ اسے ہزا دینے سے بھی زیادہ معاشرے سے مجرمانہ ذہنیت ختم کرنے کی فکر دامن گیر ہے۔ بالفاظ دیگر اسلامی ہزادوں کا اصل ہدف معاشرے کی اصلاح و تہذیب ہے۔ کیا انسانیت کو اصلاح و تہذیب کی ضرورت نہیں؟

### اسلامی جہاد (مسلم جدوجہد) کیوں؟

جیسا کہ ذکر ہو چکا اسلام ہے ہی ایسے احکام اور امور و نواہی پر مشتمل کہ جو انسانیت کی فلاح و بہبود کے ضامن ہیں۔ اس بارے میں اگر کسی کے ذہن میں کوئی الجھن ہو تو وہ اس وجہ سے نہیں کہ اسلام میں کوئی نقص ہے بلکہ اس لئے ہی ہوئی کہ وہ خود بخود لے پن اور نادانی میں اسلام کی حقانیت کو سمجھنے میں قاصر رہا ہے ورنہ یہ مسلم امر ہے کہ اسلام ایک ایسا ضابطہ حیات ہے کہ جو پوری انسانیت کے لئے بھلائی اور خیر خواہی کا ضامن ہے۔ اسلام کا ایسے ہونا اس لئے لازمی امر ہے کہ یہ دین انسانوں کا بنایا ہوا ہے نہیں بلکہ انسانوں کے خالق کا بنایا ہوا ہے۔ بندے اگر یہ ضابطہ حیات بناتے تو وہ ضرور طبقاتی، گروہی، نسلی اور علاقائی مصلحتوں کو مد نظر رکھ کر بناتے جیسا کہ پوری انسانی تاریخ میں بنائے جاتے رہے ہیں اور آج بھی بنائے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے جو ضابطہ حیات علاقائی یا طبقاتی ہو گا انسانیت کے لئے کس طرح قابل عمل ہو سکتا ہے؟ اسلامی ضابطہ حیات کا اعزاز یہ ہے کہ وہ اس خالق و مالک و حاکم کا بنایا ہوا ہے جو رب کائنات ہے، جو غیر جانبدار ہے، جو کسی جرمن کا رب ہے تو کسی مصری کا رب بھی، جو کالے کا رب ہے تو گورے کا رب بھی، جو مرد کا رب ہے تو عورت کا رب بھی، جو اس وقت بھی موجود تھا جبکہ پہلے انسان نے اس دنیا میں قدم رکھا، آج بھی موجود ہے اور ہمیشہ ہمیش کے لئے موجود رہے گا۔ یہی نہیں بلکہ ایک فیکٹری والے کو جیسے حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی فیکٹری کے پروڈکٹ کو

استعمال میں لانے کی ہدایات دے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کو ہی یہ حق حاصل ہے کہ وہ انسان کے لئے ضابطہ حیات وضع کرے اس لئے کہ انسان فطرت کی فیکٹری کا ہی تو پروڈکٹ ہے۔

ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلام پوری انسانیت کے لئے ضابطہ حیات ہے تو اسے اس انسان کا بھی ضابطہ حیات ہونا چاہئے جو اس دنیا میں پہلے پہل وارد ہوا تھا۔ ان انسانوں کے لئے بھی جو آج اس دھرتی پر موجود ہیں اور ان انسانوں کا بھی جو قیامت اس دنیا میں پیدا ہوتے رہیں گے۔ کیا ہی مطابقت ہے کہ وہ تعالیٰ کی دنیا میں ایسا ہی ہے اس دنیا میں پیدا ہونے والا پہلا شخص حضرت آدم خود بنی تھا۔ بذریعہ وحی اس کا براہ راست رابطہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تھا۔ پھر جتنے انبیاء و رسل اس دنیا میں وقتاً فوقتاً آتے رہے وہ ایک ہی سرچشمے سے منسلک تھے، ایک ہی ضابطہ حیات یعنی اسلام کے طہر دار تھے اور بالآخر انہیں ایک ہی ہستی یعنی اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہ ہونا ہے۔ مختلف ادوار میں کچھ امتیں اپنی نسبت اور شخص کو جا کر کرنے کے لئے اس ”ایک ضابطہ حیات“ کو یہودیت، عیسائیت وغیرہ کے سے نام دیتی رہیں ورنہ ازل سے اب تک اس ضابطہ حیات کا نام اسلام ہی ہے اور جو اس ضابطہ حیات کو اختیار کرے اسے ہمیشہ مسلمان یعنی اللہ تعالیٰ کے مطیع فرمان کا نام دیا گیا ہے۔ قرآن میں آیا:

”اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ اس دین سے بہت کر جو مختلف طریقے تھے ان لوگوں نے اختیار کئے جنہیں کتاب دی گئی تھی ان کے اس طریقہ عمل کی وجہ اس کے سوا کچھ تھی کہ انہوں نے علم آجانے کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لئے ایسا کیا اور جو کوئی اللہ کے احکام و ہدایات سے انکار کر دے اللہ کو اس سے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی“ (آل عمران: 19)۔

پھر چونکہ یہ تمام انبیاء ایک ہی ہستی کے نمائندے اور ایک ہی سرچشمے کے ترجمان تھے لہذا فرمایا گیا کہ وہ ایک ہی برادری کے لوگ تھے ان میں اور ان کتابوں میں جو وہ لائے کوئی فرق نہ کیا جائے بلکہ ان تمام پر ایمان لانا اسی طرح ضروری ہے جیسے کہ اس نبی پر جو وقت کا نبی ہو، قرآن میں آیا:

”مسلمانو! کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف مازل ہوئی ہے اور جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولاد یعقوبؑ کی طرف مازل ہوئی تھی اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے تمام



پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مسلم ہیں“ (البقرہ: 136)۔

ہم مسلم کے متعلق یوں بھی فرمایا:

”اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام ”مسلم“ رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی“ (الحج: 78)

جب اسلام پوری انسانیت کا ازل سے ابد تک دین ہے تو ایک اور سوال کا ذہن میں آنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ پھر اس کی تعلیمات و ہدایات وقت کے کسی بھی موڑ پر ان تمام انسانوں تک پہنچنی چاہئیں جو کہ اس وقت موجود ہوں تاکہ وہ ان تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر اپنی اس دنیا کی فلاح اور آخرت میں نجات کا بندوبست کر سکیں۔ واقعات کی دنیا میں ایسا ہی ہے اور پوری انسانی تاریخ میں یہ جو انبیاء و رسل آتے رہے تو اسی وجہ سے کہ وہ اللہ کے دین کو اس دھرتی کے کینوں تک پہنچاتے رہے۔ پھر چونکہ یہ پہنچانے کا کام اتنا اہم تھا کہ لوگوں کی نجات کا دار و مدار اسی پر تھا کہ وہ ان تعلیمات پر عمل کریں لہذا اس پہنچانے یا رسالت کے کام کو انبیاء و رسل کو بطور چیلنج دیا گیا۔ یہ رسالت کا کام آج تک بلکہ تا قیامت جاری رہے گا کیونکہ ہر موجودہ اور آنے والے انسان کی یہی طرح ضرورت ہے جیسے کہ اس انسان کی تھی کہ جو اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ البتہ اس پہنچانے کے کام میں اس قدر فرق ضرور پڑ گیا کہ سلسلہ نبوت ختم کر کے یہ کام اللہ تعالیٰ نے آخری امت یعنی امت مسلمہ کے سپرد کر دیا۔ باغیظ دیگر امت مسلمہ اب نہ صرف یہ کہ قرآن و سنت کی تعلیمات کی حامل و محافظ ہے بلکہ یہ رسالت کا کام کرنے کی ذمہ دار بھی ہے۔ اصل میں وہ آسمانی ہدایات جو پہلے جزوی طور پر آتی تھیں قرآن کی شکل میں حتمی اور مکمل کر دی گئیں لہذا ایسا ہونے کا لازمی نتیجہ تھا کہ انبیاء و رسل کی بعثت کا سلسلہ بھی ختم کر دیا جاتا۔

اب مسلمانوں کو یہ پہنچانے کا کام اس لئے کرنا ہے کہ یہ ان کا فرض منصبی ہے اور ظاہر ہے کہ ان کی نجات بھی ممکن ہے کہ وہ اس اہم ترین فرض کو بطریقہ احسن ادا کریں۔ دوسروں تک ان تعلیمات کا پہنچانا اس لئے ضروری ہے کہ ان کی نجات کا دار و مدار انہی تعلیمات پر عمل کرنے سے ہے۔ ایک سچے کی بات یہ کہ پہنچانے کا کام بھی ہو سکتا ہے کہ اسلام اور اسلام والے دنیا میں بطور غالب قوت موجود ہوں۔ بصورت دیگر ان

پہنچانے والوں سے بڑھ کر اگر کوئی اور طاقت موجود ہوگی تو وہ یہ کام کرنے ہی نہ دے گی۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ فرض کریں ایک طرف کسی آدمی کے پاس کنواں اور کنوئیں سے پانی نکالنے کا پورا انتظام ہے اور دوسری طرف کچھ فاصلے پر بہت سے پیا سے ہیں۔ کنوئیں والا چاہتا بھی ہے کہ وہ جلد از جلد پیا سوں تک پانی پہنچائے لیکن راستے میں کسی طاقت ور زمیندار کی زمین پڑتی ہے اور وہ فتنہ کھڑا کر دیتا ہے کہ اس کی زمین سے گزر کر کوئی دوسری طرف پانی نہیں لے جاسکتا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی ہولناک صورت حال کا کیا حل ہو؟ ہر سنیہ الطبع انسان فوراً یہی فیصلہ دے گا کہ انسانی جانوں کو بچانے کی خاطر مزاحم ہونے والا بہت دھرم زمیندار سے کم از کم اس طاقت کو چھین لیا جائے کہ جو انسانوں کے لئے وبال جان بن گئی۔ ہو یہی صورت اسلامی جہاد کی ہے۔ اسلامی جہاد دنیا کے مادی فائدے حاصل کرنے کے لئے قطعاً نہیں۔ اگر کوئی مادی فائدہ بٹورنے کے لئے کرے تو خود قیامت کو پکڑا جائے گا۔ اسلامی جہاد صرف اس لئے ہے کہ گمراہ انسانوں سے وہ طاقت چھین لی جائے کہ جو دوسرے انسانوں کو گمراہ کرنے کا باعث ہو اور ماحول کو اس قدر سازگار بنا دیا جائے کہ اسلامی تعلیمات پہنچانے کے راستے میں کوئی فتنہ کھڑا نہ کر دے۔ مسلح جدوجہد کا راستہ اختیار ہی اس وقت کیا جاتا ہے جب مزاحم قوتیں دعوت و تبلیغ کے ذریعے رسالت کے کام کو ناممکن بنا دیں۔ کسی انسان پر سب سے بڑا ظلم یہی ہے کہ آسمانی ہدایت کو اس تک پہنچنے نہ دیا جائے۔ دس نظرات ایسے ظلم کو کیسے برداشت کرنا؟

چونکہ اسلامی جہاد نہ مادی فائدہ بٹورنے کے لئے ہے اور نہ ہی کسی کو مجبوراً مسلمان کرنے کے لئے (۱) اگر اہل الدین لہذا اس کے ساتھ فی سبیل اللہ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اسلامی جہاد کی اسی فی سبیل اللہ شرط کا اعزاز ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں اس جہاد کے ذریعہ اتنی جانیں کھنکھیں ہوئی جتنی کہ مثال کے طور پر دو میں سے ایک عالمی جنگ میں۔ یاد رہے غزوہ رسول اللہ ﷺ میں کل 7323 مخالفین قتل کر دیے گئے۔ اسی دوران محض 387 مسلمان شہید ہوئے۔ اس کے برعکس صرف جنگ عظیم اول کے مقتولین کی تعداد 7469700 مجروحین کی 19432000 اور قیدیوں کی 6526500 تھی۔ جنگ عظیم دوم میں ان اعداد و شمار سے بھی کئی گنا زیادہ تعداد متاثرین کی تھی۔ کن الفاظ میں اس حقیقت کو بیان کیا جائے کہ اسلامی جنگ انسانیت کی خاطر جدوجہد ہے تو غیر اسلامی جنگ محض فساد ہے۔ ایک جنگ انسانیت کی فلاح و بہبود کی ضامن

ہے تو دوسری انسانیت کی ویرانی و مبراہادی کا ذریعہ۔ ایسے میں کیا رتی بھر بھی کوئی شک ہے کہ ”اسلام پر یلغار اصل میں انسانیت پر ظلم ہے۔“ کاش اس دنیا کے مکین اپنا برا بھلا پہچانیں۔

جیسا کہ ثابت ہو چکا اگر تعددِ ازاواج، مرد و عورت کے حقوق میں عدم مساوات، اسلامی سزاؤں کا سخت ہونا اور جہاد فی سبیل اللہ جیسے متنازع موضوعات انسانیت کی بھلائی و خیر خواہی کے لئے ہیں تو پورے اسلام کی برکات و فیوض کا اندازہ لگائیں۔ یہ محض تصوراتی معاملہ ہی نہیں تاریخِ شاہد ہے کہ اس گیارہ سو سالہ دور میں جب اسلام اس دنیا میں بطور غالب قوت موجود رہا صرف انسانوں ہی نے کچھ کاسائس نہ لیا، پرندوں اور چمندوں کا مقدر جاگ اٹھا۔ کسی کی کیا مجال کہ اس دور میں کسی دوسرے پر بھی زیادتی کرتا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ سکرانوں نے اپنے آپ کو خاندانوں کی سطح پر رکھا اور آخرت کی باز پرس کا خوف انہیں اس قدر مشکوک رکھتا کہ وہ خود تو بھوکے نٹھے رہے لیکن یہ گوارا نہ کیا کہ ”فرات کے کنارے کوئی بکری کا بچہ تک بھوکا رہے۔“

آج انسانیت اسلام کی برکات سے محروم ہے تو اس وجہ سے کہ وہ امت جس نے اسلام کو دوسروں تک پہنچایا تھا خود اہلیت کا شکار ہو کر دنیا میں مغلوب و مجبور ہو گئی۔ جس امت نے اس دنیا کو سنوار کر رکھنا تھا خود تباہی و مبراہادی کا شکار ہو گئی۔ محروم میں شر اور فساد نے ڈیرے آجائے تو اس کی کوئی تو وجہ ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کو انسانیت کی ضرورت ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ انسانیت کو اسلام کی بہت ضرورت ہے۔

## نظام ہائے خلافت

## خلافت کا نظام حکومت

آغازی میں دو اصولی باتیں نوٹ کرنے کی ہیں۔ پہلا اصول تو یہ کہ ”خاص بہ ترکیب میں قوم رسول باثقی“۔ جس طرح نظام خلافت خود دنیا کے دوسرے مروجہ نظام بائے زندگی سے سرتا پ مختلف ہے اسی طرح خلافت کا ہر دائرہ کار خواہ وہ کمرانی کا ہو سماجی معاملات کا ہو یا اقتصادی امور وغیرہ کا سیکولر طرز زندگی کے ایسے نظاموں سے مختلف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب دوسرے نظام بائے زندگی بندوں کے وضع کردہ ہیں نظام خلافت تعلیمات وحی پر مبنی ہے انسانوں کی مداخلت کا کوئی سوال نہیں۔ دوسری اصولی بات بلکہ اصل الاصول یہ ہے کہ کسی انسان کو حق نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے خواہ وہ انسان نبی ہی کیوں نہ ہو۔ کمرانی صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے بندوں کا کام محض بندگی ہے قرآن کریم میں آیا:

”کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کی بجائے میرے بندے بن جاؤ۔“ (آل عمران: 79)

لاریب ایک انسان کا دوسرے انسانوں پر حکم و اختیار خواہ وہ کسی روپ میں ہو استبداد ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا میں انسان ساختہ جتنے نظام بائے زندگی چلے خواہ وہ شخصی تھیا جمہوری یا آخر بری طرح فعل ہوئے اس لئے کہ طاقتور ہمیشہ کمزور کے حقوق غصب کرتا رہا ہے۔ اور قوت عدل و انصاف کو مسلسل پامال کرتی رہی ہے۔ استثناء اس میں اگر ہے تو ان ادوار کی کہ جب وحی کا دور دورہ رہا ہے۔ بقول شاعر:

ہر عہد میں ہوتی رہی طاقت کی پرستش  
ہر دور یزیدوں کا طرف دار رہا ہے

## خلافت کا طرز حکومت

پہلے ایک غلطی کا ازالہ ضروری ہے۔ عام کہا جاتا ہے کہ اسلام کا طرز حکومت خلافت ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ یہ کہا جائے کہ خلافت کا طرز حکومت خلافت ہے۔ اس لئے کہ اسلام اور خلافت ہم مرتبہ و ہم وزن الفاظ ہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف اتنا کہ اسلام جو مکمل اور حتمی صورت میں قرآن و سنت میں موجود ہے اگر

قرآن و سنت کے صفحات تک محدود رہے تو محض ایک نظریہ اور فلسفہ ہے۔ ہاں جب یہ حتمی نظریہ کسی خطہ زمین میں بطور ضابطہ حیات عملاً نافذ ہو جائے تو یہی خلافت ہے۔ بالفاظ دیگر اسلام کی طرح خلافت محض طرز حکومت کا نام نہیں پورے نظام زندگی کا نام ہے۔

موضوع سخن کی طرف آئیں تو صورت حال کچھ اس طرح کہ خلافت کا طرز حکومت تین ستونوں پر استوار ہے۔ یہ تین ستون ہیں توحید رسالت اور اولی الامر۔ آئیے ہر ایک کے مقام و مرتبہ پر روشنی ڈالیں۔

توحید: ہم نے اوپر ذکر کیا کہ کسی انسان کو حق نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کو مزاوار ہے۔ ایک عام ذہن اس جملے کے مضمرات کو تسلیم نہیں کرتا اس لئے کہ واقعات کی دنیا میں کچھ انسان ہی ہیں جو دوسرے انسانوں پر حکومت کرتے ہیں، اللہ کو تو کسی نے دیکھا تک نہیں۔ غیر مسلم معاشروں کا توبہ و آدم ہی نرالا وہاں پر توبہ و نفل کچھ انسان دوسرے انسانوں پر مسلط ہوتے ہیں خواہ ذریت کی بنا پر سازش کے ذریعہ طاقت کے بل بوتے پر یا بذریعہ انتخابات اسلام میں بھی حکومت چلانے والے اولی الامر انسان ہی ہوتے ہیں۔ تھوڑا سا گہرائی میں جا کر دیکھیں توبہ و دو اور دو چار کی طرح واضح کہ اصل میں حکمران وہ ہوتا ہے کہ جس کا قانون چلے۔ دوسرے نظام بائے حکومت بمثل کمیونزم، سوشلزم، مغربی جمہوریت وغیرہ میں جہاں انسان ساختہ قانون چلتا ہے اسلام میں نہیں۔ اسلام میں اطاعت تو اللہ کے علاوہ رسول ﷺ اور اولی الامر کی بھی ہوتی ہے۔ قانون صرف اللہ تعالیٰ کا چلتا ہے۔ چنانچہ اطاعت کے بارے میں آیا:

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں پھر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ و رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی صحیح طریق کار اور انجام کے اعتبار سے بہتر ہے۔“ (نساء: 59)

البتہ حکمرانی و قانون سازی کے متعلق فرمایا:

”فیصلہ کا سارا اختیار اللہ تعالیٰ کو ہے وہی امر حق بیان کرتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے“

(انعام: 57)۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیوں ضروری ہے کہ قانون سازی و نگرانی (فیصلے) کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہو جب کہ انسان اپنی ضروریات کو سمجھتے بھی ہیں اور پھر یہ ضروریات وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی بھی رہتی ہیں؟ لہذا ضروری ٹھہرا کہ کھوت لگایا جائے کہ قانون سازی کا حق صرف اللہ تعالیٰ ہی کو سزاوار ہے تو کیوں؟ غور کریں تو قانون ساز ہستی کے لئے چند اوصاف کا حامل ہونا از بس ضروری ہے۔ تمام ایسے اوصاف کے بیان کرنے کا موقع تو نہیں، چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔

پہلا وصف جو قانون ساز میں ہونا لازمی ہے وہ یہ کہ اس کا علم مکمل، بھرپور اور ادنیٰ نقص کے بغیر ہو۔ اسے پتہ ہو کہ اس کائنات کا حدود اور بعد کیا ہے؟ یہ کائنات کیسے وجود میں آئی اور اس کا انجام کیا ہے؟ سورج روزانہ مشرق سے ہی کیوں نکلتا ہے مغرب سے کیوں نہیں؟ کسی دن یہ کیوں نہیں سنا جاتا کہ آج سورج تاخیر سے نکلے گا اس لئے کہ ”زیر مرمت“ ہے؟ لیل و نہار بحر و بر، شجر و حجر وغیرہ کی غایت کیا ہے؟ قانون ساز کو زیر زمین معدنیات اور خلائی خزانوں کا مطالعہ ہونا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ آج تو ”خاندانی منصوبہ بندی“ کا قانون وضع کرے اور کل کو اتنے وسائل برآمد ہو جائیں کہ جو کئی گنا آبادی کے تحمل ہو سکتے ہوں۔ پھر قانون ساز کو انسان کہ جس کے لئے قانون سازی کرنی ہے کی طبیعت و سرشت سے اس قدر بھرپور آگاہی ہو کہ کسی دل کے کسی کونے میں پیدا ہونے والا احساس قانون ساز سے اوجھل نہ ہو۔ الغرض قانون ساز کو تجربات کر کے یہ پتہ نہ کرنا ہو کہ کونسا قانون انسان کے لئے غایت کریگا۔ اس کا علم اس سے بھی زیادہ انسان پر محیط ہو جس طرح کہ ایک فیکٹری میں تیار ہونے والے پروڈکٹ پر فیکٹری کے مالک کا علم محیط ہوتا ہے۔ کسی اور سے اوجھل رہے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن قانون ساز اس جرم سے بھی سو فیصد آگاہ ہو کہ جو رات کی تاریکی میں کیا جائے۔ اسے اس قدر تفصیلاً علم ہو کہ وہ جانتا ہو کہ جرم قصداً کیا گیا یا سہواً کس کس کے اکسانے پر جرم ہوا اور ہر اکسانے والے کا جرم میں کس قدر حصہ ہے؟

ایک دوسری بڑی خوبی جو قانون ساز میں ہونی چاہئے وہ اس کا غیر جانبدار اور بے لوث ہونا ہے۔ اس کی اپنی کوئی قوم، کثیر رشتے دار وغیرہ نہ ہو۔ وہ کسی گروہ یا طبقے کی طرف جھکاؤ نہ رکھتا ہو۔ وہ کسی کا حق کو نیند نہ بھوک وغیرہ کا بھی محتاج نہ ہو البتہ ہر دوسرا اس کا محتاج ہو۔ پھر اس کا کوئی ادنیٰ ذاتی مفاد نہ ہو کہ اسے قانون میں

کہیں ڈنڈی مارنے کی ضرورت پڑے۔

ایک اور صفت جو قانون ساز میں ہونا لازمی ہے اس کا سپریم مقتدر ہونا ہے۔ وہ بڑے سے بڑا ہو کوئی اس کے ارادے میں حائل ہونے والا اور اس کے کام میں مزاحمت پیدا کرنے والا نہ ہو۔ وہ اپنے قانون کو نافذ کرنے اور قانون شکن کی گرفت کرنے پر کلی طور پر قادر ہو۔ وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہ ہو بلکہ ہر کوئی اس کے سامنے جوابدہ ہو۔ اس کا اقتدار صرف انسانوں پر ہی نہ ہو بلکہ ہر ذی روح غیر ذی روح پر بھی ہو۔ موت و حیات، جزا و سزا اور سلب و عطا اسی کے ہاتھ میں ہو۔ ہر چیز فنا ہو جائے لیکن قانون ساز نہ صرف لافانی بلکہ ہر وقت ہر جگہ ہر کسی کے ساتھ ہو۔

مندرجہ بالا اوصاف کو دیکھا جائے تو سوائے اللہ کی ذات بابرکات کے نہ ان پر کوئی انسان پورا کرتا ہے نہ کوئی پارلیمنٹ نہ کوئی جنرل نہ فرشتہ۔ یہی مطلب ہے ”ان الحکم اللہ“ اور ”الاول الحکم“ کا۔ بنامریں خلافت کے نظام حکومت میں اصل مطاع اللہ تعالیٰ ہے۔ دوسری اطاعتیں اور فرمانبرداریاں صرف ایک صورت میں قابل قبول ہوں گی کہ وہ خود اللہ پاک کی اطاعت کے تابع اور تحت ہوں۔ خالق کی مافرمانی میں کسی حقوق کی اطاعت کا کوئی سوال نہیں۔

رسالت: خلافت کے نظام حکومت میں اللہ تعالیٰ کو کوئی ایسی اطاعت قبول نہیں جو کہ رسالت کے راستے سے نہ ہو اس لئے کہ خود اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا پتہ دینے والا اور اللہ اور انسانیت کے درمیان رابطے کا واحد ذریعہ رسول ﷺ ہے۔ رسول ﷺ کی اطاعت ہو تو اللہ تعالیٰ کو اطاعت قبول ورنہ قطعاً نہیں۔ فرمایا گیا:

”کہو اللہ و رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر وہ ایسا نہ کریں تو جانے رہیں کہ اللہ ایسے کافروں سے محبت نہیں کرتا۔“ (آل عمران: 32)

رسول صرف احکامات و ہدایات الہیہ کو پہنچانے والا ہی نہیں ہوتا، شارع بھی ہوتا ہے۔ وہ ان احکامات و تعلیمات کے مطابق ایک نظام زندگی کو استوار کر کے اسے رواں دواں رکھنے کا ذمہ دار بھی ہوتا ہے۔ وہ نیکی و ہدیٰ جزا و سزا اور جنت و دوزخ کی خبر دینے والا ہی نہیں ہوتا، احقاق حق اور ابطال باطل کا ذمہ دار بھی



ہوتا ہے۔

اولی الامر منکم: اسلام کے نظام حکومت میں اطاعت کا تیسرا ستون ”اولی الامر منکم“ ہوتے ہیں البتہ اس کڑی شرط کے ساتھ کہ وہ خود اللہ و رسول ﷺ کی بدرجہ اتم اطاعت میں ہوں۔ جو نبی وہ اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت سے نکل جائیں وہ اپنا حق اطاعت کھودیتے ہیں۔ اگر اولی الامر کے آپس میں یا عوام اور اولی الامر کے مابین کوئی تنازع ہو جائے تو لازمی ہے کہ اسے اللہ و رسول ﷺ یا باقاعدہ دیگر قرآن و سنت کی طرف لوٹایا جائے۔ بڑے بڑے زور سے کہنے کی بات ہے کہ جس طرح رسول ﷺ کی اطاعت کے بغیر اللہ کی اطاعت کا کوئی سوال نہیں اسی طرح مابعد رسول ﷺ اولی الامر کی اطاعت کے بغیر اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کا کوئی تصور نہیں۔ پھر یہ اطاعت اسی طرح ”سمیع و طاعت“ والی اطاعت ہے کہ جس طرح امام نماز کی کہ ادھر امام نے آواز دی اور ادھر لاکھوں کروڑوں مسلمان فی الفور سجدہ ریز ہو گئے۔ سب محمود و یا ز ایک ہی صف میں ایک ہی آواز پر بغیر ادنیٰ توقف و چپکا بہت ایک کہنے کے پابند۔ نبی رحمت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے اولی الامر کی بات سنے اور ماننے خواہ اسے پسند ہو یا نہ پسند، تاہنیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے اور جب معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر اسے نہ کچھ سننا چاہئے نہ ماننا چاہئے۔“ (بخاری و مسلم)

اولی الامر میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے سربراہ ہوں خواہ وہ فکری رہنمائی کرنے والے علماء ہوں، ملکی انتظام چلانے والے سیاسی لیڈر ہوں، عدالتی فیصلے کرنے والے جج ہوں یا تمدنی و معاشرتی امور چلانے کے ذمہ دار حکام و رہنما ہوں۔ اس بارے میں سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ اسلام کے نظام حکومت میں خلیفہ کے بغیر اولی الامر کا کوئی تصور نہیں بلکہ اولی الامر میں خلیفہ کی حیثیت وہی ہے جو اہرام فلکی میں سورج کی یا درخت میں جڑ کی۔ جڑ جواب دے جائے تاکہ کھلا پڑ جائے شاخیں سوکھ جاتی ہیں اور پتے دائیں بائیں پھٹ جاتے ہیں۔ خلیفہ نہ رہے اولی الامر کا وجود معدوم ہو جاتا ہے۔ اولی الامر نہ رہیں اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت درہم برہم ہو جاتی ہے۔ اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت درہم برہم ہو جائے امت تک کا وجود نہیں رہتا۔ متحارب اور متعصب قومیں معرض وجود میں آجاتی ہیں۔ فرقے اور مسلک

جہم لیتے ہیں اور ہر کوئی جدھر چاہے منہ اٹھائے چل پڑتا ہے۔ کفر غالب آ جاتا ہے اسلام والے (برائے نام مسلمان) مغلوب ہو جاتے ہیں۔ ذلت و رسوائی مسلمان کا مقدر بن جاتی ہے۔ دنیا بھر میں ارزانی ہوتی ہے تو خونِ مسلم کی اور ویرانی ہوتی ہے تو عصمتِ مسلم کی۔ بنا بریں ضروری ٹھہرا کہ آئندہ صفحات میں ہم خلیفہ اور دوسرے اعیانِ حکومت پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

## خلیفۃ المسلمین

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا خلافت کے نظامِ حکومت میں بھی بظاہر تو انسان ہی انسانوں پر حکومت کرتے نظر آتے ہیں لیکن یہ حکمرانی کرنے والے افراد مجبور محض ہوتے ہیں۔ نہ خود قانون سازی کر سکتے ہیں نہ کسی دوسرے کی قانون سازی کے پابند ہوتے ہیں۔ ہاں پابند ہوتے ہیں تو صرف اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ قانون کے۔ پوری انسانی تاریخ پر قانونِ الہی آسانی صحیفوں کی شکل میں انبیاء و رسل پر نازل ہوتا رہا ہے جو اس قانون کو نہ صرف اپنی امتوں کو پہنچاتے رہے ہیں بلکہ اس قانون پر خود عمل کر کے اسے عملی طور پر نافذ کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مصلحتاً قانون سازی و حکمرانی کا ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا کہ زمین پر کہیں خود دفتر کھول کر یہ کام کرے۔ اس نے انسان ہی کو کہ جس نے اس دنیا میں کاروبار حیات رواں دواں رکھنا تھا ایک مقررہ مدت تک کچھ صوابدیدی اختیارات اور متعلقہ اہلیتیں دے کر اس دھرتی پر اپنا نمائندہ (خلیفہ) مقرر کر رکھا ہے۔ باقائے دگر اس دنیا میں پیدا ہونے والا ہر مرد و زن اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے۔ خلیفہ ہوتے ہوئے ہر انسان پابند تو ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی مرضی کو اسی کے عطا کردہ قوانین کے مطابق بروئے کار لائے لیکن چونکہ ایک مدت تک اسے صوابدیدی اختیارات حاصل ہیں لہذا وہ چاہے تو قوانینِ الہی کی پابندی کرے اور چاہے تو خیانت کا مرتکب ہوتے ہوئے خود ساختہ قوانین اپنائے۔ آج کی دنیا دو گروہوں میں منقسم ہے۔ ایک گروہ صحیح حق نمائندگی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی مرضی کو اسی کے دیئے ہوئے قوانین کے مطابق بروئے کار لانے کے درپے ہے اور مسلم (ماننے والا) کہلاتا ہے جبکہ دوسرا گروہ قوانینِ الہی کو پس پشت ڈال کر خود ساختہ قوانین کو اپنائے ہوئے ہے اور کافر (انکار کرنے والا) کہلاتا ہے۔ ہر دو گروہ البتہ زیر آزمائش ہیں اور روزِ محشر اپنی اس دنیا میں کی گئی کارکردگی کی بنیاد پر جزا و سزا کے مستحق قرار پائیں گے۔

جیسا کہ ذکر ہوا انبیاء کرام نے صرف ہدایات وحی یا قوانین الہی کو صرف اپنی اپنی امتوں کو پہنچایا ہی نہیں ان پر عمل کر کے بھی دکھایا ہے۔ یہ پہنچانے کا کام فرائض نبوت کا حصہ ہوتا ہے اور عمل کر کے ایک معاشرہ اور ایک نظام کو معرض وجود میں لانے کے کام فرائض خلافت ہیں۔ بالفاظ دیگر ہر نئی بیک وقت نئی بھی ہوتا ہے تو خلیفہ بھی۔ جب ارتحائی تمدنی اور حتمی ہدایات بھیج کر سلسلہ نبوت کو منقطع کر دیا تو قرآن پاپا کہ آئندہ یعنی مابعد نبوت فرائض خلافت کا کام مخصوص اہل بیتوں کا حامل مردودا کرے گا جسے خلیفۃ المسلمین، امیر المؤمنین وغیرہ ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ خلیفہ خلافت کے نظام حکومت کا سربراہ اور اولی الامر کا مرکزی کردار ہوتا ہے۔ اصل میں نظام خلافت کو چلانے کے لئے ہر مسلمان اپنی خلافت کا ایک حصہ خلیفۃ المسلمین کے ہاتھ دے دیتا ہے۔

خلیفہ کے بغیر جسے اسلام میں اولی الامر کا کوئی تصور نہیں اسی طرح خلیفہ کے بغیر نظام خلافت کے معرض وجود میں آنے کا کوئی سوال نہیں۔ خلیفہ یا خلیفۃ المسلمین منفرداوصاف کا حامل ہی نہیں منفردا اختیارات کا حامل بھی ہوتا ہے۔ ”باتھ بندھا“ اس قدر کہ عرف قوانین الہی یعنی قرآن و سنت کے احکامات کو نافذ کرنے کا پابند، خود کوئی قانون سازی نہیں کر سکتا۔ مقتدر اس قدر کہ پوری اسلامی دنیا خواہ وہ پورے کرہ ارض پر پھیلے ہوئے ہو، کے تمام ذرائع اور وسائل اس کے ہاتھ میں مرکوز ہوتے ہیں۔ پھر سپہ سالار اعظم بھی وہی، صرف اس کے ایماء و حکم پر دشمنان اسلام سے جنگ ہو سکتی ہے۔ عدلیہ کا سربراہ تو قاضی القضاۃ ہی ہوتا ہے لیکن خلیفہ ایک لحاظ سے اس سے بھی اوپر اس لئے کہ شوری کے مشورہ سے اجتہاد صرف خلیفہ کے فرائض میں آتا ہے۔ معلم امت بھی وہی یعنی امت مسلمہ کے اخلاق و کردار اور تربیت کا محافظ و ذمہ دار وہی ہوتا ہے۔

ایک اور لحاظ سے بھی خلیفۃ المسلمین کی حیثیت نہ صرف منفرد بلکہ عام حکمرانوں سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔ ایک تو وہ قرآنی معیار اہلیت (جس کا ذکر بعد میں ہوگا) کا حامل ہوتا ہے اور اسی بنیاد پر چنا جاتا ہے۔ دوسرے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد اس نے دو بڑی نمایاں ذمہ داریاں نبھانا ہوتی ہیں۔ پہلی ذمہ داری تو یہ کہ دارالخلافت کی مرکزی مسجد میں امامت و خلافت کے فرائض اسی نے ادا کرنے ہوتے ہیں۔ اور دوسرے اس نے اپنی زندگی ایک اوسط شہری کے معیار کی گزرا رہا ہوتی ہے۔ کہنے کو تو یہ دو ذمہ داریاں ایک فخرے میں بیان

ہو گئیں لیکن عملاً ان کے استقدر دور رس نتائج کہ نظام خلافت کی برکات اور فیوض و فوائد کا اصل سرچشمہ ہیں۔  
 فریضہ امامت و خطابت ادا ہونے سے مملکت کے ہر شہری کی رسائی، شہری کی صوابدید پر ہوی ہے جب چاہے  
 خلیفہ سے مل لے لوگوں کے مسائل جمع ہو ہی نہیں پاتے بلکہ سونے سے پہلے ہی حل ہو جاتے ہیں۔ اوسط سطح کا  
 از خود اختیار کردہ معیار زندگی منصب خلافت کو پھولوں کی سیج تو کیا کانٹوں کا بستر بناتا ہے۔ انسانیت کی حقیقی  
 خدمت کرے والا ہی ایسا منصب قبول کرنا ہے ورنہ معذرت۔ یاد رہے خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؓ خود کو اس سطح پر لایا  
 تو سہی لیکن ان گنت لواحقین و قربت داروں کی مارا فنگی مول لے کر۔ اسلام حلال ذرائع سے کمانے اور حلال  
 مدوں پر خرچ کرنے کی شرط لگا کر اجازت دیتا ہے کہ ایک مسلمان بے شک لاکھوں کروڑوں کا مالک بن جائے  
 نہیں ایسی اجازت دیتا تو ایک خلیفہ المسلمین کو۔ اسے بہر حال اوسط شہری کا معیار زندگی اختیار کرنا اور امت  
 کے لئے سادگی و بچیت کا نمونہ بننا ہوتا ہے۔ اندازہ لگائیں جب خلیفہ خود اس معیار زندگی کا پابند ہوگا تو اور کون  
 ہوگا جو اجازت ذرائع اختیار کر کے دولت کما نہ لگائے۔

خلیفہ کے متعلق ایک اور اہم بات کا اعادہ ضروری ہے۔ ایک وقت میں پوری اسلامی دنیا کا صرف  
 ایک ہی خلیفہ ہو سکتا ہے۔ دو یا دو سے زیادہ نہیں۔ ایک خلیفہ کے ہوتے ہوئے اگر کوئی دوسرا سر اٹھانے کی  
 کوشش کرے تو بار بار تائید کی گئی کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ ظاہر ہے جب دوسرے کو دعویٰ کرتے ہی ختم کر دیا  
 جائے گا تو دو سے زیادہ بیک وقت خلفاء ہونے کا کیا سوال؟

## شوری

خلافت کے نظام حکومت میں منصب خلافت کے بعد دو سراہے اور بنیادی ادارہ شوری کا ہے۔  
 اسلام شورائی نظام کا علمبردار ہے۔ قرآن مجید میں آیا ”امر ہم شوریٰ“ یعنی مسلمان اپنے معاملات آپس  
 کے مشورہ سے چلانے کے پابند ہیں“ (شوری: 38)۔ باہمی مشورے سے باہمی معاملات چلانے کی اس قدر  
 اہمیت ہے کہ پیغمبر ﷺ کو بھی مشورے کا پابند کر دیا گیا۔ فرمایا ”شاور ہم فی الامر“ یعنی انہیں شریک مشورہ رکھو  
 (آل عمران: 159)۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا پیغمبر وقت خلیفہ وقت بھی ہوتا ہے۔ یہ کار خلافت ہی ہے  
 جس میں پیغمبر کو مشورے کا پابند کیا گیا“ کار رسالت میں تو انسانی مشورہ نہ مطلوب نہ درکار۔ خلیفہ المسلمین کے

لئے مشورہ لینا تو لازم ہے مشورے کو قبول کرنا لازم نہیں سوائے اس مشورے کے کہ جو اس کی ذات یعنی برطرفی، مشاہیرے وغیرہ کے متعلق ہو۔ بالعموم تو اسے ارکان شوریٰ کی اکثریت پر عمل پیرا ہونا ہوتا ہے لیکن وہ اقلیت کے مشورے بلکہ ایک رکن شوریٰ پر بھی بلکہ اپنے فیصلے پر بھی عمل کر سکتا ہے بشرطیکہ ایسا مشورہ یا فیصلہ قرآن و سنت کی کسی نص پر مبنی ہو۔ خود رسول ﷺ نے ایک فرد کے مشورے پر بھی عمل کیا جیسے کہ غزوہ خندق کے موقع پر زیادہ افراد کے مشورے کو بھی اپنایا جیسے کہ غزوہ احد کے موقع پر اور زیادہ بلکہ تمام موجود مسلمانوں کے مشورے کو ٹھکرا بھی دیا جیسے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر۔ اس موقع پر بھی اپنی بیوی سے مشورہ بہر حال کیا۔

اسلامی شوریٰ دنیا کے دستور ساز اداروں اور پارلیمنٹوں سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔ خلافت میں خلیفہ اور ارکان شوریٰ کے ہاتھ بندھے ہوتے ہیں، وہ اصولی اور بنیادی قانون سازی نہیں کر سکتے۔ ہاں کسی بھی نئی صورت حال کے لئے قرآن و سنت سے استنباط کر کے اجتہاد کر سکتے ہیں۔ وہ انتظامی و ملکی امور میں ایسی ذیلی قانون سازی بھی کر سکتے ہیں کہ جو قرآن و سنت کے خلاف نہ ہو۔ مثال کے طور پر وہ یہ فیصلہ تو کر سکتے ہیں کہ ایک وقت میں اسلامی مملکت کے کتنے صوبے اور کتنے گورنریوں لیکن یہ فیصلہ کرنے کے ہرگز مجاز نہیں کہ کسی غیر مسلم کو گورنر بنادیں اس لئے کہ گورنر اولی الامر کا حصہ ہوتا ہے اور یہ اصولی قانون اللہ تعالیٰ نے خود دے دیا کہ ”اولی الامر منکم“ یعنی اولی الامر صرف مسلمانوں میں سے ہوں۔ اصل میں جیسے کہ شوریٰ کے کام سے ظاہر ہے اس ادارے کا وہ حکام برتنی صورت میں قرآن و سنت کی روشنی میں مشورہ دینا ہوتا ہے اور بس۔

## عدلیہ

نظام خلافت میں عدلیہ آزاد اور خود مختار ہوتی ہے۔ قاضی القضاۃ کی تعیناتی تو حکومت ہی کرتی ہے لیکن تعیناتی ہونے کے بعد قاضی القضاۃ انتظامی امور میں خود مختار ہوتا ہے تو عدالتی امور میں صرف اللہ تعالیٰ کو جوابدہ۔ بوقت ضرورت خلیفہ وقت کو بھی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہونا ہوتا ہے اس لئے کہ اسلام میں قانون سے بالا کوئی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے قانون کا یہی اعزاز ہے کہ وہ شاہد و گواہ پر یکساں لاگو ہوتا ہے۔ ایک لحاظ سے خلیفہ وقت عدلیہ کی رہنمائی ضرور کرتا ہے اور وہ اس طرح کہ شوریٰ کے مشورے سے اجتہاد یا ذیلی قانون سازی اسی کے فرائض کا حصہ ہے۔ عدلیہ نے تو قانون کے مطابق فیصلے کرنا ہوتے ہیں

خواہ قانون پہلے سے قرآن و سنت میں موجود ہو یا قرآن و سنت کی روشنی میں خلیفہ شوریٰ نے بذریعہ اجتہاد تیار کیا ہو۔

## سیاسی جماعتیں

اسلام متحارب سیاسی جماعتوں اور متعصب مذہبی فرقوں کی پرزور نفی کرتا ہے حتیٰ کہ معروف و معروف حزب اقتدار اور حزب اختلاف کا بھی کوئی وجود نہیں۔ حکومتی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے حکومت وقت تو حزب اقتدار ہوتی ہی ہے باقی پوری امت حزب اختلاف ہوتی ہے۔ اس معنی میں کہ کوئی ادنیٰ شہری خلیفہ وقت اور اعیان حکومت سے باز پرس کر سکتا ہے۔ اجازت ہے اسلام میں تو ایسی جماعتوں اور اداروں کی جو کوئی نہ کوئی امتی کام سنبھالے ہوئے ہوں جیسے دعوت دین، امر بالمعروف و نہی عن المنکر وغیرہ۔ نظام خلافت میں ایسے کاموں کے لئے وزارتوں کی تشکیل کرنا بھی ضروری ہے۔

## فرائض حکومت

نظام خلافت کی حکومت کا فرض اللہ تعالیٰ کی عبادت رسول ﷺ کی اطاعت اور عوام کی خدمت ہے۔ ایک حدیث میں رسول ﷺ نے اسلامی حکومت کے فرائض کو کوزے میں دریا بند کرنے کے مصداق فرمایا ”سید القوم خادمہم“ کہ قوم کا سردار عوام الناس کا خادم ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر ہر وہ کام جو امت مسلمہ اور انسانیت کی بھلائی کے لئے ہو حکومت کے فرائض منصبی میں شامل ہوتا ہے۔ بالخصوص جن فرائض منصبی کا ذکر ایک جگہ پر قرآن مجید میں یوں آیا:

”یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، ایتائے زکوٰۃ کا بندوبست کریں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔“ (حج: 41)

اقامت صلوٰۃ جس میں خلیفہ وقت کا دار الخلافہ کی مرکزی مسجد میں امامت و خطابت کے فرائض ادا کرنا اور مملکت کی باقی مساجد میں خلیفہ ہی کی ایما (On Behalf of) پر امامت و خطابت کا بندوبست

شامل ہے پورے سماجی و معاشرتی ڈھانچے کو صحیح اور موزوں اطوار پر رکھنے کا بہترین ہتھیار ہے۔ ایسے زکوٰۃ و صدقات جس کا انتظام بیت المال کے ذریعہ کرنا ہوتا ہے اقتصادی ڈھانچے کو اس ڈھب پر رکھتا ہے کہ ایک طرف سرمایہ چند ہاتھوں میں جمع نہ ہونے پائے تو دوسرے طرف ہر شہری کی بنیادی ضروریات تمام و کمال پوری ہوں۔ اسی طرح امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرائض پوری انسانیت کو سنوار کر رکھنے اور بگاڑ سے بچانے کے لئے تریاق کی حیثیت رکھتے ہیں۔

## انعقاد حکومت

حکومت سازی کے سلسلہ میں اس بات کو ذہن میں رکھنا بنیادی حیثیت کا حامل ہے کہ کئی دور نبوت ”قیام خلافت“ کا دور ہے تو مدنی دور نبوت بشمول دور خلافت راشدہ ”دوام خلافت“ کا دور ہے۔ قیام خلافت کا مسنون طریقہ تو انتخابی نہیں انقلابی ہے اور اصل میں وہی ہے کہ جو لا الہ الا اللہ میں مضمر ہے کہ جس نظام کو بدلنا ہے اس سے کنارہ کشی کی جائے اور جس نظام کو لا ما ہے اس کی دعوت دی جائے۔ اس طریقے سے مصائب و مشکلات کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ لیکن کچھ مدت بعد نصرتِ ایزدی انقلابیوں کے شامل حال ہو جاتی ہے لہذا انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ حکومت سازی کا انتخابی طریقہ مدنی دور نبوت میں نبی ﷺ کی موجودگی میں درکار ہی نہ تھا البتہ دور خلافت راشدہ میں مستعمل ہوا۔ چاروں خلفاء راشدین کا انتخاب قدرے مختلف انداز میں ہوا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ انتظامی و ہنگامی امور میں طرز انتخاب میں بوجہ ضرورت قدرے رد و بدل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ البتہ وہ بنیادی اصول جن کی ہر طرز انتخاب میں پیروی کی گئی اور جنہیں قرآن و سنت پر مبنی ہونے کی بنا پر لازماً اختیار کرنا ہوتا ہے درج ذیل ہیں:

- ☆ امیدوار کھڑے ہو کر اپنے حق میں کونیننگ کرنے کی دو ٹوک نفی۔
- ☆ خلیفہ وقت کا انتخاب محض اربابِ حل و عقد کی رائے (بیعت) سے ہوا، امت کے ہر بالغ فرد نے انتخاب میں حصہ نہ لیا۔ بصورت دیگر جبلاء ہی قیادت پر متمکن ہوتے ہیں۔ کیونکہ عوام الناس کی اکثریت ہمیشہ جاہل ہوتی ہے۔ (اکثر الناس لا یعلمون)
- ☆ اہل اور قابل ترین قیادت کو آگے لانے کے لئے قرآنی معیارِ اہلیت جو پانچ اوصاف پر مشتمل ہے

کی پابندی کی گئی۔ یہ پانچ اوصاف ہیں ایمان (نور: 55) تقویٰ (حجرات: 13) صلاح (نور: 55) علم اور جسم (بقرہ: 247)۔ یہ اوصاف ایسے جامع ہیں کہ ہر دوسرے وصف کا احاطہ کرتے ہیں۔

☆ ایک دفعہ منتخب ہو جانے والی قیادت کو بنانا درج ذیل تین صورتوں میں ہی جائز و رہنما حیات قائم و دائم:

- وفات پا جانے کی صورت میں
  - از خود معذرت کر لینے کی صورت میں اور
  - قرآنی معیار اہلیت میں کسی ایک یا زیادہ پلٹیوں میں کمی آنے کی صورت میں۔
- آج کے دور میں کوئی بھی طرز انتخاب اختیار کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ ان اصولوں سے رقی بھر انحراف نہ ہو۔ ذیل میں ہم ایک ایسے ہی طرز انتخاب کا ذکر کرتے ہیں۔ یاد رہے خلافت قائم ہونے کی صورت میں موجودہ اسلامی ممالک کی حیثیت اس عظیم تر اسلامی مملکت واحدہ کے صوبوں کی ہوگی جسے ہم نے ”دارالسلام“ کا نام دے رکھا ہے۔ ہر صوبے کے سربراہ کا نام ”امیر“ ہوگا تو پوری اسلامی دنیا یعنی دارالسلام کے سربراہ کو امیر المومنین کا نام دیا جائے گا۔ پہلے مرحلہ میں صوبوں کے امراء کا انتخاب ہوگا تو دوسرے میں امیر المومنین کا۔

## مجوزہ طرز انتخاب

جب معیاری لوگ آگے لانے ہوں تو ضروری ہے کہ وہ ادارہ یا معیار جو اہل لوگوں کی نشاندہی کرنے کی ایک ہی ہو۔ دارالسلام کی سطح پر ایسا واحد ادارہ الیکشن کمیشن ہی ہو سکتا ہے یعنی ہر صوبے میں صوبائی الیکشن کمیشن تو دارالسلام کی سطح پر وفاقی الیکشن کمیشن۔ پہلے مرحلے میں چونکہ صوبائی امراء کا انتخاب مطلوب ہے لہذا ہر صوبے میں مثال کے طور پر پاکستان میں پاکستان کا الیکشن کمیشن حسب ضرورت یا مثال کے طور پر پچاس الیکشن بینک بنائے گا۔ ہر بینک تین ایسے افراد پر مشتمل ہوگا جن کی شرافت اور دیانت دارانہ شہرت مسلمہ ہو۔ یاد رہے اسلامی تعلیمات کے مطابق ایسے نیک سیرت انسان وقت کے ہر موڑ پر موجود ہوتے ہیں۔ الیکشن چیلوں کی تشکیل کے ساتھ ساتھ پورے پاکستان کو مناسب سائز کے حلقوں میں تقسیم کر لیا جائے (حلقے کا سائز موجودہ



قومی اسمبلی کے حلقوں کے برابر بھی ہو سکتا ہے)۔ ہر حلقہ کے لئے مقرر کردہ الیکشن بینل اپنے حلقہ میں سات دن مختلف ریٹ باؤسوں یونین کونسل کے ذخیروں یا دوسری مناسب جگہوں پر اس پروگرام کے تحت قیام کرے کہ جس کا پہلے سے اخبارات و اشتہارات کے ذریعہ اعلان کیا جائے۔ اس ساری سعی کا مقصد یہ ہے کہ متعلقہ بینل حلقے کے لوگوں سے اس قدر قریب تر رابطہ قائم کرے کہ گویا بالایان حلقہ کا ہی حصہ بن جائے۔ اپنے قیام کے دوران متعلقہ آبادی میں سے بہ مشورہ عوام ایسے لوگوں کی خفیہ فہرست تیار کی جائے کہ جو قرآنی معیار اہلیت کے حامل ہوں۔ فہرست تو پہلے ایسے تقریباً 150 افراد (مردوں) کی تیار کی جائے لیکن کانٹ چھانٹ اور کراس چیکنگ کے بعد اسے 100 افراد تک محدود کر دیا جائے۔ اس طرح سات دنوں میں 50 بینل چپاس حلقوں کی فہرستیں تیار کر لیں گے۔ اسی حساب سے کم و بیش 50 حلقوں کا سروے تقریباً تین ہفتوں میں مکمل ہو جائے گا۔ سروے مکمل ہونے کے دس دن کے اندر راندر صوبائی الیکشن کمیشن انہی ممبران بینل کی خدمات سے استفادہ کرتے ہوئے ہر حلقہ کی فہرست میں شامل کردہ 100 افراد کو متعلقہ حلقہ ہی میں کسی ایک جگہ پر برائے مشورہ طلب کرے۔ ضروری نہیں کہ ایسے تمام اجتماعات پورے صوبے میں ایک ہی دن ہوں۔ لیکن اگر ہوں بھی تو کوئی حرج نہیں۔

مشورہ کے اغراض و مقاصد بتانے کے بعد بلائے گئے افراد میں سے ہر ایک کو 100 افراد کی تیار کردہ فہرست کی ایک کاپی مہیا کی جائے اور اسے فہرست میں دیئے گئے افراد میں سے مطلوبہ (پاکستان کی صورت میں مثلاً دس) افراد کو جن کو کہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ قرآنی معیار اہلیت پر بدجہ اہم پورے اترتے ہیں خفیہ طور پر ٹک کرنے کو کہا جائے۔ جو شخص اپنے نام کو بھی ٹک کرے اس کے مشورے کو نہ صرف مسترد کر دیا جائے بلکہ اسے کسی بھی عہدے کے لئے نااہل قرار دیا جائے۔ اس طرح سے جو شخصیت سب سے زیادہ ٹک ہو اسے متعلقہ صوبہ کی طرف سے وفاقی شوریٰ کارکن ہونے کی سعادت ہو۔ جو دوسرے نمبر پر آئے اسے صوبائی شوریٰ کارکن گردانا جائے۔ باقی ٹک شدہ افراد میں سے مطلوبہ تعداد کو زول شوریٰ کارکن بنایا جائے۔ اس کے لئے ہر صوبے کو ایک کروڑ آبادی پر مشتمل زونوں میں تقسیم کیا جائے۔ ہر زون کی انتظامیہ علیحدہ اور ایک گورنر کی سربراہی میں ہو (اس مرحلے پر پاکستان کے غالباً 15 زون بنانا ہوں گے) اگر کوئی منتخب شخص معذرت کر لے تو

ظاہر ہے پھر فہرست میں تک کردہ گئے فرد کو لیا جائے گا۔

امیر المومنین کا چناؤ وفاقی شوریٰ کے ارکان آپس میں اسی طرح بغیر کسی رکس شوریٰ کے امیدوار کھڑا ہونے کے حقیر رائے دی سے کریں۔ صوبائی امراء کا چناؤ صوبائی شورا میں کریں اور زوقل گورنروں کا انتخاب زوقل شورا میں کریں۔ وفاقی وزراء کا انتخاب علیحدہ وقت اور صوبائی وزراء کا چناؤ صوبائی امراء کی صوابدید پر ہو۔ نیز ملکی سطح پر ایسے انتخابات پوری تاریخ میں صرف ایک ہی دفعہ ہوں۔ کسی رکن شوریٰ کی سیٹ خالی ہونے کی صورت میں صرف متعلقہ حلقہ میں دوبارہ انتخاب ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا تجویز کردہ طرز انتخاب جملہ اسلامی تقاضوں کو پورا کرتا ہے تاہم حرفہ آخر نہیں۔ قرآن و سنت کی شرائط کی پابندی کرتے ہوئے طرز انتخاب میں حسب ضرورت رد و بدل کیا جاسکتا ہے۔ مذکورہ طرز انتخاب نہ صرف سستا آسان مختصر وقت میں اور معمولی عمل سے مکمل ہوئے والا ہے بلکہ مرد و چہ انتخابی شورشرا بنے گروہی و جماعتی محاذ آرائیوں اور برادریوں کی محاصروں سے بھی قطعی پاک ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ دارالسلام صوبائی اور زوقل سطح پر صرف ایک ہی دفعہ درکار ہے پھر کبھی نہیں۔ اس کا یہ بھی طرہ امتیاز کہ صرف اعلیٰ اور امانتدار افراد ہی قیادت پر متمکن ہو سکتے ہیں و وٹری محتاجی کا کوئی سوال نہیں۔ دور دراز کا ایک غریب دیہاتی بھی ذاتی اہلیت کی بنا پر عوامی نمائندہ اور حکمران منتخب ہو سکتا ہے۔

## اقلیتیں

اسلام احترام مسلم کا ہی نہیں احترام آدمیت کا علمبردار ہے۔ رنگ و نسل اور مذہب و عقیدہ کا لحاظ کئے بغیر ہر شہری کو یکساں حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ فرق اگر کچھ ہے تو اتنا کہ کھیدی آسامیوں پر غیر مسلم نہیں لگائے جاسکتے اور وہ اس لئے کہ نظام خلافت مجموعی طور پر قرآن و سنت پر مبنی رکھنا ہوتا ہے اور غیر مسلم قرآن و سنت پر چونکہ یقین نہیں رکھتے لہذا کھیدی آسامیوں پر اپنا حق تعیناتی وہ خود تیار کر دیتے ہیں۔ انہیں بہر حال اپنے مذہب و عقیدہ کے مطابق زندگی گزارنے کا سو فیصد اختیار ہوتا ہے بلکہ وہ اپنے مذہب کی تبلیغ تک کر سکتے ہیں اور مقامی سطح پر وہ اپنے نمائندے بھی منتخب کر سکتے ہیں۔ زکوٰۃ چونکہ ایک اسلامی فریضہ ہے اور غیر مسلموں کو کسی اسلامی فریضے کا پابند نہیں کیا جاسکتا لہذا وہ زکوٰۃ سے تو ماورا ہوتے ہیں البتہ امور مملکت میں انہیں اپنا حصہ بطور جز یا واکرنا ہوتا ہے۔

# خلافت کا نظام عبادت

عبادت کے متعلق چند ابتدائی باتوں کا سمجھنا نہایت مفید رہے گا۔ اس بارے میں پہلی بنیادی بات یہ ہے کہ عبادت اسی طرح اللہ تعالیٰ ہی کو سزاوار ہے جس طرح حکومت، حمد اور ملکیت۔ اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سے سرفہرست ہے ہی عبادت۔ حمد، حکومت اور ملکیت تو پھر بھی عارضی طور پر ہی سہی کسی درجے کسی دوسری شے سے منسوب کی جاسکتی ہے عبادت قطعاً نہیں۔ پھول خوبصورت ہو تو اتنا تو کہا جاتا ہے کہ پھول خوبصورت ہے۔ حالانکہ حقیقت کے اعتبار سے تعریف کے لائق خالق حسن ہے نہ کہ صاحب حسن۔ خوبصورت ہونا اور خوبصورت رہنا اگر پھول کے بس میں ہوتا تو اس کا حسن دائمی ہوتا وہ کبھی بھی خود کو خوبصورتی سے محروم نہ ہونے دیتا۔

جیسا کہ سورہ نساء کی آیت نمبر 59 میں آیا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ رسول ﷺ اور اولی الامر کی اطاعت بھی لازمی ہے۔ لیکن عبادت فی الذات صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے۔ رسول ﷺ کی اطاعت مستقل اور دائمی تو ہے بلذات ہرگز نہیں۔ قرآن میں آیا:

"کسی انسان کا یہ کام نہیں کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کی بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ سچے ربانی سنو جیسا کہ اس کتاب کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔ وہ تم سے ہرگز یہ نہ کہے گا کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو اپنا رب بنا لو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک نبی تم کو کفر کا حکم دے جب کہ تم مسلم ہو؟" (آل عمران: 79-80)

"بعد از خدا بزرگ توئی" یعنی رسول ﷺ سے اعلان کروایا گیا تو یہ:

"کہو میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنے کا کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سرِ اطاعت جھکانے والا میں ہوں" (انعام: 162)

اولی الامر کی اطاعت تو ہے ہی اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کے ساتھ شروط۔ اسی لئے تو تنازع کی شکل میں ان کی حدود اطاعت ختم ہو جاتی ہے۔ لازم ہو جاتا ہے کہ قرآن و سنت یعنی اللہ و رسول ﷺ کے احکامات و تعلیمات کی طرف مراجعت کی جائے۔

عبادت کے متعلق ایک اور نیا دی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ عبادت اسی طریقے پر کی جانی چاہیے جس طرح کہ قرآن و سنت میں مذکور ہے۔ انسان کی صوابدید پر نہیں چھوڑا گیا کہ وہ خود کو تجربات میں الجھائے اور عبادت کیلئے خود طریقے وضع کرنا پھرے۔ عبادت کے انہی مختص طریقوں، سلیقوں اور عقیدوں کا نام ہی تو اسلام ہے۔ بتائیں انسان خواہاں رتبہ انسانی کے کسی بھی مرحلہ پر اس دنیا میں آئے اللہ کے نزدیک اس کے زندگی گزارنے کا پسندیدہ طریقہ اسلام ہی ہے۔ قرآن میں آیا: "اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہی ہے۔ اس دین سے بہت کر جو مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کئے جنہیں کتاب دی گئی تھی سوائے اس کا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ انہوں نے ظلم آنے کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کیلئے ایسا کیا اور جو کوئی اللہ کے احکامات و ہدایات کی اطاعت سے انکار کر دے، اللہ کو اس سے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی" (آل عمران: 19)۔

اسی بات کی مزید تاکید و وضاحت کی تو اس طرح  
 "اسلام کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرے گا اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ کام و امرادر ہے گا" (آل عمران: 85)

عبادت کے طریقہ میں جو قرآن و سنت میں آپکا کوئی تبدیلی کرنا خواہ وہ بزمِ خورشید زیادہ عبادت کے ہی لئے کیوں نہ ہو عبادت کو باطل کر دینا ہے۔ یہی مطلب اس کا کہ "آخرت میں وہ کام و امرادر ہے گا"۔ پھر نیکی وہی ہے جسے قرآن و سنت نیکی قرار دیں اور اسی طرح بدی وہی ہے جسے قرآن و سنت میں بدی گردانا گیا ہے۔ فطرت کی فیکٹری میں تیار ہونے والے انسان کو اللہ تعالیٰ نے یونہی اس دنیا میں نہیں بھیج دیا بلکہ جیسے کہ کوئی بھی فیکٹری والا اپنی فیکٹری میں تیار ہونے والے پروڈکٹ کے ساتھ ہدایت نامہ بھی دیتا ہے اسی طرح پوری انسانی تاریخ پر انبیاء بھی تشریف لائے ہیں اور کتابیں بھی مازل کی گئی ہیں۔ کتاب یعنی قانون

کے ساتھ مشغور کو بھیجی اسی لئے جانا ہے کہ وہ ایک زندگی گزار کر ہر کام کرنے کا نمونہ فراہم کرے۔  
 اسلام نام ہی من مرضی کو اللہ کے سپرد کرنے کا ہے۔ خود کوئی طریقہ وضع کر لیا اللہ و رسول ﷺ کے  
 علاوہ کسی اور کے وضع کردہ طریقے کو اپنانا خواہ وہ بظاہر نیکو کاری ہو، شرک ہے اور اللہ کے ہاں ناقابل معافی  
 جرم۔

کام کرنے کے طریقے دو طرح کے ہیں۔ ایک تو وہ کہ جن میں وقت گزرنے کے ساتھ کسی ترمیم کی  
 ضرورت نہیں۔ مثال کے طور پر اذان دینی ہے یا نماز پڑھنی ہے تو ان میں سے ہر ایک کے لئے طے شدہ  
 طریقہ قرآن و سنت میں موجود ہے۔ کسی کی کیا مجال کہ اس طے شدہ طریقہ میں موئے بھر کی بیشی کرے۔  
 نوعیت کے حساب سے کام کرنے کا دوسرا طریقہ وہ ہے کہ جس میں وقت گزرنے کے ساتھ تبدیلی کا امکان  
 ہے۔ اسلام نے ایسے کام کے لئے خود گنجائش رکھ دی ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ قرآن و سنت سے استنباط  
 کر کے اس میں ترمیم کر لی جائے۔ مثال کے طور پر دو ربیوت میں اونٹ گھوڑے وغیرہ سے کام لیا جاتا تھا۔ آج  
 موٹر کارز بس ہوائی جہاز وغیرہ کی سہولت دستیاب ہے۔ مستقبل میں کوئی اور ذریعہ ٹرانسپورٹ وجود پذیر ہو سکتا  
 ہے۔ ان جدید ذرائع آمد و رفت کو استعمال میں لانے پر کوئی قدغن نہیں، البتہ ان کو استعمال کرنے والے وہی  
 ضوابط قابل قبول ہو گئے جو اونٹ اور گھوڑے کو استعمال کرتے وقت اختیار کئے گئے۔ اس میں رقی بھرتک  
 نہیں کہ اگر یہ طریقے کا فیصلہ نہ کر دیا جاتا تو دنیا میں اتنے ہی دین ہوتے جتنے کہ انسان۔ اس صورت میں فی  
 الحقیقت ہر شخص کا دین اصل میں نفس پرستی کا مظہر ہوتا۔ مثال کے طور پر بھارت کا ایک سابقہ وزیر اعظم اپنا  
 پیٹاب پی لیتا تھا اس لئے کہ وہ من مرضی کی زندگی گزار رہا تھا کسی آفاقی دین کا پابند نہیں تھا۔ مختصراً عبادت بھی  
 قرار پائے گی جب کوئی کام اسی طریقے سے کیا جائے جیسے کہ قرآن و سنت میں بیان ہوا بصورت دیگر عبادت  
 تو کیا بدعت بلکہ بعض صورتوں میں بناوٹ قرار پاتی ہے۔

عبادت کے سلسلہ میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ انسان دو عناصر یعنی مادی جسم اور روح  
 کا مجموعہ ہے۔ اللہ کے ہاں عبادت وہی مقبول ہے جو ان دونوں یعنی روح اور مادی جسم کی متوازن بالیدگی کو  
 یقینی بنائے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کو درخور اعتناء نہ سمجھنا یا ایک کی قیمت پر دوسرے کو وقعت دینا دجائی

پن ہے جس کے مہلک اثرات متعلقہ فرد پر بھی مرتب ہوتے ہیں تو معاشرے پر بھی۔ عالمی تناظر میں مغربی دنیا آج محض مادییت کا شکار ہے تو مشرقی دنیا میں مادی جسم کو مارا کر روحانی بالیدگی کی غیر فطری اور غیر انسانی سب کوششیں تباہی کا پیش خیمہ ہیں۔ انتہائی غلط تصور ہے کہ مادی جسم روح کا قید خانہ ہے اور یہ کہ قید خانے کو کمزور کرنے سے روحانی ترقی ہوتی ہے۔ روح اور مادی جسم کا باہمی تعلق ویسا ہے جیسے کارخانے میں مشینری اور بلڈنگ کا۔ بہتر نتائج کے لئے ضروری ہے کہ مشینری اور بلڈنگ دونوں توانا ہوں۔ کوئی ایک بھی ان میں سے فرسودہ اور ماکارہ ہوگی تو دوسری خواہ کس قدر جدید ہوئے معنی و بے کار۔ بنابرین اللہ تعالیٰ نے روح اور مادی جسم دونوں کی فلاح کے لئے وسائل فراہم کئے ہیں۔ اندازہ کریں زمین پانی ہوا سورج چاند ستارے نیکی، گرمی، دن رات غرضیکہ ان گنت عوامل اپنا پنہا کر دارا کرتے ہیں تو تب کہیں جا کر دانہ گندم تیار ہوتا ہے جو مادی جسم کی خوراک ہے اسی طرح انبیاء و رسول کی بعثت اور آسمانی کتابوں کے نزول کا عظیم انتظام روحانی خوراک فراہم کرنے کے لئے ہے۔ فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر، فریضہ شہادت علی الناس نماز روزے حج زکوٰۃ قربانی وغیرہ سب روحانی بالیدگی کی مختلف کڑیاں ہیں۔ اور تو اور مادی جسم اور روح میں سے ہر ایک دوسرے کی فلاح و ترقی کا باعث ہے۔

ان ابتدائی اشارات کے بعد ہم "خلافت کے نظام عبادت" پر روشنی ڈالتے ہیں۔

### اسلام کا نظام عبادت

اس دھرتی کے خالق و مالک کے نزدیک عبادت کی اتنی اہمیت و ضرورت ہے کہ وہ عبادت ہی کو انسان کی تخلیق کا مقصد قرار دیتا ہے۔ قرآن میں آیا:

"میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے نہیں پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں" (ذاریات: 52)

اشارات کی زبان میں قرآن مجید میں تخلیق آدم کے اور مقاصد بھی بیان ہوئے ہیں لیکن دونوں اور جلی حروف میں مقصد تخلیق آدم بیان ہوا ہے تو اسی جگہ پر۔ پھر جیسا کہ ہم آئندہ صفحات میں دیکھیں گے اللہ کی عبادت ایک ایسا مقصد ہے کہ اسے ادا کرنے سے دوسرے تمام مقاصد کا احاطہ بھی خود بخود ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید کی مذکورہ آیہ مبارکہ سے انسان کی اس دنیا میں پیدائش و آمد کا مقصد تو واضح طور پر سامنے آ گیا لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی عبادت کا مفہوم کیا ہے کہ جو مقصد تخلیق آدم قرار پاتی ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کیلئے انسان کے پیدا کئے جانے کا جو سیدھا سادھا مفہوم نکلتا ہے وہ تو یہی ہے کہ آدمی شادی بیاہ معاشرت، معیشت، سیاست وغیرہ کے کھیلوں میں نہ الجھے حتیٰ کہ روزی کمانے کے چکر میں بھی پڑے، بس وہ ہو تسبیح و مناجات ہوں، اللہ اللہ خیر سلا۔ اس مفہوم کو ذہن رکھ کر جب قرآن و سنت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ تو اس مفہوم کو یہ کہہ کر رو کر دیا جاتا ہے کہ "لا رہبانیت فی الاسلام" کہ اسلام میں رہبانیت نہیں (مسند احمد)۔ اس کے برعکس تعلیمات قرآن و سنت خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات کی بجائے سعی و جہد اور تکبر مسلسل کا درس دیتی ہیں۔ نظام خلافت میں پڑھتوں پادریوں، ملنگوں، جوگیوں، گیانیوں، چڑتوں، حرقہ پوشوں، سنگوں، پرائی روٹیوں پر گد ریسر کرنے والے پیروں، خانقاہی راہبوں، گدی نشینوں وغیرہ کا کوئی مقام نہیں۔ ہر قسمی سے معاصر دنیا میں بہت سے خود ساختہ مذاہب تھے ہیں اور شاید رہیں گے کہ جن کے نزدیک جسمانی فریبی و خوشحالی، روحانی ترقی کے لئے سم قاتل ہے۔ ان کے نزدیک جب تک جسم کو آدھرا اور آدھرا نہ کیا جائے بالیدگی روح ممکن نہیں۔ بنامریں ان مذاہب کے پیروکاروں نے جسم کو بھوکا رکھنے، جھٹھوڑے پیسنے، پراگندہ رہنے، جسمانی لذات سے کنارہ کش ہونے کو روحانی ترقی کے لئے مانگیز قرار دیا۔ اس غلط تصور کے حاملین نے نبیوں کا انکار کیا تو اس کی وجہ یہی گروانی کہ جو شخص کھانا پیتا بیوی بچے رکھتا اور صاف شفاف رہتا ہو اور دوسرے تمام دنیوی کام سرانجام دیتا ہو وہ نہی کیسے ہو سکتا ہے؟ قرآن میں آیا:

کہتے ہیں "یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ کیوں نہ اس کے پاس کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور (نہ ماننے والوں کو) دھمکاتا؟ یا اور کچھ نہیں تو اس کے لئے کوئی خزانہ ہی اتا رو دیا جاتا یا اس کے پاس کوئی باغی ہوتا جس سے یہ روزی حاصل کرتا۔ اور ظالم کہتے ہیں تم لوگ تو ایک سحر زدہ آدمی کے پیچھے لگ گئے ہو" (فرقان: 7-8)

ان غلط تصورات کے برعکس اسلام ایک آفاقی و برہانی دین ہے جو اپنے ماننے والوں کو مظاہر عالم پر

غور و خوض اور تسخیر کائنات کا درس دیتا ہے۔ دائرہ اسلام میں آنے والوں کو علم و معرفت کی تحصیل کے لئے سرتوڑ کوشش کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ انہیں معاشرے کا حصہ بلکہ خود معاشرہ بننے اور معاشرتی زندگی گزارنے کی ترغیب دیتا ہے۔ انہیں بیوی بچوں، لواحقین، معاشرے اور ملک و ملت بلکہ پوری انسانیت کی خدمت کے لئے ابھارتا ہے۔ امت مسلمہ کو "ہیتر امت" قرار دیتا ہے تو اس شرط کے ساتھ کہ وہ انسانیت کی اصلاح اور فلاح و بہبود کے لئے میدان میں اترے۔ اسلام واحد دین ہے جس کا ہر رکن محض اپنے لئے کھانا ہے نہ اپنے لئے رہتا ہے۔ وہ لازم قرار دیتا ہے کہ ایک مسلمان اپنی فلاح و بہبود کے ساتھ ساتھ دوسروں کی فلاح و بہبود میں جتا رہے۔ اسلامی تعلیمات "جاہد فی اللہ حق جہادہ" اور "لیس للانسان الا ما سعی" کا درس دیتی ہیں۔ ایک مسلمان کا وجود دوسرے انسانوں کے لئے خیر و بہرہ رسی اور تقویت کا سرچشمہ ہونا ہے نہ کہ محض بوجھ کا۔ نبی کائنات ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "خیر الناس من سقى الناس" کہ تم انسانوں میں سے بہتر انسان وہ ہے کہ جو دوسرے کے لئے خیر و برکت اور باعث تقویت ہو۔

تارک الدنیا ہونا، رہبانیت اختیار کرنا اور دنیا داری کے جھیلوں میں نہ پڑنا تو اسلام کے نزدیک بزدلی اور ذمہ داریوں سے فراری ہے اور بنا بریں حرام ہے۔ ایک انسان کے پاس ہاتھ پاؤں، ناک کان، روح جسم وغیرہ سب بطور امانت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت خاص سے آزمانے کی خاطر انسان کو ایک مقررہ مدت تک کچھ صوابدیدی اختیارات عطا کر دیئے۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ امانتوں کو ان کے مالک و خالق اللہ کی مرضی کے خلاف من مرضی یا کسی اور کی مرضی کے مطابق استعمال کرنا خیانت ہے جس کا خیارہ بہر حال اسے ایک دن بھگتنا ہے۔ نبی رحمت ﷺ نے مسلمان کی زندگی اس شخص کے مشابہ قرار دی جو کانٹے دار جھاڑیوں سے تو بہر صورت گزرے لیکن اس طور کہ دامن پھا پھا کر۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ "عبادت" جو مقصد تخلیق آدم ہے اگر دنیا سے کنارہ کشی اور راہبانیت وغیرہ نہیں تو پھر کیا ہے؟ شوی قسمت وقت کے ساتھ ساتھ دین حق بھی اپنی اصل پر نہ رہنے دیا گیا۔ بنا بریں مسلمانوں میں بھی منہوم و طرز عبادت میں فرق آچکا۔ مختلف فرقے بلکہ مذاہب وجود میں آ گئے۔ مسجدیں علیحدہ ہو گئیں۔ تصورات و رسومات میں اس قدر فرق آ گیا کہ سینکڑوں فرقے معرض وجود میں آ گئے۔ نظام خلافت



ختم ہوا تو جو حد حرج چاہا چل نکلا۔ آج ہمارے ہاں اُن گنت طریقہ ہائے عبادت یا طریقہ ہائے زندگی مروج ہیں۔ مشکل ہو گیا یہ پہچاننا کہ ان میں سے وہ کونسا طریقہ عبادت ہے کہ جو مقصد تخلیق آدمی قرار پانے کا اہل ہو۔

وَلَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ  
وَلَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ

خدا و جبرائیل و مصطفیٰ را

آئیں پہلے ان مختلف مروجہ طریقہ ہائے عبادت کا اختصار سے جائزہ لیں۔

مسلمان عوام الناس کا ایک طبقہ تو وہی ہے کہ جو عبادت کو تقریباً اسی معنی میں لیتا ہے کہ جس کا ہم اوپر رہبانیت کے تحت ذکر کر آئے۔ رہبانیت نہیں تو ہمارے ہاں کا خانقاہی نظام اسی کا پر تو اسی کا عکس بلکہ رہبانیت کے طعن سے ہی جنم لئے ہوئے ہے۔ خانقاہوں، مزاروں پر چلے جائیں آپ کو ہر رنگ کے دین کے دعوے دار مل جائیں گے۔ جمہورتوں والے رنگ برنگی ٹوپیاں، چادروں اور کپڑوں والے پراگندہ خیالوں والے مشکلوں والے عصا والے زنجیروں والے منکوں اور لالہ والے ٹل اور نللیوں والے نعروں والے ٹوڈو کو ولی جتانے والے اپنی الوہیت کا ڈراوا دینے والے غرضیکہ آپ کو ایک ہی جگہ پر بزمِ خویش دین کے علبرداروں کی ہرورائی مل جائے گی۔ پھر آپ کو انہیں کے سر پرست، اونچی مسندوں والے حج کلاہوں والے بڑے پیاروں اور اونچے میناروں والے بزمِ خویش ہدایت و رشد کے سرچشموں سے بھی پالا پڑے گا۔ سوختہ بخشی ہمیں ایک مدت ہندوؤں، جوگیوں، سادھوؤں وغیرہ کے ساتھ رہنا پڑا۔ یہ سب انہی کی باقیات ہیں۔ ان کا طرزِ کلام، امتِ طرزِ دین، طریقت اور طرزِ واردات، ظاہر کی بجائے باطن۔ کتنا فرق پڑ گیا چودہ سو سالوں میں۔ درہم برقرار رہتا تو کسی کی کیا مجال کہ دین کے ساتھ یوں مذاق کرنا۔

مسلمانوں کا ایک اور طبقہ بلکہ اکثریت اس لئے مسلمان ہے کہ وہ چاروں چار مسلمان گھرانوں میں پیدا ہو گئی، ان کے تمام مسلمانوں کے سے ہیں اور مردم شماری کے فارم میں انہیں مسلم لکھا جاتا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے کہ جو دین کے کم سے کم مطالبہ یعنی نماز روزے سے ماوراء ہے۔ دو ربوت میں تو منافقین تک پانچوں نمازوں کی پابندی کرتے تھے کوئی ایک نماز چھوڑنے کا تصور نہیں تھا۔ انحراف ہوا تو بتدریج۔ کبھی کسی کی ایک نماز قضا ہو گئی، پھر وقت آیا کہ چھوٹے ہی گئی، پھر دو تین نمازوں سے گزرا، ابونے لگا، آج نوبت بائیں رسید کہ تمام عمر نماز

نہ پرہیز مسلمان ہی بہر حال قائم۔ کیا مجال کوئی کمی محسوس کرتا ہو۔

مسلمانوں کا ایک وہ بھی طبقہ ہے کہ جو معترض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہ سوچا کہ پانچ وقت نماز ادا کرنا آیا انسان کے بس میں ہے بھی کہ نہیں؟ اتنی نمازیں اور پھر ہر روز! زیادہ سے زیادہ ہفتہ بھر میں ایک دو بار کی حاضری چاہیے تھی۔ یہ طبقہ لبرل ازم اور روشن خیالی کے زعمِ باطل میں ویسے ہی مسلمان کھپ سے فراری اختیار کئے ہوئے ہے۔ نماز روزے حج زکوٰۃ وغیرہ کو غیر ضروری قرار دیتا ہے، کئی ان میں سے وہ بھی کہ جو کیلکولیٹر لے کر جمع تفریق کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ ایک دن میں ایک مسلمان نمازوں میں کتنا وقت ضائع کر دیتا ہے اور مجموعی طور پر پوری امت کا اس ایک مد میں کتنے وقت کا ضیاع ہوتا ہے۔ یہی طبقہ جانوروں کی قربانی کو ایک سانچہ اور قومی ضیاع قرار دیتا ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے کہ جو پرچار کرتا ہے کہ پردہ تو محض آنکھ کا پتہ عورتوں میں برقع اور مردوں میں داڑھی تو اپنے عیب چھپانے کی سازش ہے۔ اس میں کیا شک نزول قرآن کے وقت اس ذہنیت کے لوگ ہوتے تو منافقین کی صف میں کھڑے کر دیئے جاتے لیکن آج وہ مسلمان ہیں اور دھڑلے سے۔

تما جو ما خوب بتدریج وہی خوب ہوا  
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

مسلمانوں کا ایک اور طبقہ محض "سراب" ہے۔ نماز روزے کا بڑا پابند لیکن مسجد کی حدود سے نکلتے ہی بھول جاتا ہے کہ ہر کام کرتے وقت قرآن سنت کی تعلیمات کو ملحوظ خاطر رکھنا ہے۔ دورانِ کار بھی ہو سکتا ہے کہ تسبیح کے دانے گن رہا ہو۔ حاجی، صوفی، حضرت وغیرہ کہلانے کا بڑا حریص۔ دولت کا پیجاری۔ نماز پڑھ کر سمجھتا ہے کہ جنت تو پکی ہو گئی اب دنیا بناؤ۔ اس کی مثال اس ریل ڈرائیور کی سی ہے کہ جو والٹن ٹرینٹک انسٹیٹیوٹ سے بہت اچھے نمبروں پر پاس ہوا ہو۔ کئی مضامین میں فٹ پوزیشن تک حاصل کی ہو لیکن جب گاڑی چلانا شروع کرے تو پشاور کی بجائے کراچی کو چل نکلے۔ گاڑی جس اسٹیشن پر کھڑی کرنا ہو نہ کرے اور جس پر کھڑی نہ کرنی ہو کھڑی کر دے۔ غرضیکہ مجسمہ فساد ہو ریلوے کے پورے نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دے۔ مسلمانوں کو ایک اور طبقہ ہے جو عام آدمی سے لیکر یونیورسٹی کے پروفیسروں و اعلیٰ علم کے بہتموں

اور یونانی سیاست کے دانشوروں پر مشتمل ہے۔ اکثر و بیشتر شروع چروں والا 'فرائض' کے علاوہ نوافل کا بھی دلدادہ دیکھیں چہ 'حائے والا' و 'قے و قے' سے قرآن خوانی، نعت خوانی اور میلاد کی محفلیں منعقد کرنے والا کسی نہ کسی مسلک کا شکار بظاہر بڑا متقی و پرہیزگار لیکن بایں ہمہ "نہ خود میں نہ خدا میں نہ جہاں میں"۔ دنیا میں کفر کا غلبہ ہو، سیاست و سیادت کر پٹ ہاتھوں میں ہو، معیشت سودی ہو، نظام خلافت معدوم ہو، ملت مسلمہ تحلیل ہو کر اقوام کا روپ دھار گئی ہو، اولی الامر کا وجود تک نہ ہو غرضیکہ دین حق کی بساط الٹ چکی اس طبقہ کی ہلاکت اس کو جو سجدہ کی اجازت ہے سمجھتا ہے سب "اسون" ہے۔ اس کا ذہن کبھی اس طرف منحرف نہیں ہوتا کہ رسول ﷺ نے محض نماز روزے پر ہی اکتفا نہ کیا۔ نبی کائنات ﷺ اور صحابہ نے سعوتیں جھیلیں مشکلات سے دو چار ہوئے تن من و جان کی بازی لگادی لیکن نظام باطل..... سودی معیشت، رسومات و بدعات، بناوٹ پر مبنی سیاست و سیادت کے ساتھ یک قدم چلنے سے انکار کر دیا۔ چین سے نہ بیٹھے جب تک کہ دین حق کو ادیان باطلہ پر غالب نہ کر دیا۔ مذکورہ طبقہ اصل میں اسلام کے ماتھے پر کلک کا ٹیکہ ہے۔ مسلمانوں کی پسماندگی و درماندگی کا زیادہ تر ذمہ دار یہی طبقہ ہے۔ اس کا سب سے بڑا جرم یہی کہ دین حق سے کوسوں دور ہوتے ہوئے خود کو عین دین دار بلکہ دین کا علمبردار سمجھتا ہے۔ یہودیوں کی طرح یوں جیسے جتنا اپنے نام خاص کرا چکا۔ دین کو مذہب کا روپ دیا تو اسی طبقہ نے۔ مفلو بیت پر قانع اور باطل کا رسیا ہو چکا تو یہی طبقہ۔ احساس نیاں سے عاری، جشن، جو بلیاں اور میلادیں منانا اس کا مرغوب مشغلہ مسلمان دنیا میں لٹ گیا اس کی ہلاکت۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے چند ایسے طریقہ ہائے عبادت بیان کئے کہ جو وقت کے اس موڑ پر مسلمانوں میں رائج ہیں۔ ان کا مختلف النوع ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ ان میں سے کوئی طریقہ بھی ایسا نہیں کہ جو مقصد تخلیق آدم قرار پانے اور انسان کی نجات و فلاح کا باعث بنے کا اہل ہو۔ حقیقتاً یہ تمام طریقہ ہائے عبادت معرض وجود میں آئے تو ہمارے ہاں کی مرکزیت یعنی نظام خلافت کے درہم برہم ہونے سے۔ پوچھنے والا جب کوئی نہ رہا تو جس کا جدھر چاہا منہ اٹھا کر چل نکلا۔ یہ تمام طریقے اسی ضمن میں آتے ہیں جن کا قرآن مجید میں ذکر آیا تو یوں:

"انہوں نے روشن ہدایت پالینے کے بعد محض اس لئے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے

ٹکائے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے" (بقرہ: 213)۔

## اصل مفہوم عبادت:

سورۃ ذاریات کی مذکورہ آیت سے ایک بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کو انسان سے چند گھنٹوں دنوں یا سالوں کی نہیں پوری زندگی کے ہر لحظہ اور ہر لحظے کے ہر حصے کی عبادت مطلوب ہے۔ بالفاظ دیگر ایسی عبادت جو محض مسجد و مصلیٰ تک محدود ہو قابل قبول نہیں۔ کھیت میں، دوکان میں، دفتر میں، کچھری میں، غرضیکہ ہر وقت، ہر جگہ اور ہر حالت میں مطلوب ہے تو بس عبادت۔ یہی مطلب ہے "وخلوئی لاسلم کافہ" کا۔ ایسی عبادت کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ ایک انسان اس طریقہ زندگی میں داخل ہو کہ جس کے متعلق رب کائنات نے فرمایا "میں نے اسلام کو تمہارے لئے بطور دین پسند کیا ہے" (مائتہ: 3)۔ یہ بھی فرمایا کہ "تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو" (آل عمران: 102)۔ نہ صرف یہ کہ تم نہینا، عقیدہ اور عملاً مسلمان ہو بلکہ نام کے بھی "مسلم" ہو۔ "مسلم" کی بجائے خود کو تمہارا یہودی، نصاریٰ، دیوبندی، ملیوی، شیعہ، سنی وغیرہ کہلوانا، انحراف شمار ہوگا۔

دائرہ اسلام میں داخل ہونے کا مرحلہ طے ہونے کے بعد دوسرا مرحلہ زندگی گزارنے کا ہے۔ مسلمان کی زندگی انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ اللہ تعالیٰ کو مسلمان سے انفرادی و اجتماعی دونوں دواڑ کی زندگی میں مطلوب ہے تو بس عبادت۔ پہلے ہم مسلمان کی انفرادی زندگی زیر بحث لاتے ہیں۔ انفرادی سطح پر ہر مسلمان عورت ہو یا مرد کے قبضہ میں تھوڑے ہوں یا بہت، کچھ اٹاٹے ضرور ہوتے ہیں۔ ان اٹاٹوں کو جب ایک مسلمان استعمال کرتا ہے تو ہر استعمال سے نیکی سرزد ہو رہی ہوتی ہے یا بدی، تیسری کوئی چیز نہیں۔ سب سے پہلا اٹاٹہ مسلمان کا اپنا جسم ہے جو ہر امیر و غریب کو میسر ہے۔ جسم چند اعضاء کے مجموعہ کا نام ہے۔ دل، کان، آنکھ، زبان، ہاتھ، پاؤں وغیرہ سب اعضاء ہیں۔ ہر انسان کے ہر عضو کی کارکردگی دو طرح کی ہے۔ ایک کارکردگی تو وہ کہ جو متعلقہ انسان کے بس میں ہوتی ہے اور دوسری وہ کہ جو اس کے بس میں نہیں ہوتی۔ کارکردگی کا بس میں ہونا بھی انسان کا اعزاز ہے یا جن کا۔ دل کا طبعی طور پر کام کرنا متعلقہ انسان کے بس میں نہیں ہونا البتہ چلتے ہوئے دل کو استعمال میں لانا اس کے بس میں ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اگر دل کا چلنا بھی متعلقہ

انسان کے بس میں ہوتا تو وہ کبھی مرا پسند نہ کرتا۔ اس طرح ایک دھریے کے دل کا چلنا بھی چونکا دھریے کے نہیں اللہ تعالیٰ کے حکم کا پابند ہوتا ہے لہذا ایک دھریہ بھی اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی تعریف میں رطب اللسان ہوتا ہے اور اس طرح سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ "کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو" صادق آتا ہے۔

جب بھی جسم کا کوئی عضو بھٹل باتھپاؤں، کان، زبان وغیرہ حرکت کرتا ہے یا استعمال میں لایا جاتا ہے تو نیکی کا ارتکاب ہو رہا ہوتا ہے یا برائی کا تیسری کوئی چیز نہیں۔ اسی طرح ایک مسلمان جب اپنے دوسرے امثالے بھٹل زر زمین وغیرہ استعمال میں لاتا ہے تو ہر استعمال ثواب کا موجب ہوتا ہے یا گناہ کا تیسرا کوئی متبادل نہیں۔ ایسا کوئی استعمال کہ جو نہ ثواب پر منتج ہو نہ گناہ پر ظاہر ہے غیر مؤثر تصور ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ میں نے انسان کو محض اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے یہ مفہوم رکھتا ہے کہ پہلے تو انسان مسلمان ہوا اور مسلمان ہوتے ہوئے اپنے جسم کے ہر عضو اور دیگر اٹاؤں کے ہر استعمال کو نیکی کے لئے بروئے کار لائے بدی کے لئے کبھی نہیں۔ یہ نیکی کیلئے استعمال کرنا اور پوری زندگی ایسی روش اختیار کئے رہنا ہی وہ عبادت ہے کہ جو مقصد تخلیق آدم ہے۔

یہاں پر ایک فطری سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے پتہ چلے کہ نیکی کوئی ہے اور بدی کوئی؟ ایک انسان مثال کے طور پر ارتقا حاصل کو نیکی سمجھتا ہے جب کہ دوسرا بدی بالفاظ دیگر کوئی ایسا ازلی وابدی معیار ہونا چاہیے کہ جو تمیز نیکی و بدی کو ہمیشہ کے لئے طے کر دے۔ پوری انسانی تاریخ پر یہ کام مسلسل بحث انبیاء اور تنزیل صحائف سے لیا گیا ہے۔ کسی انسان کی صوابدید پر یہ اہم کام چھوڑا ہی نہیں گیا، اللہ تعالیٰ کے پلان کے مطابق قبل از قیامت موجودہ دور میں قرآن و سنت ہی معیار نیکی و بدی ہے۔ بالفاظ دیگر جب بھی ایک مسلمان کی آنکھ نیکی کر رہی ہوتی ہے تو متوازن قرآن و سنت کے کسی حکم کی پیروی بھی کر رہی ہوتی ہے اور اسی طرح جب وہ بدی کی مرتکب ہو رہی ہوتی ہے تو متوازن قرآن و سنت کے کسی حکم کی مخالفت بھی کر رہی ہوتی ہے۔ بنا بریں عبادت کا مفہوم یہ ٹھہرا کہ ایک مسلمان اپنے اٹاؤں کو ہمیشہ قرآن و سنت کی پیروی میں استعمال کرے مخالفت میں کبھی نہیں۔ پھر جب ایک مسلمان کا اٹھنا بیٹھنا، اوزھنا بچھونا، کھانا پینا، دوتی کرنا، دشمنی کرنا، جنگ کرنا، صلح

کہا غرضیکہ ہر ہر کام قرآن و سنت کے مطابق ہو جاتا ہے تو حقیقت کا اعتبار سے وہ چلتا پھرتا قرآن بن جاتا ہے۔ بقولِ قابل

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن

قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

یہ تو ہم نے ایک مسلمان کے ہاتھوں کے استعمال کا ذکر کیا لیکن اس کا ہر ہر کام خواہ وہ کاشکاری کے متعلق ہو یا تجارت کے، طب کے متعلق ہو یا عدالت وغیرہ کے اسی طرح ثواب کا موجب ہوتا ہے یا گناہ کا تیسرا کچھ نہیں۔ مثال کے طور پر ایک حج تین سال ساعہ کے بعد ایک مقدمے کا فیصلہ کرنا ہے۔ وہ خود موقع پر موجود نہیں ہوتا لہذا اسے گواہوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ حج خلوص نیت سے بھی فیصلہ کرے تو امکان ہوتا ہے کہ فیصلہ صحیح ہو جائے یا غلط۔ بنا بریں شریعت کی رو سے اگر فیصلہ صحیح ہو جائے تو تین سال کا عرصہ عبادت گزرا جاتا ہے اور دیر سے ثواب کا مستحق۔ فیصلہ اگر غلط ہو جائے تب بھی چونکہ فیصلہ خلوص نیت پر مبنی ہوتا ہے لہذا اکہرے ثواب کا موجب بنتا ہے۔ تاہم وہی حج اگر فیصلہ میرٹ کی بجائے کسی دباؤ یا لالچ میں آکر کرنا ہے تو تین سال کے وقت کا وہ حصہ جو وہ اس مقدمے پر صرف کرتا ہے اس کے سارے اعمال میں بطور گناہ لکھ لیا جاتا ہے۔ ہر ہر کام کی حیثیت یہی ہے خواہ وہ کھیت میں کیا جائے، دکان میں کیا جائے یا کسی دفتر وغیرہ میں۔ عبادت کے مقصد تھیں آدمی نے کام طلب یہی ہے کہ وہ ثواب کا باعث ہو گناہ کا کبھی نہیں۔

جہاں تک اجتماعی دائرہ کار کا تعلق ہے تو یہ دائرہ مزید دو طرح کے کاموں پر مشتمل ہے۔ ایک تو وہ اجتماعی کام ہیں جو مکمل یا معاشرے کی سطح کے ہیں جیسے امورِ رفاہ عامہ یا نماز کا اجتماع پر حنا وغیرہ۔ دوسرے وہ اجتماعی کام ہیں جو امت کی سطح پر کئے جانے مطلوب ہیں بلکہ امت مسلمہ کے فرائض منہی ہیں۔ دونوں طرح کے مذکورہ کام خواہ وہ معاشرتی سطح کے ہوں یا امتی سطح کے اسی طرح نیکی یا بدی قرار پاتے ہیں جیسے کہ انفرادی سطح کے کام اس بنیاد پر کیا و قرآن و سنت کی پیروی میں ہیں یا نہیں۔ البتہ خلافت کے حوالے سے ہم یہاں وہ کام زیر بحث لاتے ہیں جو امت کی سطح کے ہیں۔ قرآن و سنت کی رو سے بشمول اور کئی کاموں کے تین بڑے بڑے فرائض منہی ہیں کہ جو امت کی سطح پر کئے جانے درکار ہیں۔ یہ تین فرائض منہی ہیں فریضہ شہادت علی

انسان یعنی قرآن و سنت کی تعلیمات کو بالخصوص ان انسانوں تک پہنچانا کہ جو غیر مسلم کھرانوں میں پیدا ہو گئے (بقرہ: 143) غرض کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر یعنی اس دنیا کو بگاڑے بچانا اور سنوار کے رکھنا (آل عمران: 110) اور دنیا بھر کی قیادت پر متمکن ہونا یا دوسرے حق کو ادیان باطلہ پر غالب رکھنا (آل عمران: 110 انفال: 39)۔ یہ تین فرائض منہی ظاہر ہے گنتی میں تو چند ہیں لیکن عواقب و نتائج کے اعتبار سے اتنے اہم ہیں کہ وہ نہ ہو پائیں تو انفرادی و معاشرتی سطح کے دین پر کما حقہ عمل ہو ہی نہیں سکتا۔

شومی قسمت ان فرائض منہی کا مسلمانوں نے صدیوں سے ورق پھاڑ رکھا ہے۔ نظام خلافت کے اٹھ جانے سے زیر آسمان دو مہیب منفی تبدیلیاں واقع ہو گئیں۔ ایک تو اولی الامر کا وجود نہ رہا دوسرے امت اقوام..... مصری قوم ایرانی قوم شامی قوم وغیرہ کا روپ دھار گئی اولی الامر میں شامل تو گورنر و راجہ صاحبان افواج اور دوسرے اداروں کے سربراہان اولی الامر و دانش سب ہیں لیکن ان میں مرکزی حیثیت خلیفہ وقت کی ہوتی ہے اور یہاں درجہ خلیفہ کوئی عام حکمران نہیں پوری اسلامی دنیا کا سربراہ ہوتا ہے۔ اولی الامر کی اطاعت کے بغیر اسلام میں اقامت دین اور وجود دین کا کوئی تصور نہیں۔ اس لئے کہ قرآن میں محض "اطیعوا اللہ" ہی نہیں آیا "اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم" بھی آیا ہے۔ ہمارے ساتھ حادثہ یہ ہوا ہے کہ آج من بعد رسالت قرآن و سنت کی شکل میں اسباب اقامت دین تو من و عن موجود ہیں لیکن یہ اسباب اولی الامر کی شکل میں قوت و مافذ نہ ہونے کی وجہ سے دھرے کے دھر رہ گئے ہیں۔ اولی الامر کے بغیر دین فی الحقیقت بے دینی کا روپ اختیار کر گیا ہے۔ دوسرے اسلام کو قائم رکھتے تو ہمیں اس کی برکات بمثل غلبہ دین امن عدل اور خوشحالی حاصل ہوتیں۔ ان برکات کے برعکس آج ہم مفلو بیت و بشت گردی ظلم اور بد حالی سے دوچار ہیں تو اسی لئے کہ دنیا میں آج امت موجود ہے نہ اولی الامر۔ امت کے نہ ہونے سے ہم جماعت سے نکل گئے تو اولی الامر کے نہ ہونے سے اطاعت سے نکل گئے۔ بالفاظ دیگر ہم پھر دور جہالت کی طرف لوٹ گئے نبی رحمت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

"جو اطاعت سے نکل گیا اور جماعت میں نہ رہا پھر ایسے میں مرا تو جہالت کی موت مرا"۔ (مسلم)

ہم آج ذلت و رسوائی سے دو چار ہیں تو کوئی بے پروا نہیں۔

عبادت کا مفہوم جو اوپر بیان ہوا اس قدر مشکل، کٹھن اور صبر آزما ہے کہ اس پر وہی پورا اثر سکتا ہے کہ جس کی مسلسل تربیت اور وقفے وقفے سے یاد دہانی ہوتی رہے۔ نماز روزہ حج، زکوٰۃ اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ان کی اہمیت کے پیش نظر انہیں نہ صرف فرض بلکہ اسلام کے ارکان قرار دیا گیا ہے۔ ان ارکان اسلام کو ادا کئے بغیر دوسرے دواڑ کی نیکیاں اسی طرح بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں کہ جس طرح وہ نماز روزہ قبول نہیں کہ جو مسلمان کو ہر دوسرے دائرہ میں عابد نہ بنائے۔

یہ ذکر نیم شمیٰ یہ مراقبہ یہ سرور  
تری خودی کے تنہا نہیں تو کچھ بھی نہیں

## حرف آخر

انسان سے سرزد ہونے والا ہر کام عبادت ہونا ہے یا بغاوت تیسری کوئی چیز نہیں۔ اللہ رب العزت کا فرمان ہے کہ یہ ہمیشہ عبادت ہو بغاوت کبھی نہیں۔ محض نماز روزہ حج، زکوٰۃ ہی عبادت نہیں ہر چھوٹا بڑا کام کرتے وقت ہمیشہ اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع رکھنا اپنے امانتوں حتیٰ کہ جسم کے اعضاء تک کی ہر حرکت کو قرآن و سنت کا پابند کرنا بھی عبادت ہے۔ جوتی کا تسمہ باندھنے سے لیکر شہادت علی الناس جیسے بین الاقوامی امور عبادت قرار پاتے ہیں بشرطیکہ وہ ایک تو قرآن و سنت کی تعلیمات و احکامات کے مطابق ہوں اور دوسرے اللہ و رسول ﷺ کے دیئے ہوئے طریقہ کے مطابق ہوں۔ پھر سوبات کی یہ ایک بات کہ مذکورہ مفہوم کی عبادت کہ جو مقصد تخلیق آدم قرار پائے ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ وہ نظام دنیا میں رواں دواں نہ ہو کہ جس کا نام ہے..... نظام خلافت۔ بنا بریں قیام و دوام خلافت کی جدوجہد اصل اور حتمی عبادت ہے۔ وہ مسنون زندگی نہیں جو ایسی جدوجہد کے بغیر ہو۔



## خلافت کا نظام معاشرت

کسی بھی معاشرتی نظام کی تشکیل و نوعیت اس دستور و آئین کی مرہون بنتی ہے کہ جس سے متعلقہ معاشرہ معرض وجود میں آتا ہے۔ روسی معاشرہ مختلف سماجی معاشرے سے اس لئے کہ ہر دو کا دستور علیحدہ علیحدہ ہے۔ دستور کی علیحدگی کا اثر اس حد تک کہ دونوں ممالک میں اکثر و بیشتر بنیادی انسانی حقوق مختلف بلکہ بعض صورتوں میں متضاد ہیں۔ مثال کے طور پر امریکہ میں انفرادی حق ملکیت مسلمہ ہے جبکہ روس میں نہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فرد کا حق ملکیت ”انسانی حق“ ہے کہ نہیں؟ اگر کہا جائے کہ ہے تو اس کا مطلب ہے روس غلط کر رہا ہے اور اگر کہا جائے کہ نہیں تو ظاہر ہے امریکہ غلط قرار پاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ثابت ہوا کہ قومی دستور انسانی حقوق کا تحفظ نہیں کر سکتا۔ بنامیں ضرورت محسوس کی گئی کہ کوئی منشور انسانی سطح پر بنایا جائے جو انسانی بنیادی حقوق کی حفاظت کر سکے۔

اس ضرورت کی تکمیل میں عالمی سطح پر اقوام متحدہ کا ادارہ بنایا گیا۔ اقوام متحدہ نے ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو انسانی بنیادی حقوق کے متعلق ایک منشور تیار کیا جو اس وقت ۳۰ دفعات پر مشتمل تھا اور بعد میں اس میں کئی تبدیلیاں کی جاتی رہی ہیں جیسا کیا جانا کسی بھی انسان ساختہ دستاویز کے لئے لازمی ہے۔ انسانی سطح پر تیار کردہ یہ منشور بھی انسان کو اپنی اپنی حکومتوں کی قربانیوں سے نہ بچا سکا اور نہ ایک ملک میں انفرادی ملکیت کا حق مسلمہ اور دوسرے میں ممنوع کا سلسلہ ختم ہو کر عالمی معاشرے میں یکسانیت آ جاتی۔ عالمی سطح پر انسان ساختہ یہ منشور بھی کئی وجوہات کی بنا پر نام کام ٹھہرا۔ ایک تو شروع میں اس کی جینت میں چور دروازہ رکھا گیا۔ بوجہ اس کا ایک ذیلی ادارہ جسے سلامتی کونسل کا نام دیا گیا میں کچھ ممالک کو مستقل رکنیت اور یونپاؤر کا حامل بنایا گیا جب کہ چند دوسرے ارکان غیر مستقل قرار پائے جو باری باری چند سالوں کے لئے رکن بنائے جاتے ہیں۔ یونپاؤر ممالک کو یہ حق دیا گیا کہ دوسرے تمام ممالک خواہ مخفہ کوئی قرار و پاس کریں ان میں سے ہر ایک تن تنہا اس کی دھجیاں اڑا سکتا ہے۔ یوں انسانی بنیادی حقوق کی اول روز سے لٹی کی گئی۔ اقوام متحدہ کے حقوق کا ہی جب

گلابا دیا گیا تو انفرادی انسانی حقوق کا کیا سوال؟

پھر یہ عالمی انسانی منشور بلکہ خود اقوام متحدہ کا ادارہ اس لئے غیر مؤثر ہو گیا کہ اس کی حیثیت ایسی جیسی کہ محض واعظ و داعی کی۔ کوئی ملک اس کے فیصلوں کو نہ مانے تو یہ اتنا بھی نہیں کرنا کہ متعلقہ ملک کی اور نہیں تو کم از کم رکیت ہی معطل کر دے۔ پھر واقعات کی دنیا میں چند عیار ممالک نے اپنے غیر معمولی اثر کی وجہ سے اس عالمی ادارے کو ویسے ہی گھر کی لونڈی بنا رکھا ہے۔ مفاد پرستوں نے جس ملک کو دبا دیا ہو یا نوازا ہو، اقوام متحدہ کے اس ادارے کو بطور لیور استعمال کرتے ہیں۔ بنایا تو تھا انسانی حقوق کا عالمی منشور لیکن بن گیا آخر وہ جیگل کا قانون ”جس کے پاس دانے اس کے کملے بھی سیاتے“۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ قومی دساتیر ہوں یا عالمی انسانی منشور آخر کام کیوں ہوئے ہیں؟ بات دو اور دو چار کی طرح واضح کر اصل میں ان کے بنانے والوں کو قانون سازی کا حق ہی نہیں۔ یاد رہے انسان کیلئے قانون سازی وہ ہستی یا ادارہ کر سکتا ہے جو کم از کم تین صفات کا حامل ہو۔ پہلی صفت یہ کہ وہ غیر جانبدار ہو، اپنے لئے کسی ویٹو پاور وغیرہ کی گنجائش پیدا نہ کرے بلکہ اس کا اپنا کوئی مفاد ہو ہی نہ۔ دوسرے یہ کہ وہ پوری انسانی تاریخ پر ہر لمحہ ہر جگہ موجود ہو۔ کیونکہ قانون ہمیں انسان کے لئے مطلوب ہے لہذا اس کا ہونا اس وقت بھی لازمی ہے کہ جب پہلا انسان اس کرۂ ارض پر وارد ہوا اور اس وقت بھی جب کہ آخری پیدا ہونے والا انسان آخری سانس لے رہا ہوگا۔ اس کی تیسری صفت یہ کہ وہ قدیر ہو۔ اس کے فیصلے کو کوئی مال نہ سکے اور اس کے کام میں کوئی مزاحم نہ ہو۔ وہ قانون شکنی کرنے والے کو سزا اور بھلائی کرنے والے کو صرف اپنی مرضی کے مطابق نواز سکے۔ سب اس کے محتاج ہوں وہ کسی کا محتاج نہ ہو۔ کوئی مجرم ہر دوسری آنکھ سے چھپ جائے تو چھپ جائے قانون ساز سے نہ چھپ سکے۔ غور فرمائیں بار بار غور فرمائیں زمین و آسمان میں صرف اللہ تعالیٰ کی واحد ہستی ہے جو ان تینوں اوصاف پر بدرجہ اتم پوری اترتی ہے۔ پھر رب کائنات محض ماکم و قانون سازی نہیں ہر شے کا مالک بھی وہی ہے تو خالق و رزاق بھی۔

کوئی بھی مشین بنانے والا محض مشین ہی نہیں بنانا بلکہ مشین کے ساتھ ایک گائیڈ بک بھی بنانا ہے جس میں پوری ہدایات ہوتی ہیں کہ اس مشین کو کیسے استعمال کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی محض انسان کو پیدا ہی

نہیں کیا قدرت کی فیکٹری میں تیار ہونے والی اس مشین کے ساتھ گائیڈ بک یا ضابطہ حیات بھی دیا ہے۔ ہر دور میں جب بھی وہ کسی قوم میں پیغمبر بھیجتا رہا ہے تو ساتھ آسمانی کتابوں کی شکل میں انسانی منشور بھی بھیجتا رہا ہے۔ منشور کے ساتھ وہ انسانوں ہی میں سے پیغمبر بھیجتا رہا ہے تو اس لئے کہ وہ منشور کے مطابق ایک زندگی گزار کر نمونہ پیش کر دے تاکہ منشور کو سمجھنے میں غلطی نہ لگے۔ تو رات، زبور، انجیل، قرآن وغیرہ اسی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔ چونکہ تمام ان صحائف کا ماخذ اور سرچشمہ ایک تھا، بالآخر مطلوب و مقصود بھی ایک تھا، لہذا ہر دور میں مازل ہونے والی کتاب سا جہ کتب کی تصدیق و تجدید میں تھی۔ انسانی تاریخ کے ایک مرحلے پر پہنچ کر جب انسانیت ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی اپنے عروج پر پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کی شکل میں پانا آخری مکمل اور حتمی قانون دے کر نہ صرف آسمانی کتابوں کی تزیل کا سلسلہ منقطع فرمایا بلکہ اسے ناقیامت ازلی وابدی قانون کی حیثیت دے کر سلسلہ نبوت کو بھی ختم کر دیا۔ محمد رسول اللہ ﷺ نہ صرف قوی سلح کی بجائے انسانی سلح کے رسول ﷺ ٹھہرے بلکہ انہیں آخری نبی ﷺ ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ اعلان کر دیا گیا:

”اے محمد! کہو کہ اے انسانوں میں تم سب کی طرف اس اللہ کا رسول ہوں جو زمین و آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہی زندگی بخشا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی امی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو ماننا ہے اور پیروی اختیار کرو اس کی امید ہے کہ تم راہ راست پا لو گے“ (اعراف: 158)

اللہ تعالیٰ کے اس آفاقی و سرکاری فرمان میں نہ صرف رسول ﷺ کے مرتبے و مقام کو بیان کیا گیا بلکہ بادشاہ کون و مکان، رب کائنات کی حیثیت و قدرت کا بھی احاطہ کیا گیا تاکہ پتہ چل جائے کہ آنے والے لاکھوں سالوں میں بھیجے والے کون؟ اب تا قیامت چونکہ اللہ و رسول ﷺ کے احکامات یا قرآن و سنت ہی انسانی منشور بنے آئندہ صفحات میں اسی دستور پر مبنی معاشرتی نظام کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔

## اسلام کا معاشرتی نظام

قرآن بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے آدم اور ہوا کو پیدا کیا۔ اسی ایک جوڑے سے پیدا ہونے والے تمام انسان نہ صرف ایک نسل ہیں بلکہ ایک مذمت تک تو وہ ایک ہی نسل تھے۔ ان کا دین ایک تھا

اور وہ ایک ہی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ البتہ وقت کے ساتھ جوں جوں دنیا میں ان کا پھیلاؤ ہوتا گیا ان کا رہن سہن زبان لباس وغیرہ میں فرق آتا گیا۔ یوں ان عشت کنبے قبیلے اور قومیں وجود میں آتی گئیں۔ قرآن میں آیا:

”ابتدا میں پوری انسانیت ایک ہی طریقہ پر تھی (پھر یہ حالت نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ تعالیٰ نے نبی بھیجے جو (راست روی پر) بشارت دینے والے اور (کج روی کے نتائج سے) ڈرانے والے تھے وان کے ساتھ کتاب برحق مازل کی تا کہ حق کے بارے میں جو اختلافات رونما ہو گئے ان کا فیصلہ کریں“ (بقرہ: 213)

تاریخ بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وقتاً فوقتاً مازل ہونے والی ان ہدایات و احکامات اور مبعوث ہونے والے انبیاء کو انسانوں کی پوری آبادی نے کبھی نہ مانا، کچھ نے مانا اور مسلم یعنی ماننے والے قرار پائے اور کچھ نے نہ مانا اور کافریاں نکال کرنے والے گردانے گئے۔ یہی دو قومی نظریہ ہے۔ قرآن یہ بھی خبر دیتا ہے کہ نہ ماننے والے ماننے والوں سے ہمیشہ زیادہ یعنی اکثریت میں رہے۔ یہ دونوں گروہ فکری اور نظریاتی اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ پھر ایسا نہیں کہ تمام کے تمام مسلمان کسی ایک ملک میں رہتے ہوں اور تمام کے تمام غیر مسلم کسی دوسرے ملک میں۔ ایسے ممالک تو ہیں کہ جہاں مسلمان یا غیر مسلمان اکثریت میں ہیں البتہ ہیں مسلم بھی دنیا کے کم و بیش ہر ملک میں اور غیر مسلم بھی۔ چونکہ مسلمانوں کی تقسیم نظریے اور ایک فکر پر ہے لہذا مسلمان خواہ کہیں بھی ہوں وہ ایک امت یعنی امت مسلمہ کا حصہ ہیں۔ ایک ماں کے دو بچے مختلف گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں اگر ان کا عقیدہ مختلف ہے۔ اسلام کی رو سے نظریاتی بھائی، خونی بھائی سے یکسر مختلف ہیں۔ خونی بھائی مخالفین قرار پاتے ہیں اگر ان کا نظریہ مختلف ہے اور انسانی بھائی دلی دوست قرار پاتے ہیں اگر ان کا عقیدہ ایک ہے۔ یہی اسلامی انوٹ ہے۔ قرآن میں آیا ”انما المؤمنون اخوة“ کہ مومن (ایک عقیدہ رکھنے والے) آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ان کا اللہ ایک رسول ﷺ ایک کتاب ایک کعبہ ایک رب قبلہ ایک رہن سہن ایک طرز عبادت ایک۔ تاہم اپنے وجود و مقصد وجود کے اعتبار سے یہ تین معاشرتی یونٹوں یعنی خاندان، معاشرہ اور بالآخر امت مسلمہ میں منقسم ہیں۔ ان تین عنوانات کے تحت ہی ہم خلافت کے نظام

معاشرت کو زیر بحث لاتے ہیں۔

## خاندان کی سطح پر

ہر طرز زندگی کے تین بڑے بڑے شعبہ جات ہوتے ہیں: سیاسی، معاشی اور معاشرتی۔ اسلام میں ہر شعبہ زندگی کے بنیادی اصول تو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے قرآن و سنت میں طے کر دیئے گئے ہیں البتہ تفصیلات میں اتنی گنجائش رکھی گئی ہے کہ تمدن کے ارتقاء و ترقی کے ساتھ ساتھ بدلتی جاسکتی ہیں۔ ایسی تفصیلات قرآن و سنت کی ہدایات کے اندر رہ کر اسلامی شوریٰ نے طے کرنا ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ تو قرآن مجید میں طے کر دیا گیا کہ اولی الامر مسلمانوں میں سے ہوں (نساء: ۵۹)۔ اس میں تو تبدیلی کا ناقص کسی کو کوئی اختیار نہیں۔ البتہ یہ امر کہ اسلامی مملکت میں کسی بھی مرتلے پر مثلاً کتنے گورنر ہوں شوریٰ کے اختیار میں دے دیا گیا کہ وہ ان کی تعداد حسب ضرورت کم و بیش کر لے۔ خاندانی نظام چونکہ ہمیشہ کیلئے خاوند بیوی، اولاد اور چند دیگر لواحقین پر مشتمل ہوتا ہے لہذا اس بارے میں اکثر و بیشتر تفصیلات بھی خود قرآن و سنت میں بیان کر دی گئیں۔ البتہ سیاسی و اقتصادی امور کی ضرورتوں میں چونکہ وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیوں کا زیادہ امکان ہے لہذا ان کے متعلق تفصیلات کا زیادہ تر فیصلہ شوریٰ کی صوابد پر چھوڑ دیا گیا۔

خاندان کی سطح پر معاشرت کو نظام خلافت مستحکم و خوشگوار بنانا ہے تو تین بنیادی امور کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے طے کر کے۔ یہ بنیادی امور ہیں حفظ مراتب کا مستقلاً طے کرنا وراثت میں مرد و زن دونوں کو حصہ دار بنانا اور پردے کو لازم قرار دینا۔ ہم ان تینوں پر نہایت اختصار کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں۔

## حفظ مراتب کا مستقلاً طے کرنا

حفظ مراتب اگر طے نہ ہوں تو یہ اکیلی وجہ خاندان کی بربادی اور عدم استحکام کے لئے کافی ہے دوسری کوئی کوشش نہیں کرنا پڑتی۔ اسلام میں میاں بیوی، اولاد و والدین وغیرہ کے حقوق و فرائض کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے طے کر دیا گیا ہے۔ کسی کی صوابد پر نہیں چھوڑا کہ وہ اپنی حیثیت خود منوانا پھرے۔ یہ حیثیت کا منوانا ہی دراصل فساد کی جڑ ہے۔ اس بارے میں جو سب سے پہلے عظیم فیصلہ کیا گیا ہے تو وہ یہ کہ خاوند کو خاندانی نظام کا

مگر ان وسر برا قرار دیا گیا ہے۔ قرآن میں آیا:

”مرد عورتوں پر قوام ہیں اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں“ (نساء: 34)

ایک اور جگہ پر مزید توضیح فرمائی:

”عورتوں کیلئے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے اور سب پر اللہ غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا موجود ہے“ (بقرہ: 228)

اصل میں عورت کے تین نمایاں روپ ہیں۔ بطور انسان مرد و زن میں قطعاً کوئی فرق نہیں یعنی ایسا نہیں کہ کوئی نیکی اگر مرد کرے تو اسے زیادہ ثواب ملے گا اور اگر عورت کرے تو اسے کم یا قائل اگر مرد کو قتل کرے تو اس کی سزا اور ہو اور عورت کو قتل کرے تو سزا اور۔ دوسرا درجہ بطور عورت یا مرد ہونے کا ہے۔ اس میں دونوں برابر نہیں اس لئے کہ مرد کا جسم عورت والے کام نہیں کر سکتا اور عورت کا جسم مرد والے کام نہیں کر سکتا۔ البتہ امتیاز ساخت کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں۔ کوئی ایک نہ ہو تو انسانی کاروبار نہیں چل سکتا۔ تیسرا درجہ بطور میاں بیوی ہونے کا ہے۔ اس لحاظ سے مرد کو عورت پر فضیلت حاصل ہے۔ یاد رہے کسی بھی انتظامی یونٹ کے استحکام و بہتر کارکردگی کیلئے ضروری ہے کہ اس کا سربراہ ایک ہو۔ یکساں حقوق و اختیارات والے اگر دو یا زیادہ سربراہان ہوں گے تو ادارہ چند دن تو کیا چند گھنٹے بھی چل نہیں پائے گا۔ بالفاظ دیگر مرد اور عورت میں سے کسی ایک کا خاندانی نظام میں مگر ان وسر براہ ہونا لازمی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ داری مرد پر ڈالی اور مذکورہ آیت (نساء: 34) میں اس کی ایک وجہ تو وہی بتلائی کہ ایک کو دوسرے پر بہر حال فضیلت دینا گزیر تھا دوسری وجہ یہ بتائی کہ مرد عورتوں پر خرچ کرتے ہیں۔ یعنی عورت کو خاندانی نظام میں اگر مرد کے تحت کر دیا تو اس کی بتانی اس طور کی کہ اسے عورت کے مان و نفقہ کا ذمہ دار قرار دیا۔ عورت خواہ خود کروڑوں کی مالک ہو اور مرد خواہ بھوکا کنال ہو بیوی بچوں کے اخراجات بہر حال پورے کرنا خاوند کی ذمہ داری ہے۔

پھر میاں بیوی کے باہمی برتاؤ پر چونکہ ان کے درمیان خوشگوار تعلقات کا دار و مدار ہے لہذا ان میں

سے ہر ایک کے حقوق و فرائض کی نہ صرف تخصیص کر دی بلکہ ناکید بھی کی اور ان کی ادائیگی کیلئے یہ کہنا ضروری سمجھا گیا کہ ”عورتوں کیلئے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں۔“ کس حسن اور خوبی سے یہ حقوق و فرائض ادا کرنے چاہئیں مردوں کو عورتوں کے حقوق میں مساقت کرنے کا اشارہ دے کر اس کا بھی اہتمام کر دیا۔ پھر ایک دوسرے سے بہتر سلوک کرنے کی ناکید کی تو اس طرح بھی کہ اچھے خاوند کے اوصاف بیان کرتے ہوئے نبی کا نکات علیہ السلام نے فرمایا:

”تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل و عیال سے بہتر سلوک کرے“

بیوی کی اچھائیاں بیان کیں تو اس طرح کہ:

”بہتر بیوی وہ ہے جو اپنے شوہر کو خوش کرے جبکہ وہ اس کی طرف دیکھے اطاعت کرے جب وہ اسے حکم دے اور اپنے اور اپنے مال کے بارے میں کوئی ایسا رویہ نہ اختیار کرے جو شوہر کو پسند ہو۔“ (نسائی)

بیوی کو اطاعت کی ناکید کی تو اس حد تک کہ وہ ایسی فعل عبادت نہ کرے جس میں شوہر کی رضا شامل نہ ہو۔

اسل میں کسی بھی معاشرے کی فلاح و بہبود اور پرسکون کارکردگی میاں بیوی کے باہمی تعلقات کی خوشگوار یا ناخوشگوار سے منسلک ہے۔ ان خوشگوار یا ناخوشگوار تعلقات کے اثرات گھر کی چار دیواری تک محدود نہیں رہتے بلکہ معاشروں اور قوموں کے عروج و زوال کا دار و مدار انہی تعلقات کی بنیاد پر ہے۔ بنا بریں نظام خلافت ہر وہ جتن کرتا ہے کہ جس سے میاں بیوی کے باہمی تعلقات خوشگوار رہیں۔ شادی سے عین پہلے لڑکے اور لڑکی دونوں کو کھلی اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنے ہونے والی بیوی اور ہونے والے شوہر کا انتخاب خود کرے۔ انتخاب کرنے میں رشتہ داروں بالخصوص والدین سے مدد لینے کو تو پسند فرمایا لیکن انتخاب کا کلی اختیار لڑکی اور لڑکے کے ہاتھ میں دیا۔ پھر شادی کے بعد میاں بیوی کے باہمی رشتے کو مضبوط بنانے کیلئے اولاد کا وجود چوتھا کلیدی حیثیت رکھتا ہے لہذا ”اجازت نہیں دی کہ اولاد پیدا نہ ہونے دی جائے۔ قرآن میں آیا:

”تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں۔ تمہیں اختیار ہے جس طرح چاہو اپنی بھتیجی میں جاؤ مگر اپنے مستقبل کی فکر کرو اور اللہ کی ماماری سے بچو۔ خوب جان لو کہ تمہیں ایک دن اس سے ملنا ہے۔“ (بقرہ: 223)

اس آئیہ مبارک میں بھتی کی مثال دی تو اس لئے کہ کوئی بھی کسان بھتی میں اس لئے محنت کرتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ پیداوار ہو۔ پھر ”اپنے مستقبل کا واسطہ دے کر“ اور اللہ پاک سے ملاقات کا ذرا وا دیکر ہر طرح کی ہیرا پھیری سے روک دیا۔ اہل و عیال کے بے جا مطالبات کو پورا کرنے کی ہوس میں چونکا۔ آدمی کے بے جا ذرائع میں الجھنے اور اس طرح معاشرے کو پراگندہ کرنے کا خطرہ تھا لہذا یہ کہہ کر کہ تمہاری اولاد اور تمہارے مال فقیر کی مثل بھی اختیار کر سکتے ہیں اس فقرے سے بچنے کی تاکید کی۔ اصل میں آدمی کے لئے عورت اور دولت دونوں وجہ افتخار و وقار بھی ہیں تو دونوں کا غیر متوازن و غیر صالح کردار لازمی طور پر فقر و فساد پر منتج ہوتا ہے۔ تاہم جب اولاد کو فقیر کر دیا تو اس فقرے سے بچتے ہوئے ایسا بھی پسند نہ کیا کہ صاحب خانہ اور دیگر اہل خانہ میں کسی طور نفرت پیدا ہو۔ فرمایا:

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں ان سے ہوشیار رہو۔ اور اگر تم غصہ و درگزر سے کام لو اور معاف کرو تو اللہ غفور رحیم ہے۔“ (تغابن: 14)

انسانی طبائع میں چونکا۔ بہت بڑا فرق واقع ہوا ہے لہذا خواہش رکھنے والوں کو دو تین بلکہ چار تک بیک وقت شادیاں کرنے کی اجازت دے دی۔ وہ جو اپنی قوم سے باہر شادی کرنے کی آرزو رکھیں، اہل کتاب کی عورتوں سے انہیں بھی شادی کی اجازت دی۔ مقصد بہر حال یہی کہ معاشرتی نظام میں فقر و فساد کے ہر سوراخ کو بند کر دیا جائے۔

ان تمام ترکیبوں اور تدبیروں کے علی الرغم امکان تھا کہ میاں بیوی کے درمیان مچا کی ہو جائے اور وہ ساتھ نہ نباہ سکے لہذا نہایت مایہ ناز تدبیر سے ہی کبھی طلاق کی بہر حال گنجائش رکھ دی۔ طلاق کی نوبت آنے تک بہر حال اتنی ترغیبات اور انتظامات کو بروئے کار لایا گیا کہ جس سے کسی نہ کسی طور طلاق کا واقعہ ہوا مل جائے۔ طلاق کے بعد عدت گزار کر دنیا کے عام رواج کے برعکس عورت کو دوبارہ سہہ بارہ وغیرہ شادی کی اجازت دی۔ طلاق کی مصلحت بھی یہی کہ دونوں سلگتی ہوئی زندگی نہ گذاریں اور عورت کو دوبارہ شادی کی اجازت دی تو اس لئے کہ کوئی ایک نفس بھی غیر فطری و غیر حقیقی زندگی گزارنے پر مجبور نہ ہو۔

میاں بیوی کے تعلقات کو یوں مستحکم و خوشگوار بنا کر اسلام درجہ درجہ دوسرے رشتہ داروں کے حقوق



وفرائض طے کرتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ والدین کو سرفہرست رکھتا ہے اور اس کے بعد اولاد اور دوسرے قریب و دور کے تمام رشتہ دار۔ پھر اسے پڑوسیوں کی فہرست بھی دامن گیر ہوتی ہے۔ کمزور طبقات مثلاً یتیموں، خادموں، فقراء، مساکین، یتیموں، قیدیوں، مسافروں، غیر مسلم شہریوں حتیٰ کہ حیوانات تک کے حقوق کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے طے کر دیا گیا ہے۔ قرآن و سنت کے صفحات بھرے پڑے ہیں ان تمام کے حقوق وفرائض سے قہذا انہیں یہاں دہرانے کی ہم ضرورت نہیں سمجھتے۔ تاہم اندازہ کریں اسلام کے دینے ہوئے اس نظام زندگی کا کہ جسے اس بچے کے حقوق وراثت کی بھی فہرست ہوتی ہے جو ابھی ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے۔

وراثت میں مرد و زن دونوں کا شامل کرنا قرآن میں آیا:

”مردوں کے لئے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کیلئے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو۔ تھوڑا ہو یا بہت“ حصہ ہے مقرر کیا ہوا“ (نساء: ۷)

چند حروف پر مبنی اس آیہ مبارکہ نے انسانی تاریخ کے دھارے کو بدل کر رکھ دیا۔ انسانیت کی نصف آبادی پر مشتمل صنفِ مذکر جو کبھی خود ماثول کا حصہ تھی، وارث قرار پائی۔ اس اکیلے انقلابی قدم نے یک قلم عورت کی کاپیٹ دی۔ اس لئے نہیں کہ وہاں حیثیت ہو گئی اس لئے بھی نہیں کہ وہ مشکل وقت میں اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل ہو گئی، بلکہ اس لئے بھی کہ اس کی کائنات اور متاعِ حیات یعنی عفت و عصمت محفوظ ہو گئی۔ جس طرح وضو کے بغیر نماز نہیں ہوتی، کار وراثت چل نہیں سکتا جب تک کہ دو اور دو چار کی طرح طے نہ ہو کہ فلاں بچہ فلاں مرد سے ہے۔ وراثت کے متعلق پھر کوئی چیز مبہم نہیں رہنے دی، خود قرآن میں حقوق وفرائض کو مد نظر رکھتے ہوئے ہر رشتہ دار کے حصے مقرر کر دیئے۔ اس بارے میں نظامِ خلافت کی باریک بینی کا اس سے اندازہ لگائیں کہ فرمایا جب وراثت تقسیم ہو رہی ہو اور ایسے میں کوئی فقیر و مسکین آدمی ملے تو اسے بھی کچھ نہ کچھ دے دیا کرو۔

## پردے کا لازم قرار دینا

اس بارے میں بھی مفصل ہدایات و احکامات خود قرآن مجید میں موجود ہیں۔ ایک عظیم برحق اور

بر وقت انقلابی قدم جو اٹھایا گیا تو یہ کہ بیوی کے دائرہ کار کو گھر کے اندر مخصوص کر دیا اور خاوند کے میدان عمل کو گھر سے باہر۔ اس طور نہ صرف عورت کو اپنی کھوئی ہوئی مملکت یعنی گھر کا حصول ممکن ہو گیا، اس کی چھٹی ہوئی پاور یعنی اولاد بھی دستیاب ہو گئی۔ اسی بارے میں نظام خلافت نے خاندان کو مزید مستحکم و خوشگوار کیا تو محرم اور غیر محرم رشتہ داروں کی تقسیم اور ستر کی تخصیص کر کے۔ پردے کی اہمیت کا اس سے اندازہ لگائیں کہ جن معاشروں نے اسے درخور اعتناء نہ سمجھا نہ صرف انہوں نے عفت و عصمت کو تار کیا، گھر ویران کر بیٹھے۔

## معاشرے کی سطح پر

اسلام جب خاندان کو آخری حدود تک مستحکم و خوشگوار بنا لیتا ہے تو ظاہر ہے متوازن ایک مستحکم و خوشگوار معاشرہ بھی وجود میں آتا ہے۔ کئی اگر رہ جاتی ہے تو صرف اتنی کہ وجود پذیر ہونے والے معاشرے کو کیسے چلایا جائے کہ نہ صرف اس کا استحکام و خوشگوار قائم رہے بلکہ اس میں مزید حسن آئے۔ اس مقصد کیلئے دین حق خلافت کے ادارے کو معرض وجود میں لاتا ہے۔ خلافت ہے تو ایک طرز زندگی یا طرز حکومت (کیونکہ طرز زندگی طرز حکومت ہی کا مرہون بنتا ہے) ہی کا نام لیکن اس کے چار اوصاف ایسے ہیں جو اسے دوسرے نظام بائے حکومت سے تمیز کرتے ہیں۔ خلافت کا پہلا وصف یہ کہ یہ نظام اللہ تعالیٰ کی نمائندگی کا مظہر ہوتا ہے۔ یعنی قوانین و احکامات اللہ تعالیٰ کے اور بیروی و اطاعت بندوں کی۔ بالفاظ دیگر قرآن و سنت انہیں مملکت ہونا ہے کوئی خود ساختہ آئین نہیں۔ دوسرا وصف یہ کہ پوری اسلامی دنیا ایک حکمران (خلیفہ) کی سرکردگی میں ہوتی ہے۔ یا درجہ تو حید صرف الوہیت ہی میں نہیں بلکہ رسالت اور خلافت میں بھی ہے۔ ایک وقت میں مسلمانوں کے دو یا زیادہ حکمران نہیں ہو سکتے۔ چھوٹے سے چھوٹے یونٹ یعنی گھر پر اسلام اگر قوام کا ہوا ضروری سمجھتا ہے تو ظاہر ہے کہ اسلامی مملکت کی سطح پر اس کی ہزار گنا زیادہ ضرورت ہے۔ خلافت کا تیسرا وصف یہ کہ اس مخصوص طرز حکومت کو چلانے والا ہر رکن اولی الامر میں شامل اور قرآنی معیار اہلیت کا حامل ہوتا ہے۔ اولی الامر میں گویا تھے تو گورنر، وزراء، اراکین شوریٰ، جج صاحبان، افواج کے سربراہان وغیرہ سبھی ہیں لیکن ان میں مرکزی کردار خلیفہ وقت کا ہوتا ہے۔ خلیفہ وقت کے بغیر اولی الامر کا اسلام میں کوئی تصور نہیں اور خلیفہ کیلئے مجملہ اور صفات کے پوری اسلامی دنیا کا سربراہ ہونا لازمی ہے۔ پھر یہ اولی الامر کی فرمانبرداری کوئی عام سی

تا بعد ازیں نہیں اسل میں اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت ہے۔ بنا بریں مع وطاعت اس کا لازمی عنصر ہے۔ نظام خلافت کی چوتھی شرط یہ ہے کہ حکومت کا انعقاد بیعت سے ہوتا ہے نہ کہ حکومت کے ذریعے بیعت سے۔ دوسرے خلافت راشدہ منقطع ہوا تو اسی چوتھی شرط کو منہدم کرنے سے۔

خلیفہ وقت کو قرآنی معیار اہلیت اور قرآن و سنت کے دیئے ہوئے طرز انتخاب کے بعد مزید دو شرائط کو پورا کرنا یا دو ذمہ داریوں کو نبھانا ہوتا ہے۔ یہ دو ذمہ داریاں اس قدر اہم ہیں کہ اگر ان سے صرف نظر کی جائے تو اسلامی معاشرہ قطعاً وجود میں نہیں آسکتا۔ خلیفہ وقت کی پہلی ذمہ داری یہ کہ اسے دارالخلافت کی مرکزی مسجد میں اہمیت و خطابت کے فرائض ادا کرنے ہوتے ہیں۔ بنا بریں یہ بھی لازمی ہے کہ کسی بھی مسجد کا امام خلیفہ وقت کا نمائندہ ہوتے ہوئے اپنے زیر اثر علاقہ میں سب سے بڑا افسر ہو دوسرے اہلکار سب اس کے تحت ہوں۔ یہ انتظام کر کے دین حق اسلامی معاشرے کو اس قدر پر امن و پرسکون بنادیتا ہے کہ حکمران ہمہ وقت قابل رسائی ہوتا ہے۔ سونے سے پہلے ہر شکایت کرنے والے کی شکایت کو رفع کر دیا جاتا ہے۔

اسلام خلیفہ وقت پر دوسری پابندی یہ عائد کرتا ہے کہ اس کا معیار زندگی عام شہری کی سطح کا ہو۔ نہ صرف یہ کہ اس کا رہن بہن کھانا پینا وغیرہ عام شہری کی سطح کا ہو بلکہ اسے کوئی امتیازی مراعات حاصل نہ ہوں۔ عام شہری کو باڈی گارڈ وغیرہ میسر نہیں ہوتا تو اسے بھی میسر نہ ہو عام شہری نے بوقت ضرورت عدالت میں حاضر ہونا ہے تو خلیفہ وقت بھی حاضر ہو وغیرہ وغیرہ۔ یہ پابندی صرف خلیفہ وقت کیلئے ہے دوسرے کسی شہری بشمول رباب حل و عقد پر نہیں۔ وہ اپنی جائز آمدنی سے قرآن و سنت کی شرائط کو پورا کرتے ہوئے کروڑ پتی وغیرہ بن سکتے ہیں۔ خلیفہ وقت کو پابند کیا تو اس لئے کہ جب وہ اپنی جائز آمدنی کو بھی من مرضی کے مطابق استعمال میں نہیں لاسکتا تو مملکت میں دوسرا کون ہوگا جو جائز آمدنی کا تحور بھی کرے۔ محض ایک فرد یعنی خلیفہ وقت پر نظام خلافت نے یہ دو گراں بلکہ کڑی پابندیاں یعنی مسجد میں حاضری اور عام شہری کی طرز زندگی کی پیروی عائد تو کیں لیکن ایسے جتن نساں معاشرے کے وجود کو ممکن بنادیا کہ جو ہوتا تو زیر آسمان زمین پر ہی ہے لیکن اس شعر کا اصلی مصداق کہ:

اگر فردوں پر روئے زمین است ہمیں است وہمیں است وہمیں است وہمیں است

یوں عمومی انتظامی پھتری کو اسلام راست رو نہیں بنانا، عوام کو بھی راست روی کا پابند بنانا ہے۔ مقام و مرتبہ اور زمین و زر کو نہیں، تقویٰ کو معیار فضیلت قرار دیتا ہے۔ پھر ہر اس رجحان کو کہ جو رہنے والوں کے باہمی تعلقات و معاملات پر منفی اثرات مرتب کرنے، حرام قرار دیتا ہے۔ سوڈا، شراب، نوشی وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ بہتان تراشی، غیبت، بغض و حسد، بے جا تھمس، عیب جوئی، دشنام طرازی، راز افشائی، اپنے سے کم تر سمجھنا، لعن طعن کرنا، بدگمانی، بد زبانی، بد کلامی بے جا تجسس، عیب جوئی، دشنام طرازی، راز افشائی، پیشہ وارانہ تفوق وغیرہ سب کو نہ صرف مکمل ممنوع قرار دیا بلکہ صلوٰۃ و زکوٰۃ اور حج کو مستحق تربیت گاہیں بنا کر ایک بے مثل معاشرے کے حصول کو ممکن بنا دیا ہے۔ قرآن و سنت کی پیروی کے علاوہ کہاں سے کوئی لائے گا زیر آسمان ایسا معاشرہ؟

## انسانیت کی سطح پر

نظام خلافت کا یہ منفرد پہلو کہ اس کا ہر مسلمان شہری نہ محض اپنے لئے رہتا ہے نہ محض اپنے لئے کماتا ہے۔ ارشاد رسالت ﷺ ہے کہ جو اپنے لئے پسند کر دے دوسروں کے لئے بھی پسند کرے۔ آپ ﷺ کا یہ بھی ارشاد گرامی ہے کہ وہ شخص مومن نہیں جو خود تو پیٹ بھر کر سوئے اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔ ان دونوں احادیث مبارکہ میں مسلم یا غیر مسلم کی تشخیص نہیں۔ ”دوسرا بھائی“ یا ”پڑوسی“ مسلم ہو یا غیر مسلم بہر حال مدد کا مستحق ہے۔ قرآن مجید نے اس پہلو کو مزید نکھارا تو اس طرح کہ نہج مسلمہ کو ”حیرت“ قرار دیتے ہوئے اس کی اس فضیلت کو انسانیت کی خدمت اور فلاح و بہبود سے منسلک کر دیا۔ قرآن میں آیا:

”اب دنیا میں ”حیرت“ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کیلئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو نہدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو“ (آل عمران: 110)

پھر جب نہج مسلمہ کو انسانیت کی ہدایت و اصلاح اور فلاح و بہبود کے لئے مختص کیا تو کئی و فراموش جو پہلے انبیاءؑ کیا کرتے تھے، سلسلہ نبوت ختم کرتے وقت بطور فراموشی امت مسلمہ کے سپرد کر دیئے۔ ہم کم از کم تین ایسے فراموش منسی کا ذکر ذیل میں کرتے ہیں جو عالمی معاشرے پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ کوئی چھوٹے سے چھوٹا باغیچہ بھی اپنے حسن کو برقرار نہیں رکھ سکتا جب تک کہ کوئی مانی اس کی دیکھ

بہال اور قطع و برید نہ کرے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس وسیع و عریض کرۂ ارض جسے زمین کہا جاتا ہے کو کیا سنوار کر رکھنے اور بگاڑ سے بچانے کی ضرورت نہیں؟ جب ضرورت سے انکار ممکن نہیں تو مزید سوال پیدا ہوتا ہے کہ عالمی سطح پر یہ سنوار کر رکھنے اور بگاڑ سے بچانے یا حفاظت و تحفظ قوموں کے درمیان صلح و الفتی، صلح جوئی و دلجوئی، تفریق و ترقی اور فلاح و بہبود کا کام کرے تو کون؟ اللہ تعالیٰ پہلے تو اس اہم کام کے لئے امر بالمعروف و نہی عن المنکر (معرُوف کے حکم اور منکرات سے پرہیز) کی خاص اصطلاح سے متعارف کراتا ہے اور پھر جیسے کہ اوپر آل عمران کی آیت نمبر 110 میں بیان ہوا اس کام کو بطور فرض منہی مسجد مسلمہ کے سپرد کرتا ہے۔ اس کام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ نبی رحمت ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ اگر مسلمان کسی موقع پر یہ کام نہ کرے تو پھر وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعا کریں گے اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول نہیں کرے گا۔ فرمایا:

”اس ذات کی قسم کہ جس کے قبضے میں میری زندگی ہے (اے امت مسلمہ) تم فریضہ ”امر بالمعروف و نہی عن المنکر“ ادا کرتے رہو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایسے عذاب سے دوچار کر دے گا کہ اس سے نجات پانے کیلئے تم اللہ تعالیٰ سے دعا کرو گے لیکن وہ تمہاری دعاؤں کو قبول نہیں کرے گا“ (ترمذی)

انسانوں کی ایک اور اہم ضرورت یہ ہے کہ احکاماتِ الہی یا قرآن و سنت کی تعلیمات بالخصوص ان لوگوں تک کہ جو غیر مسلم کھرانوں میں پیدا ہوئے، پہنچیں تاکہ وہ ان پر عمل کر کے دنیا و آخرت دونوں کو سنوار سکیں۔ پہلے یہ رسالت یعنی پہنچانے کا کام انبیاء و رسل کیا کرتے تھے اب سلسلہ نبوت ختم ہونے پر یہ اہم کام بھی امت مسلمہ کے سپرد بطور فرض منہی مسجد کر دیا گیا۔ قرآن میں آیا:

”اور اسی طرح تو ہم نے تمہیں ”امت وسط“ بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو“ (بقرہ: 143)

چونکہ ”شہادت علی الناس“ کے اس فریضہ کی ادائیگی پر لوگوں کی نجات کا دار و مدار ہے لہذا پیغمبروں کو بھی اللہ تعالیٰ نے یہ کام بطور چیلنج دیا۔ خود رسول ﷺ کو یہ کام سونپا گیا تو اس انداز میں:

”اے پیغمبر! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر مازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا“ (مائیدہ: 67)

اب جب تا قیامت ہر دور کے مسلمانوں پر اپنے ہم عصروں تک پہنچانے کا یہ فرض منہی قرار پایا تو اصل میں ان پر دوہری فتنہ داری ڈالی گئی۔ وہ خود بھی قرآن و سنت کے مطابق زندگیاں گزاریں اور دوسروں تک بھی پہنچائیں۔ خوفناک سزا کے مستحق پائیں گے وہ مسلمان جو اس فرض منہی کو بطریق احسن ادا نہ کر سکیں۔ قرآن میں آیا: ”جو لوگ ہماری مازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں اور آں حالیکہ ہم انہیں سب انسانوں کی رہنمائی کیلئے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں“ یقیناً ان کو اللہ بھی ان پر لعنت کرنا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں“ (بقرہ: 159)

مذکورہ بالا دونوں فرامین منہی یعنی فریضہ ”امر بالمعروف ونہی عن المنکر“ اور فریضہ ”شہادت علی الناس“ سبھی بطریق احسن ادا ہو سکتے ہیں جب کہ دنیا بھر کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ امر بالمعروف میں تو باقاعدہ امر یعنی ”حکم کرنے“ کا لفظ موجود ہے۔ پھر حقیقت ہے کہ یہ دونوں کام مغلوب ہوتے ہوئے ہو ہی نہیں سکتے۔ لہذا اللہ مسلماً کو تیسرا یہ فرض منہی ادا کرنا ہے تو یہی کہ وہ دوسرے حق کو ادا نہ کرے باطلہ پر غالب نہ رکھے۔ فرمایا گیا: ”اے ایمان والو! ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دوسرے حق غالب ہو جائے“ (انفال: 39)

اگر مسلمان یہ فرض منہی نہ کر پائیں تو ایک تو وہ مومن نہیں رہتے اس لئے کہ قرآن میں آیا: ”کہ تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو گے“ (آل عمران: 139) اور دوسرے وہ نصرت و ایازہ دی سے محروم ہو جاتے ہیں اس لئے کہ قرآن میں یوں بھی آیا کہ:

”اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی قوت تم پر غالب آنے والی نہیں اور وہ تمہیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہو“ (آل عمران: 160)

دوسرے حق کو غالب کرنے اور غالب رکھنے کے لئے جہاد و قتال کا بوجھ تو مسلمانوں پر ڈالا گیا گو اس کا اصل فائدہ غیر مسلموں کو پہنچتا ہے۔ اسے ایک مثال سے سمجھیں۔ فرض کیجئے کہ کسی جگہ پانی کا تالاب ہے اور چند فرلانگ کے فاصلے پر کچھ پیا سے جاں باب ہیں۔ تالاب والا چاہتا ہے کہ خود پانی پیاسوں تک پہنچائے لیکن راستے میں جس آدمی کی زمین پڑتی ہے وہ فتنہ کھڑا کر دیتا ہے اور اپنی زمین میں سے تالاب والے کو گزر رکنے

نہیں دیتا۔ اس کا حل کیا یہی نہیں کہ مزاحم ہونے والے کا بھر کس نکال دیا جائے اور اس سے مزاحم ہونے والی طاقت ہی چھین لی جائے؟ اب پیا سے جو جاں بلب ہیں وہ یہ کام نہیں کر سکتے، تالاب والے کو ہی یہ جان جو کھوں کا کام کرنا ہوگا گو فائدہ اس کا اصل میں پیاسوں کو پہنچے گا۔ کس قدر بھول ہے ان لوگوں کی کہ جو اس جہاد و قتال کو دہشت گردی قرار دیتے ہیں جو نہ مالی غنیمت اور کشور کشائی کے لئے کیا جاتا ہے اور نہ کسی کو بزدل مسلمان کرنے کیلئے۔ کیا جاتا ہے تو محض اس لئے کہ کوئی فرسہ بائے ”امر بالمعروف و نہی عن المنکر“ اور ”شہادت علی الناس“ کی ادائیگی میں مزاحم نہ ہو۔ گوان فرانس کی ادائیگی کا اصل فائدہ مسلمانوں سے کہیں زیادہ غیر مسلموں کو پہنچتا ہے۔ ان کی ادائیگی پر ہی ان کی اس دنیا کی فلاح و آخرت کی نجات کا دار و مدار ہے۔ مختصراً یہ کہ خلافت کے نظام معاشرت کا یہ حصہ ہے کہ وہ اغیار کی فلاح و بہبود اور ہدایت و اصلاح کا فرض ادا کرے۔ بالفاظ دیگر مسلمان وہی دوسروں کے لئے پسند کریں جو اپنے لئے کرتے ہیں۔

## حرف آخر

ایک وسیع موضوع کو ہم نے چند صفحات میں سونے کی سر توڑ کوشش کی ہے۔ ہو سکتا ہے ہم اس کا حق ادا نہ کر سکے ہوں۔ مجمل خاک بھی کہ خلافت کا معاشرتی نظام تین سطحی، خاندان کی سطح پر معاشرے کی سطح پر اور انسانیت کی سطح پر۔ خاندانی سطح پر جس حق معاشرت کو مستحکم و خوشگوار بنانا ہے تو حفظ مراتب کو مستحکم و متوازن بنانا ہے تو قرآن و سنت کو انہیں مملکت قرار دے کر پوری اسلامی دنیا کو ایک خلیفہ کی سربراہی میں لاکڑ نظام حکومت، اولی الامر کے ہاتھ میں دے کر اور ”انعتاد حکومت کو بذریعہ بیعت نہ کہ بیعت بذریعہ حکومت“ کے اصول کو اپنا کر۔ عالمی سطح پر معاشرت کو مستحکم و پاکیزہ بنانا ہے تو امر بالمعروف و نہی عن المنکر، شہادت علی الناس اور حصول غلبہ و حسن حق کے فرائض منصبی ادا کر کے۔ زیر آسمان خلافت راشدہ کا دور اپنی پوری آب و تاب سے تو تیس سال رہا لیکن تقریباً گیارہ سو سال اس دھرتی کے مکینوں کو اس کے فوائد و فیوض حاصل ہوتے رہے۔ عرصہ ہوا اس معاشرے کو معدوم ہوئے ہوئے۔ ترس گئے کون و مکاں اس مبارک نظام کے انتظار میں جس کا نام ہے..... نظام خلافت۔

## خلافت کا نظام معیشت

جس طرح آج مسلم دنیا تمدنی، سیاسی، معاشی، غرضیکہ ہر لحاظ سے پارہ پارہ ہے اسی طرح پانچویں صدی عیسوی میں جب رومن امپائر کا نظام زندگی درہم برہم ہوا تو اس وقت کے یورپ کا ہر شعبہ حیات تخریر تھا۔ انتشار و فلتان کا اس دور کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس زمانے کے روماء پورے خطے کو تقسیم و تقسیم کر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر قابض ہو گئے اور یوں وہ نظام معرض وجود میں آ گیا جسے ”جاگیر دارانہ نظام“ کا نام دیا جاتا ہے۔ اس ہمہ گیر تبدیلی نے نہ صرف شعبہ معیشت کو متاثر کیا بلکہ پورے نظام حیات کو نیا رخ دیا۔ بالادستی اثر و رسوخ، عزت و احترام تو قدرتی طور پر جاگیر داروں کا مقدر ٹھہرا۔ سب لوگ خواہ وہ مزارعین تھے یا تجارتی اہل حرفہ وغیرہ یوں جیسے رعیت بن گئے۔ چوتھے سوڑ کی پرستش کے مصداق اہل کیسا نے بھی اسی نظام جاگیر داری سے موافقت پیدا کرنے میں غیبت کجی۔ باہمی ملی بھگت سے جاگیر داری اور کیسا خود تو بظاہر مستحکم ہوتے چلے گئے لیکن عمومی زندگی جمود کا شکار ہو گئی۔ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا کے مترادف قیصریت و پاپائیت کے بندگان ڈھیلے ہوئے تو جاگیر داری نظام نے کیسا کے تھکان سے ترقی و توسیع اور فنی پیش رفت کے تمام دروازے بند کر دیئے۔ اسی دوران یعنی متوازن اسلام کی کرنیں دنیا کے وسیع و عریض خطوں کو منور کر رہی تھیں۔ دونوں تہذیبوں کا کراؤ ایک فطری عمل تھا۔ صلیبی جنگیں اسی سلسلہ کی کڑیاں تھیں۔ سلاوی دنیا کی ترقی و کمال نے اہل یورپ کو بھرپور متاثر کیا حتیٰ کہ یورپی اقوام جاگیر داری و کیسا کے گٹھ جوڑ کو پامال کرتی ہوئی قومی حکومتوں کی طرف بڑھیں۔ یورپ سے غلٹ کے سائے سنا شروع ہوئے۔ چودھویں تا سولہویں صدی کا درمیانی وقفہ بجا طور پر یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا دور کہا جاسکتا ہے۔ اس تبدیلی کا رواج رواں یورپ میں وہ طبقہ تھا جو تاجروں، صنعتکاروں، ساہوکاروں وغیرہ پر مشتمل تھا۔ جاگیر داری و کیسا کے ظلم کو توڑا کوئی آسان نہ تھا خصوصاً جب اسے ہولی رومن امپائر کے طور پر متعارف کرایا گیا تھا۔ جاگیر داروں اور اہل کیسا پر مشتمل قدامت پسندوں، جنہیں بنیاد پرستوں (Fundamentalists) کا نام دیا گیا، نے پھر پور مزارعت کی



لیکن یہ جنگ بالآخر پرانے نظام کی شکست و ریخت اور نوخیز طاقتوں کی کامیابی پر منتهی ہوئی۔

شومنی قسمت اہل یورپ کو جاگیرداروں اور اہل کیسا کے شکنجوں سے نجات تو ملی لیکن صنعتکاروں ساہوکاروں وغیرہ پر مشتمل بورژوا طبقہ نے خود ان کی جگہ لے لی۔ انقلابیوں کو یاد نہ رہا کہ ان کے نیچے ایک اور اصل طبقہ عوام کا بھی ہے جو اس ”مہر لڑم“ کی تحریک سے فوائد حاصل کرنے کا بدرجہ اتم حق رکھتا ہے۔ انٹاریوں صدی میں مشین کی ایجاد نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ بورژوا طبقہ خود غرضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اہل یورپ کو دوسری انتہاء پر لے گیا جسے جدید سرمایہ دارانہ نظام یا مغربی جمہوریت کہا جاتا ہے۔ سیاست پر بھی یہی بورژوا طبقہ حاوی آگیا۔

### مغربی سرمایہ دارانہ نظام

یورپی ممالک اور پھر امریکہ میں معرض وجود میں آنے والا سرمایہ دارانہ نظام کئی لحاظ سے پسندیدہ قرار پایا اس لئے کہ اس میں انسان کے کئی ایک جبلتی تقاضوں کا خیال رکھا گیا تھا۔ نجی ملکیت کا حق (private ownership) ذاتی ارتقاء کے مواقع (personal incentive) آزاد معیشت (free enterprise) جیسے اصول اپنائے گئے۔ آزادی سعی کا حق، آزادی رائے مقابلہ و مسابقت، آجروا جبر کے حقوق کی پاسداری، ریاست کی کم مداخلت جیسے اسباب اس نظام کی ترقی کا موجب بنے۔ اس کا البتہ کیا کیا جائے کہ انسانوں کا خود ساختہ یہ نظام باوجود اپنی اُن گت بھلائیوں کے بے نقص نہ نکلا اور وہی خود غرضی جو پہلے نظاموں کا شعار تھی اس نظام کو بھی ایک اور انتہاء پر لے گئی۔ چند قلابازیاں ملاحظہ ہوں۔ سرمایہ داروں کی بے قید و روز اور مشین کی ایجاد کے نتیجے کے طور پر بے روزگاری کا مسئلہ تاریخ میں پہلی بار وجود میں آیا۔ گھریلو دستکاری اور چھوٹے چھوٹے کاروبار مظلوم ہو کر رہ گئے۔ چھوٹے چھوٹے کاروباروں سے فارغ ہونے والے کارکن اور دیہاتی جب بڑے بڑے صنعتی مرکروں میں کارخانہ داروں کے پاس برائے حصول معاش حاضر ہوئے تو وہ اس پوزیشن میں نہ تھے کہ سودا بازی کرتے۔ انتہائی کم اجرت پر مست لگانے پر توجہ مجبور تھے ہی کارخانہ دار جب چاہتا ایک کارکن کو چلتا کر کے دوسرے کو رکھ لیتا۔ کام تو مزدور سے جانوروں کی طرح لیا جاتا لیکن رہنے اور کھانے پینے کا معیار جانوروں سے بھی نیچے گر گیا۔ پہلے پہل تو یہ

مسائل محض افراد کے لئے تھے لیکن دنیا پر مغربی غلبہ سے چند اقوام نے کارخانہ دار کی جگہ لے لی تو باقی اقوام نے مزدور کی عدم توازن دنیا بھر کا مفقود بن گیا۔ پہلے افراد کے مابین غربت و امارت کی تلخ حائل تھی اب اقوام میں یہ تلخ وسیع سے وسیع تر ہو رہی ہے۔

ایک طرف مشین کی ایجاد نے صنعتی پیداوار میں کئی گنا اضافہ کر دیا اور دوسری طرف صنعتی ممالک کے اندر مزدور کی آمد کم ہونے سے عوام الناس کی اکثریت قوت خرید سے محروم ہو گئی۔ نتیجہ کے طور پر صنعتی ممالک دنیا بھر میں منڈیوں کی تلاش میں سرگرداں چل نکلے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہندوستان پر یلغار اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ تجارتی بالادستی نہ صرف غریب ممالک کے وسائل ہڑپ کر گئی بلکہ بدیر یا سویرے سیاسی بالادستی میں بدل گئی۔ چند صنعتی ممالک نے دنیا کے بیشتر ممالک کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا۔ ایک تیر سے کئی ہزار منڈیاں بھی ہاتھ لگ گئیں تو خام اور معدنیات بھی فراوان لوٹی گئیں۔ یہ جو رونقیں اور معیار زندگی کی بلندی آج مغربی ممالک میں نظر آ رہی ہے سب سروسق ہے یا استحصال سے حاصل کردہ۔ دنیا کی دنیاؤں میں بٹ گئی۔ صنعتی ممالک تو پہلی اور دوسری دنیا کے ممالک جب کہ استحصال زدہ اور کمزور کردہ ممالک تیسری دنیا کے ممالک قرار پائے۔

سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کے بائیس ہاتھ کا کھیل بن گیا کہ جس چیز کی چاہیں منڈی میں بہتات کر دیں اور جس کی چاہیں قلت پیدا کر دیں۔ سرمایہ دار اس پوزیشن میں ہو گیا کہ رسد و مانگ کو کنٹرول کر کے مصنوعی بلکہ من مانی قیمتیں وصول کریں۔ مڈل مین اپنے بینک بیلنس کے سہارے محض ٹیلیفون پر کروڑوں اربوں کمانے لگے بغیر اس کے کہ زیر سود مال کا منہ تک دیکھتے یا اسے مزید کارآمد بنانے میں حصہ نہ لیتے۔ کمزور ممالک کی کرنسیاں صنعتی ممالک کی کرنسیوں سے منسلک ہونے پر مجبور گئیں۔ اب کرنسی کی مار دے کہ صنعتی ممالک غریب ملکوں کی کمزور تے رہتے رہتے ہیں۔ صنعتیں تو بہر حال رواں دواں رکھتی ہیں اور وہ بھی چل سکتی ہیں کہ تیسری دنیا کے ممالک منڈیاں بنے رہیں۔ لہذا تیسری دنیا کے ممالک کی قوت خرید کو سہارا دینے کے لئے قرضوں کا جال بچھا دیا گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بعض ممالک کا سب سے بڑا مسئلہ قرضوں کی ادائیگی ہے۔ کئی ممالک قرضوں اور سود کی ادائیگی کے لئے مزید قرضے لینے پر مجبور ہیں۔ سودی

نظام پوری دنیا کے لئے سوبان روح بن گیا ہے حتیٰ کہ امیر ترین ممالک تملاناٹھے ہیں کہ یہ نظام خود ان کو ریشم کے کپڑے کی طرح ایک دن اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

منڈیوں کی تلاش اور مسابقت کی دوڑ میں سرگرداں صنعتی ممالک ایسا ویسا مال تیار کرنے لگے ہیں کہ جس سے فی آٹم زیادہ سے زیادہ نفع ہو خواہ یہ مال صحت و اخلاق کے لئے کتنا ہی مضر کیوں نہ ہو۔ مارکیٹ میں الیکٹرانکس، سامان قہیش اور ایسی ایسی چیزوں کی بھرمار ہو گئی ہے کہ جن کی سرے سے یا تو ضرورت ہی نہیں ہے یا تو بہت کم۔ مسابقت و مقابلہ تصادم کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ بنا بریں اسلحہ سازی دنیا کی مقبول ترین صنعت بن گئی ہے۔ پورا کرہء ارض شعلہ گولا کی صورت اختیار کر چکا ہے جو کسی وقت بھی انسانیت کو بھسم کر سکتا ہے۔ بھسم ہونے کا سب سے زیادہ ڈر بھی صنعتی ممالک کو ہی ہے غیر صنعتی ممالک کا پہلے ہی انہوں نے خود تیار کیا نچ کر رکھا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام عیاشیانہ کلچر معرض وجود میں لانے کا بڑا سبب ہے۔ فحاشی، بے حیائی، مریانی، برہنگی، آوارگی دنیا کا مقدّر ٹھہرا۔ عورت پجاری چراغ خانہ کی بجائے شمع محفل بن گئی ہے۔ تجارت کا رول باز ذرائع ابلاغ غرضیکہ ہر شعبہ میں اسے اشتہاری روپ دے کر کمائی کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔ چلے جائیں صنعتی ممالک میں، نسلیں تباہ، گھروں پرانے اور سکون مایاب ہو گیا ہے۔ ہر گھر میں آپ کو ملیں گے تو ادھیڑ عمر میں بیوی بچے فرار ہو گئے۔ ہاں، کتوں اور بلیوں کی عید ہو گئی، ہر گھر میں موجود بچن میں بھی ڈرائنگ روم میں بھی اور شوخی قسمت بند روم بلکہ عین بیڈ میں بھی۔

اخلاقی اقدار بے معنی ہو کر رہ گئیں، عدل و انصاف دو ہرے معیار کی بھیجٹ چڑھ گیا۔ جس کی لالچی اس کی بھیجٹ والے ضابطے نے پوری دنیا کو جنگل بنا دیا۔ ایک سو پچاس سے زائد ممالک کوئی قرار دیا پاس کریں، ایک ویٹو پر فخر اڑا دیتا ہے۔ اسرائیل کو پرانے دلیس میں آبلایا تو کس نے؟ جاپانی شہروں پر ایٹم بم برساے تو کس نے؟ عراق پر حملہ آور ہے تو کون؟ چھیننا کا تیار کیا نچ کیا ہے تو کس نے؟ ایران، یلیسا، سوڈان وغیرہ پر پابندیاں عائد کر رکھی ہیں تو کس نے؟ پھر عجیب دیدہ دلیری اور خود دہشت گرد خود امن و سلامتی کے علمبردار بنتے ہیں، دہشت گرد قرار دے رہے ہیں تو انہیں جنہیں خود دہشت گردی کا شکار کر رکھا ہے۔

خود ذبح بھی کرے ہے خود لے لے ثواب الٹا

کبھی بچا رہ مزدوری سرمایہ دارانہ نظام سے ملاں تھا آفتاباں قوم پر آشوبری۔ وہ دوری وہ رنجش اور وہ چٹقلش جو کبھی محض مزدور اور سرمایہ دار کے مابین تھی آج کئی گنا بڑھ کر سرمایہ دار یا قرض دینے والے ممالک اور کمزور یا قرض لینے والے ممالک کے مابین ہے۔ درمیان میں رد عمل کے طور پر انسانوں کا ریل ایک دوسری انتہا یعنی کمیونزم، سوشلزم وغیرہ کی طرف لپکا لیکن یہ علاقہ بھی مرض کا مداوانہ کر سکا۔ آئیے چند سطور کمیونزم کی نذر کریں۔

## کمیونزم

سرمایہ دارانہ نظام کا نعرہ ”آزادی“ رہا ہے تو کمیونزم کا نعرہ ”مساوات“۔ شومنی قسمت آزادی اور مساوات کے الفاظ جتنے پر کشش ہیں تاریخ شاید بے مفاد پرستوں نے اس سے کہیں بڑھ کر ان کے ذریعہ انسانیت کا استحصال کیا ہے۔ دنیا کے چند خطوں میں بے قید معیشت نے سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان وسیع تر علیحدگی حاصل کر دی۔ ایک کے کتے جب ساز و فتنہ میں پلنے لگے اور دوسرے کے اپنے بچے بھوکے مرنے لگے تو دنیا کے کچھ دوسرے ممالک میں عیار لوگوں کو عجیب سوچیں۔ انہوں نے سوچا کہ ملکیت کا حق انفرادی طور پر ہو ہی کیوں؟ کیوں نہ تمام ذرائع پیداوار کو میالنے جائیں اور قوم خود ہر ہر فرد کی بنیادی ضروریات بشمول روٹی، کپڑا، مکان وغیرہ کو بافراط پورا کرے۔ پیٹ بھروٹی ہی ہر بشر کو نہ ملے بلکہ ”ایک جیسی“ ملے۔ بندوں میں یہ غربت اور مارت کا تصور ہو ہی کیوں، مکمل مساوات کا دور دورہ ہو۔ نعرہ بڑھ کر فریب اور پر کشش تھا بالخصوص جب وہ اکثریت کے حق میں جاتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کمیونزم نے دنیا کے وسیع تر خطوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

ظاہر ہے مجرد تفصیلات کا حامل نظام تو ایسے ہی معرض وجود میں نہیں آ سکتا، کچھ نہ کچھ فوائد ہوں تو ہی نیا نظام جڑ پکڑ پاتا ہے۔ قومی و عوامی سطح پر اس نظام کے بھی کئی فوائد سامنے آئے۔ تمام ذرائع پیداوار ایک ہی نظام کے ہاتھ میں مجتمع ہونے سے ان ذرائع کا استعمال بہتر اور منظم انداز میں ہونے لگا۔ پہلے جو منافع تاجر کارخانہ دار اور جاگیردار حاصل کرتے تھے حکومتی خزانے میں آ کر وہ کسی حد تک لوگوں کی فلاح و بہبود پر استعمال ہونے لگا۔ قومی سطح پر تقسیم کار کی بنا پر مطلوبہ تربیت یافتہ افرادی قوت بہتر طور پر میسر اور مستعمل ہونے لگی۔

معدروں، قیموں، بیادوں وغیرہ کی دیکھ بھال بہتر طور پر ہونے لگی۔ مالکانہ جھگڑوں، عدالتی مقدموں اور طبقاتی کشمکشوں میں بھی کمی آئی۔ ان ان گنت فوائد کے علی الرغم کمیونزم بھی بے نقص نہ نکلا اور چند ہی دہائیوں کے زیرِ تجربہ رہنے بعد بالآخر کام ہو گیا۔ انسانوں کے خود ساختہ نظام کا ایسے انجام سے دو چار ہونا لازمی تھا اس لئے کہ سلوگن اور جذبات، حقائق کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ پہلے تو یہ نظام معرضِ وجود میں آیا ہی تو بڑا بھیا تک خونی ڈرامہ رچا کر۔ صدیوں پر محیط چھوٹے چھوٹے مالکان کو کب گوارا تھا کہ کوئی آئے اور انہیں ایک قلم بے دخل کر دے۔ نظام کو معرضِ وجود میں لانا ہی مشکل ثابت نہ ہوا چاہا اس سے بھی مشکل نکلا۔ اخلاقی اقدار کو کچلے بغیر جاہلانہ نظام کو رواں دواں رکھنا ممکن نہ تھا۔ مذہب و اخلاق کے ہر بندگان کو توڑا ہی نہ گیا، خود خدا و مذہب کو دیس سے نکالا دے دیا گیا۔ پھر اشیائے صرف کا سرکاری کنٹرول میں ہو کر پرمٹ، لائسنس، راشن کارڈ وغیرہ سے حاصل ہونے کی صورت نے رشوت، ہد عنوانی، خیانت اور خین کے چلن کو عام کیا۔ مل مین کو فارغ کرنے کے جو دعوے کئے گئے تھے مساوات کے جو نعرے لگائے گئے تھے اور مزدور کو جو ہرز باغ دکھائے گئے سب ہوائی ناز نکلتے۔ بقول شاعر:

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا  
جو چیرا تو اک قطرہ خون نہ تھا

حتیٰ کہ وہ وقت آیا کہ اجتماعی ملکیت سے حاصل ہونے والا منافع عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ ہونے کی بجائے عوام کو دبانے اور اشتراکی نظام کو دوسرے نظاموں سے بچانے کی مد میں خرچ ہونے لگا۔ ایسا نظام کیسے تیار چل سکتا تھا؟ کام ہوا تو بری طرح۔ اس میں کیا شک کہ راشن بندی کا رزق خواہ فراواں بھی ہو خوشگوار نہیں اس لئے کہ اس طرح سے جو پرواز پر بندش لگتی ہے محض جسم کی فربہی اس کا مداوا نہیں کر سکتی۔ سرمایہ دارانہ نظام بھی آخری پچکیوں پر ہے اس لئے کہ وہ بڑی خامی جو کمیونزم میں تھی کہ ایک چھوٹی سی اقلیت نے ایک بڑی اکثریت کو دھور ڈنگر بنا رکھا تھا اب سرمایہ دارانہ نظام کی سرشت میں داخل ہو چکی ہے۔ وہاں حکمران جماعت نے عوام الناس پر جاہلانہ نظام مسلط کر رکھا تھا تو یہاں سرمایہ دارانہ نظام میں چند گنتی کی اقوام نے دنیا بھر کی بیشتر اقوام کو نیو ورلڈ آرڈر اور ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن جیسے چندوں میں جکڑ رکھا ہے۔ ظلم و جبر کسی بھی صورت میں ہونا ہی قائم نہیں رہ سکتا۔

انسانوں نے خواہ مخواہ اپنے آپ کو تجربات کے چکر میں ڈال رکھا ہے۔ ورنہ جیسے کہ ایک فیکٹری کے مالک کو ہی حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی فیکٹری کے پروڈکٹ کے متعلق ہدایت نامہ دے اس طرح فطرت کی فیکٹری میں تیار ہونے والے انسان کے لئے قانون، دستور اور نظام حیات کسی کو دینے کا حق ہے تو صرف خالق ارض و سما۔۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ کو۔ پھر خالق کائنات نے انسان محض تجربات میں الجھنے کے لئے یونہی زمین پر نہیں پھینک دیا۔ اللہ کو پتا تھا کہ انسان کو بھوک لگے گی لہذا پہلے سے ہی گندم کا بندوبست کیا، پتہ تھا اس حقوق کو پیاس لگے گی لہذا پانی کا فکر کیا۔ پتہ تھا اسے کپڑے اور چھت کی ضرورت پڑے گی لہذا مختلف لوازمات کا خاطر خواہ انتظام فرمایا۔ اس طرح رب کائنات کو پتہ تھا کہ انسان کو زندگی گزارنے کے لئے قانون، دستور اور نظام حیات کی ضرورت پڑے گی لہذا انبیاء و رسل کی بعثت اور آسمانی کتب کی ترسیل کا پوری انسانی تاریخ پر سلسلہ رواں دواں کر کے مطلوبہ نظام حیات کو فراہم کئے رکھا ہے۔ انسان کی یہ بد قسمتی ہے کہ یہ بیضا تو بغل میں ہے لیکن وہ ہے کہ موم بتیوں کے چکر میں سرگرداں۔ آئیے ذرا اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نظام معیشت پر بھی روشنی ڈالیں۔

### خلافت کا نظام معیشت

”خاص جہت کیب میں قوم رسول با شعی“ کے مصداق معیشت کے معاملے میں بھی اسلام کی اپروچ اسی طرح منفرد دیکھا اور بے مثال ہے جس طرح کہ اس کا پورا نظام حیات۔ ایک نظام معیشت ہی کا کیا اسلام پوری انسانی زندگی کو منظم و یکسو کرنے کی خاطر سب سے پہلے انسان کی تہذیب و تربیت کرتا ہے اور اسے حیوانی سطح سے اٹھا کر انسانی سطح پر لاتا ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ دنیا بھر کے انسانوں! تمہاری یہ زمین کل نہیں، کائنات کا ایک حصہ ہے۔ پوری دنیا کا ایک ہی خالق ہے۔ خالق ہونے کے معاملے سے اسی ایک کو انسانوں کے لئے قانون سازی اور نگرانی کا حق حاصل ہے۔ ”ان الحکم اللہ“۔ خالق کائنات نے جو پہلا قانون بنایا ہے تو یہ کے اپنی تمام خصوصیات میں سے صرف انسانوں کو (اور کسی حد تک جنوں کو) کچھ صوابدیدی اختیارات و امتیازات اور چند مطلوبہ بالعیس دے کر زمین میں اپنا نمائندہ (خلیفہ) مقرر فرمایا ہے۔ خلیفہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس دھرتی پر کاروبار حیات چلانے کا ذمہ دار تو انسان ہی ہے لیکن یہ نظام اس نے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق اسی کے عطا کردہ قوانین و ضوابط کے مطابق چلانا ہے۔ البتہ ایک مقررہ مدت تک اللہ تعالیٰ ہی کے عطا کردہ

صوابہ یہی اختیارات انسان کو اختیار ہے کہ وہ چاہے تو اللہ تعالیٰ کے قوانین کو بروئے کار لاتے ہوئے اسی کی مرضی کو پورا کرے اور چاہے تو خود ساختہ قوانین بنا کر اپنی مرضی کو بروئے کار لائے۔ پہلی صورت میں چونکہ انسان انہی فطری قوانین کو اپنائے گا جو زمین کے علاوہ باقی کائنات میں بھی رواں دواں ہیں۔ لہذا زمین اور باقی کائنات میں ہم آہنگی ہونے کے باعث کامیاب و کامران ہوگا۔ بصورت دیگر دنیا کا نظام باقی کائنات کے نظام سے چونکہ متصادم ہوگا لہذا دیر یا سیر یا کامی و کامراوی پر منتج ہوگا۔ انسان کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ متصادم روش اختیار کرنے کے بجائے سوافیق راستہ اپنائے۔

## تقویٰ

خالق انسان یعنی اللہ تعالیٰ کا دوسرا قانون یہ ہے کہ انسانی زندگی دو ادوار میں منقسم ہے۔ پہلا دور اس دنیا کی مختصر زندگی پر مشتمل ہے جسے یہ قانون دارالعمل اور دارالامتحان قرار دیتا ہے جب کہ دوسرا دور موت کے بعد شروع ہوتا ہے اور اس کی کوئی انتہا نہیں لامحدود ہے۔ اس دوسرے دور کو دارالجزا کی حیثیت حاصل ہے عمل کا دواں پر کوئی سوال نہیں۔ پہلا دور مختصر ہے لیکن انتہائی اہم ہے اس لئے کہ اس دنیا میں کئے گئے اچھے یا برے اعمال کی بنا پر آخرت میں جزا یا سزا کا مستحق قرار پاتا ہے۔ باغلاظ دیگر انسان اس دنیا میں شر بے بہا نہیں کہ جو چاہے کرنا پھرے پوچھے والا کوئی نہیں۔ بس وہ مر کر یونہی خاک بن کر معدوم ہو جائے گا۔ ایک انتہائی منظم، محکم اور متوازن انتظام کے تحت اس دھرتی پر پیدا ہونے والے ہر فرد کے ہر چھوٹے بڑے عمل کو ایک بڑے رجسٹر میں محفوظ کیا جا رہا ہے جسے اس کی موت پر داخل فتر کر دیا جاتا ہے۔ ایک مقررہ دن جسے قرآن یوم حشر یوم قیامہ وغیرہ سے یاد کرتا ہے اول تا آخر پیدا ہونے والے تمام انسانوں کو اٹھایا جاتا ہے۔ اس یوم حساب کو ہر فرد کا رجسٹر اس کے سامنے رکھا جائے گا تا کہ وہ خود ہی اپنا کچا چنسا پڑھ لے۔ اس دن ہر فرد نہ صرف یہ کہ پڑھ لے گا بلکہ اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ پاؤں وغیرہ کو قوت گویائی عطا کرے گا کہ وہ خود شہادت دیں کہ ان سے کیا کیا کام لئے گئے۔ اس حساب کتاب کی بنا پر اللہ تعالیٰ کا ہر فرد کے بارے میں فیصلہ صادر ہوگا کہ آیا وہ جزا کا مستحق ہے یا سزا کا اسے جنت میں داخلہ ملے گا یا دوزخ میں۔

آخرت کی یہ جواب دہی اور اللہ کے خوف کے ہمہ وقت انسانی حواس پر چھائے رہنے کی یہ صفت

شرعی اصطلاح میں تقویٰ کہلاتی ہے۔ تقویٰ کی اہمیت اتنی کہ شرعی نقطہ نظر سے اعمال آخرت کی کرنسی ہیں تو تقویٰ اس دنیا کی۔ نظام خلافت میں امارت و افضلیت کی بنیاد روپیہ پیسہ کھیتی باڑی مولیٹی، عہدہ وغیرہ نہیں تقویٰ ہے۔ جس قدر کوئی زیادہ متقی اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ زیادہ مکرم و محترم اور مقرب و متمول۔ احساس جواب دی ایسی پولیس چوکی ہے جو اسلام ہر مسلمان کے دل میں مستقل قائم کئے رکھتا ہے۔ انسان کے عین دل میں براہِ جان یہ وہ چوکیدار ہے جو اس وقت بھی جاگ رہا ہوتا ہے جب بیرونی چوکیدار سو جاتے ہیں۔ رات کی تاریکی میں جب دوسرے انضباطی ذرائع قفل ہو جاتے ہیں آخرت میں حساب و کتاب کا خوف بہر حال طاری و ساری رہتا ہے۔ یہ مجبور ہے کہ جس کے گرد ایک مسلمان کی پوری زندگی گھومتی ہے۔ کہاں سے لائیں گے ایسا نسخہ کیسیا، کمیوزم اور کچھ علوم کے علمبردار؟

### حق ملکیت

اللہ رب العزت کائنات کا خالق ہی نہیں مالک بھی ہے۔ یہ زمین جس پر ہم رہ رہے ہیں نہ کسی فرد کی ملکیت ہے نہ جماعت کی۔ نظام سرمایہ داری اور کمیوزم کا دعویٰ حق ملکیت کی بنا پر ہے۔ ایک یہ حق فرد کو دیتا ہے تو دوسرا جماعت یعنی حکومت وقت کو۔ اسلام اکثر و بیشتر قابض تو فرد کو ہی قرار دیتا ہے لیکن یہ قبضہ بطور امانت ہے نہ کہ بطور ملکیت۔ ملکیت اسی طرح صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور ہے جیسے قانون سازی و حکمرانی کا حق۔ قرآن مجید میں ”اولا انکم“ آیا ہے تو ”لہ ملک السموات والارض“ بھی آیا ہے۔ خلافت کا نظام معیشت فرد کے حق قبضہ کو بھی تسلیم کرتا ہے تو ان گنت پابندیوں کے ساتھ۔ حد بندیوں سے مقید انفرادی حق قبضہ یا امانت دارانہ انفرادی حق ملکیت وہ تنگ میل ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کی طرح انفرادی حق ملکیت کو بے قید نہیں ہونے دیتا۔ یہ مرکز کی گڑ ہے جو خلافت کے نظام کو کمیوزم اور مغربی سرمایہ داری نظام کے بین بین معقول سطح پر رکھتا ہے۔ خوبیاں تو دونوں کی سمیتا ہے خرابیاں کسی کی بھی نہیں۔ ہم ان حد بندیوں کو منتظرِ ازیر بحث لاتے ہیں۔

### ۱۔ باطنی اور روحانی حد بندیاں

انسانی نفس بڑا سرکش ہے۔ حرص و ہوس چھپ چھپ کر سینوں میں جاگزیں ہو جاتی ہے۔ حیوانی



ترغیبات اور شیطانی دراندازیاں پر فریب انداز میں انسان کو انتہا پسندی اور خود غرضی میں سرگرداں رکھتی ہیں۔  
 محض قانونی اور طاہری پابندیوں سے انسان کے ان سغلی رجحانات پر قابو پانا ممکن ہے۔ آدمی اندر سے میڑھا  
 ہو تو کوئی بیرونی دباؤ اسے سیدھا نہیں رکھ سکتا۔ اسلام کا یہ اعجاز ہے کہ وہ نہ صرف انسانی ضمیر کو سمجھوتا ہے بلکہ  
 جیسے کہ اوپر ذکر ہوا آخرت میں جوابدہی کا احساس دے کر خود غرضی تو کیا اتنا انسان کو یاد دلاتا کہ جو گناہ بناتا  
 ہے۔ جزا و سزا اور جنت و دوزخ کا نظام ایسی ہمہ وقت لگتی تلوار ہے جو لحظہ بھر انسان کو بے لگام نہیں ہونے  
 دیتی۔ قرآن و سنت بھرے پڑے ہیں ایسی تعلیمات و ترغیبات سے جو ایک مسلمان کو محض مال ہی کی کیا جان  
 تک قربان کرنے کو انسانی پرواز کی سب سے بڑی یا منت قرار دیتی ہیں۔ انفاق فی سبیل اللہ اور قرضِ حسنہ ایسی  
 مدات ہیں جن کی ادائیگی ہی رفق کسی دوسرے نظام معیشت میں نہیں ملتی۔ انفاق کا مطلب ہے خرچ اور فی سبیل  
 اللہ کا مطلب ہے اللہ کی راہ میں۔ ہر وقت قربانی اور ہر وہ کام جو خدمتِ خلق کی مد میں کیا جائے انفاق فی سبیل اللہ  
 قرار پاتا ہے۔ قرآن کی زبان میں اللہ تعالیٰ کے آخری فیصلہ میں کامیاب قرار پانا فوزِ اعظم اور فوزِ الکبیر یعنی  
 ”بڑی کامیابی“ سے موسوم کیا گیا ہے۔ پھر جہاں کہیں قرآن حکیم میں فوزِ اعظم اور فوزِ الکبیر کے الفاظ آئے ہیں  
 ان سے پہلے اکثر و بیشتر انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر آیا ہے۔ حد یہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ اور بندے کے مابین  
 ایسے سودے کا ذکر آتا ہے کہ جس میں بندہ اپنی جان اور اپنا مال اللہ کے سپرد کرتا ہے تو اللہ اس یاد دلاتا کہ جو  
 معاوضے کے طور پر اسے جنت عطا کرتا ہے۔ (توبہ: 11)

یوں اللہ تعالیٰ جو جانیں اور مال وصول کرتا ہے کسی اور کام میں نہیں لگاتا۔ لگاتا ہے تو انسانیت کی  
 فلاح و بہبود اور خدمتِ خلق میں۔ بظاہر تو مال دیا جاتا ہے کسی ضرورت مند کو لیکن قرار پاتا ہے یہ دیا جانا فی سبیل اللہ۔  
 جان دی جا رہی ہوتی ہے کسی بڑی انسانی فلاح کی خاطر لیکن قرار پاتی ہے دی جانی اللہ کی راہ میں۔ قرضِ حسنہ  
 دیا جا رہا ہوتا ہے غریب آسمان کسی حاجت مند کو لیکن اللہ تعالیٰ کا فرمانا ہے کہ یہ قرضِ حسنہ (یعنی ایسا قرض جو بغیر کسی سود  
 غرض یا ایذا رسانی کے ہو) مجھے دیا جا رہا ہوتا ہے۔ فی سبیل اللہ دینے جانے کا کمال یہ کہ گودینے والے کے مال  
 سے کچھ نکل رہا ہوتا ہے لیکن وہ کم ہونے کی بجائے اتنا زیادہ ہوتا ہے۔ یہی فرمایا رب کائنات نے  
 ”جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ

بولیا جائے اور اس سے سات بالیس ٹکلیں اور ہر بال میں سودا نے ہوں۔ اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے  
افزونی عطا کرتا ہے۔ وہ فراخ دست بھی ہے اور عظیم بھی۔“ (بقرہ: 261)

بڑھوتری و افزونی کا یہ پیمانہ تو اس دنیا کی حد تک ہے جہاں تک آخرت کے معاوضہ کا تعلق ہے تو  
قلم اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ قرآن و سنت کے ورق اٹھتے جائیں معاوضہ بے حد و بے کنار۔ باطنی و  
روحانی یہ حد بندیاں اور ترغیبات وہ بنیاد ہے جس پر خلافت کے نظام معیشت کا قصر بلند پایا سطور ہوتا ہے۔  
سوختہ بختی کمیونزم اور مغربی نظام سرمایہ داری جنہوں نے انسانیت کے ایک بڑے حصے کو ایک مدت متاثر کیا  
ہے دونوں اس بنیاد سے ناری ہیں۔

## ۲۔ قانونی و اخلاقی حد بندیاں

روحانی بنیاد فراہم کرنے کے بعد خلافت کا نظام معیشت قانونی و اخلاقی حد بندیوں کا ایک ایسا  
جامع مربوط اور منوثر ہے کہ جو اسے دوسرے نظاموں سے مزید منفرد بناتا ہے۔ ایک طرف کسی فرد  
کے امانت دارانہ حق ملکیت تسلیم کرنے کے علی الرغم اسے سرمایہ کار تو بننے دیتا ہے سرمایہ دار قطعاً نہیں تو دوسری  
طرف اس انفرادی حق قبضہ کو اس طور پر قید و آوارہ نہیں ہونے دیتا کہ جو جماعت اور اجتماعی نظام معیشت کو  
ادنیٰ زک پہنچا سکے۔ ان صفحات میں تفصیلات کی تو گنجائش نہیں بلکہ کے بنیادی اصولوں کا ذکر کرتے ہیں۔

## ☆ اتفاق فی سبیل اللہ

قرآن و سنت کی رو سے اتفاق فی سبیل اللہ کی دو اقسام ہیں۔ ایک فرض اور لازمی جس کا تارک  
گناہگار اور روزِ محشر ماخوذ ہوگا دوسری صوابدیدی اور نقلی یعنی ایسا اتفاق سبیل اللہ کہ جسے کرنے والا تو ثواب کا  
مستحق ہوگا لیکن نہ کرنے والا بہر حال گناہگار نہیں ہوگا۔ اس بارے میں بنیادی اصول جو نہری حروف میں  
لکھے جانے کے قابل ہے یہ ہے کہ اسلام میں ہر آسودہ آدمی صرف اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے ہی نہیں  
کماتا بلکہ ان معذوروں ناداروں اور بے کسوں کے لئے بھی کماتا ہے جو معاشرے میں کسی نہ کسی طور کلی جزوی  
طور پر اس قابل نہ رہے ہوں کہ اپنی معیشت کا خود بندوبست کریں۔ قرآن میں آیا ”اور جن کے مالوں میں

ایک معین حق ہوتا ہے سالکوں اور مرمیوں کا۔“ یعنی سرمائے کی انضیاء سے فقراء کی طرف یہ منتقلی بطور خیرات نہیں بطور حق ہے۔ اسلام پھر سرمائے کی اس فرضی و نقلی منتقلی پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس انداز کی بھی فکر کرتا ہے کہ جس طور پر منتقلی ہو اور اس مقدار کا بھی تعین کرتا ہے کہ جو شخص کرنی مطلوب ہو۔ انداز پر پہلی پابندی تو یہ کہ لینے والے کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔ دوسری پابندی یہ کہ دینے والا نہ تو دکھاوے کی خاطر مال دے اور نہ لینے والے پر کوئی احسان جتلائے (بارہ: 264)۔ تیسری پابندی یہ کہ دینے والا یہ انفاق غلو صیغیت اور محض اللہ کی خوشنودی کے لئے کرے (بقرہ: 265)۔ چوتھی پابندی یہ کہ ان چیزوں کو اللہ کی راہ میں دیا جائے جو کسی کو عزیز تر ہوں (آل عمران: 29) اور پانچویں پابندی یہ کہ انفاق کرنے والا اللہ کی راہ میں بھی اس قدر نہ لگا دے کہ خود تلاش ہو جائے۔ اسلام ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کو کہتا ہے تو خود اپنی ضرورت سے صرف نظر کرنے کی اجازت نہیں دیتا ہاں کوئی ہنگامی صورت حال ہو تو علیحدہ بات ہے۔ انداز کے ان جملہ مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے نظام خلافت ”بیت المال“ اور ”کفالت عامہ“ کی دو خاص اصطلاحات اور ادارے قائم کرتا ہے۔ بیت المال ایک قسم کا کلکی خزانہ ہے جو آج کی دنیا کے خزانوں سے قطعی مختلف ہے کیونکہ اس میں سرمائے کی آمد و شد کے انداز یکسر مختلف ہیں۔ انضیاء نے جو صدقات واجبہ بشمل زکوٰۃ، عشر خراج، جزئیہ، فتنہ، خمس، مضارب، کراء، الارش، عسور و وقف، اموال فاضلہ وغیرہ مستحقین کو منتقل کرنا ہوتے ہیں وہ براہ راست نہیں بیت المال ہی کے ذریعہ تقسیم کرنا ہوتے ہیں۔ بیت المال میں جمع شدہ سرمایہ خلافت وقت نے وظائف کی شکل تقسیم کرنا ہوتا ہے۔ صدقات و فائدہ کو براہ راست بھی مستحقین میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اور بیت المال کے ذریعہ سے بھی۔ اصل میں معیشت ہر فرد کا حق ہے اور یہ حق معیشت اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ یہ حق معیشت از خود قلم دوات لے کر اور بھی کھاتے کھول کر پورا نہیں کرتا۔ لازم قرار دیتا ہے کہ خلافت وقت انضیاء سے فقراء کی طرف سرمائے کی منتقلی کا کام بذریعہ بیت المال کرے۔ باقاعدہ دیگر ہر شخص کی کفالت بذمہ خلافت وقت ہوتی ہے اور یہی کفالت عامہ کا نظام ہے۔ اسلامی ریاست میں اگر کتا بھی بھوکا پیاسا رہے تو اس کی باز پرس خلافت وقت سے ہوگی۔

جہاں تک مدات و مقدار کا تعلق ہے تو اس میں سرفہرست زکوٰۃ ہے جسے اسلام نے اسی طرح ایک

عبادت قرار دیا ہے جس طرح کہ نماز۔ زکوٰۃ ایسے سرمائے پر ادا کرنا فرض ہے جو باون تولے چاندی یا ساڑھے سات تولے سونے کے برابر یا زائد ہو اور اسے پاس پڑے ایک سال گزر جائے۔ اسی طرح مال تجارت مکانوں کے تجارتی کاروبار وغیرہ پر بھی زکوٰۃ واجب الادا ہوتی ہے۔ فصلوں کی پیداوار کا دسواں حصہ بارانی و نہری ہونے کی صورت میں بطور عشر ادا کرنا فرض ہے تو چاہی ہونے کی صورت میں بیسواں حصہ۔ چونکہ زکوٰۃ و عشر کی یہ ادائیگی بطور عبادت ہے لہذا کسی غیر مسلم پر لاگو نہیں ہو سکتی۔ غیر مسلموں کو جو اسلامی ریاست میں بطور اقلیت رہ رہے ہوں مال کی صورت میں جزیہ اور پیداوار کی صورت میں خراج ادا کرنا ہوتا ہے۔ ان ہر دو مقدار کو خلافتِ وقت نے موقع و محل کے مطابق طے کرنا ہوتا ہے حتیٰ کہ بعض صورتوں میں معاف بھی ہو سکتی ہیں۔ مدت جن پر صدقات واجب کی رقم صرف کی جا سکتی ہے وہ بھی مقرر ہیں۔ قرآن میں آیا:

”یہ صدقات فقیروں، مسکینوں اور ان لوگوں کے لئے ہیں جو صدقات کے کام پر مامور ہیں اور ان کے لئے جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہو۔ نیز یہ گروہوں کے چھڑانے اور قرضداروں کی مدد کرنے میں اللہ کی راہ میں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لئے ہیں۔ یہ فریضہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بڑا ہے“ (توبہ: 60)۔

ان فرض و معین صدقات کے علاوہ نظامِ خلافت انبیاء کو صدقاتِ مالا کی ترغیب بھی دیتا ہے۔ ایسے صدقات کی کوئی حد نہیں سوائے اس کے کہ اپنی ضروریات کا بہر حال لحاظ رکھا جائے۔ قرآن میں آیا ”پوچھتے ہیں ہم اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں۔ کہہ دیجئے جو کچھ تمہاری ضرورت سے زائد ہو“ (بقرہ: 219)۔

اسلام کا یہ عجیب انداز ہے کہ فرائض کے علاوہ وہ ایک وسیع دائرہ ایسا چھوڑتا ہے کہ جو فرد کی صوابدید پر ہو۔ بالفاظِ دیگر حسنت کی ترغیب تو دیتا ہے لیکن چھوڑنا فرد پر ہے کہ وہ چاہے تو کرے اور چاہے تو نہ کرے۔ بالآخر معاملہ اس کے اور اس کے رب کے درمیان ہے۔ یہی معاملہ ”ضرورت سے زائد“ کا ہے۔ چونکہ ہر آدمی اپنی ضروریات سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے پھر یہ بھی کہ ضرورت تو محض ذاتی یعنی گھریلو چلانے کے لئے بھی ہو سکتی ہے اور کسی کاروبار کے چلانے کے لئے بھی لہذا ”ضرورت سے زائد“ کا فیصلہ فرد کے ہاتھ میں دے دیا ہے البتہ اس تمبیہ کے ساتھ کہ ”دیکھنا دنیا کا فکر بھی کرنا تو آخرت کا بھی“۔

بعض حالات میں جیسے جنگ، قحط وغیرہ کے موقع پر خلافتِ وقت کو اختیار ہے کہ وہ خوشی صدقاتِ مالقہ نہ کرنے والوں سے ایسے صدقاتِ جبری وصول کرے۔ نیز اسلامی نظام میں گواہی نوبت تو کم ہی آتی ہے لیکن اگر صدقاتِ واجبہ خلافتِ وقت کو جبری بھی وصول کرنا پڑیں تو یہ اس کا حق ہے۔

✽ وراثت: قیصری و کارخانہ لگانے کی صورت میں یا زمین خریدنے اور مکانوں کے کاروبار وغیرہ کی صورت میں بعض اوقات ذاتی ضرورت چونکہ اجتماعی ضرورت کا روپ دھار لیتی ہے لہذا ایسی جمع شدہ جائیداد کو بھی نظامِ خلافت ایک یا چند ہاتھوں میں مجتمع ہونے نہیں دیتا بلکہ وارثوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اسلام کا قانون وراثت بھی منفرد اور جامع ہے۔ وراثت میں محض مردوں ہی کے نہیں عورتوں کے بھی حصے مقرر ہیں۔ پھر یہ حصے اس بنیاد پر کم و بیش ہیں کہ کس نے کس درجہ ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھایا ہے۔ اسلام مان و نفقہ کا بوجھ چونکہ مرد پر ڈالتا ہے اور عورت نے چونکہ والدین اور سسرال دونوں طرف سے وراثت حاصل کرنا ہوتی ہے یعنی مرد نے مان و نفقہ کے اخراجات ادا کرنے ہوتے ہیں تو عورت نے وصول کرنے مرد نے حق مہر ادا کرنا ہوتا ہے تو عورت نے وصول کرنا لہذا اصولی طور پر تقسیم وراثت کے وقت بیٹیوں کا حصہ بیٹوں سے آدھا ہوتا ہے۔ اتفاق فی سبیل اللہ کی مختلف صورتیں ہوں یا قوانین وراثت مقصدان تمام کا ایک منظم و موثر انداز میں مستطاف خلافت کی اس پالیسی کی تکمیل ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے تو اس طرح کہ ”تا کہ مال تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرنا رہے“ (حشر: 7)

شدید ترین عذاب کی وعید دی ہے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو مذکورہ اقدامات سے سرمائے کو سرکولیشن میں رکھنے سے قاصر رہیں۔

✽ محال و حرام: نظامِ خلافت صرف ارتکازِ دولت کو ہی حرام قرار نہیں دیتا، ناجائز ذرائع سے دولت کمانے اور ناجائز راستوں پر خرچ کرنے کو بھی حرام قرار دیتا ہے۔ کمائی کے حرام ذرائع میں سے سود اور جو اسر فہرست ہیں۔ عجیب فلسفہ ہے اسلام کا اس بارے میں بھی۔ جب دوسرے نظام ہائے معیشت داعی ہیں کہ سود سے سرمایہ بڑھتا اور مفت تقسیم کرنے سے کم ہو جاتا ہے، اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ سود سے معیشت تباہ اور فی سبیل اللہ خرچ کرنے سے نشوونما پاتی ہے۔ کچھ محترم اور کمیونزم انفرای اور اجتماعی سطح پر سرمائے کے ایسے ایسے حوض بناتے ہیں

کہ جن میں چھوٹے چھوٹے سرمایوں کا مسلسل اور مستقل بہاؤ رہتا ہے۔ اس کے برعکس سود کو حرام کر کے اور صدقات کو لازم قرار دے کر اسلام بڑے سرمایوں کا اس طور پر چھوٹے سرمایوں کی طرف موڑ دیتا ہے کہ بڑے سرمایوں کا وجود تک برقرار نہیں رہتا۔ پھر اسلام انسانی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر دولت کمانے کے تمام دیگر طریقوں کو بھی حرام قرار دیتا ہے۔ ذخیرہ اندوزی، ملاوٹ، رشوت، بدعنوانی، شراب نوشی حتیٰ کہ جنسی جذبے کا استحصال قطعاً ممنوع ہے۔ فضول خرچی، سہزیر، جھوٹی نمود و نمائش، مبالغے وغیرہ کی کسی طور اجازت نہیں دیتا۔

☆ تجاوزات ممنوع: خلافت کا نظام معیشت اعتدال کی راہ اختیار کرتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی طرح وہ فرد کو ایسی بے لگام آزادی نہیں دیتا کہ جو جماعت اور جماعتی نظام کو درہم برہم کر دے اور نہ کمیزم کی طرح جماعت کو حق دیتا ہے کہ وہ فرد کو محض ایک مشین کا پرزہ بنا کر رکھ دے۔ افراد معاشرہ میں جبری مساوات کو وہ انسانی پرواز کے لئے سم قائل قرار دیتا ہے۔ اسلام مساوات معیشت کی بجائے درجات معیشت کو تسلیم کرتا ہے۔ فرد کی ترقی و بہبود کی اجازت تو دیتا ہے لیکن جماعتی ترقی و بہبود کی قیمت پر نہیں۔ وہ ایسے کاروبار تک کی اجازت نہیں دیتا جو جماعت کے حق میں نہ ہو۔ شراب سازی، فال گیری، کہانت، نجوم، آستانہ پرستی، رہبانیت، ست، آڑھت، جسم فروشی، جومال موجود نہ ہو اس کی خرید و فروخت، مزارعت، مضاربہ وغیرہ کو گندے شیطانی افعال قرار دیتا ہے۔ اسی طرح اسلام جماعتی فلاح و بہبود کی اجازت تو دیتا ہے لیکن فرد کی ترقی و بہبود کی قیمت پر برگز نہیں۔ ایسی قد غنوں کی اجازت نہیں دیتا کہ جو فرد کے فطری ارتقاء یعنی پرواز اور ذاتی دلچسپی کی راہ میں حال ہوں۔ اسلام جب مذہب کے معاملہ میں جبر کا قائل نہیں تو ایسی انفرادی سعی، جدوجہد اور حق انتخاب جو جماعت کے لئے بے ضرر ہو پر قد غنیں کیسے گوارا کر سکتا ہے۔

### ☆ سرمایہ و محنت میں توازن

اسلام پوری امت کو "امت وسط" قرار دیتا ہے یعنی ایسی جماعت جو درمیانی راستہ اختیار کرنے والی اور انتہا پسند نہ ہو۔ دین حق کسی بھی معاملہ میں عدم توازن کا سخت مخالف ہے۔ اس کے نزدیک جس طرح میاں بیوی کے مابین عدم توازن سے معاشرتی و سماجی نظام تباہ ہو جاتا ہے اور جس طرح راغی و رعایا کے مابین عدم توازن سے سیاسی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اسی طرح سرمایہ و محنت کے مابین عدم توازن سے معاشی و

اقتصادی نظام، لہجہ اور جگہ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اعتدال و توازن نظام خلافت کی سرشت میں شامل ہے۔ اس کی پہلی کڑی یہ ہے کہ خلیفہ وقت ایک تو اوسط شہری کے معیار زندگی کو اپنائے اور دوسرے وہ دارا خلافت کی مرکزی مسجد میں امامت و خطابت کے فرائض ادا کرے۔ کہنے کو یہ دونوں کام عام سے معلوم ہوتے ہیں لیکن اتنے دور رس نتائج کے حامل ہیں کہ نظام خلافت کو دوسرے نظام بائے زندگی سے ممتاز کرنے میں کلیدی حیثیت کے مالک۔ جب خلیفہ وقت نے ان جویں پر گزرا تو فکات کرنا ہو تو دوسرا کون ہے جو مزدور کا حق مار کر اپنا محل بنائے۔ پھر اگر بنانے پر مائل ہو ہی جائے تو مزدور کے لئے خلیفہ وقت سے ملاقات اتنی آسان کہ دن میں پانچ وقت۔ ایسے میں محض سرمایہ و محنت کے شعبہ میں عدم توازن پیدا ہونے کی نوبت آئے گی بھی تو کیسے؟ اسی سلسلہ کی دوسری کڑی یہ ہے کہ اسلام ایک ایسا نظام عدل دیتا ہے جو دشمن سے بھی کسی زیادتی کی اجازت نہیں دیتا۔ پھر قانون سے کوئی بالا نہیں۔ جب خلیفہ وقت کو بوقت ضرورت عدالت کے کتھرے میں کھڑا ہونا ہوتا ہے تو اور کون مائی کالا کہ جو عدم توازن کا ارتکاب کرے۔ تیسری کڑی یہ کہ جب سرمایہ دار کی جائز کمائی میں بھی محتاج کا حصہ ہے تو سرمایہ دار مزدور کے اس حصے میں ڈنڈی کیوں مارے گا جو بطور محنت اس کا معاوضہ ہو۔ نظام کو متوازن رکھنے کے سلسلہ میں آخری کیل یہ کہ آخرت میں جو ادبی کا خوف۔ مزدور کام چور ہو تو خیانت کا مرکب قرار پائے گا اور سرمایہ دار مزدور کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا نہ کرے تو وہ بھی ماخوذ ہوگا۔

کس قدر متوازن و معتدل نظام۔۔۔۔۔ نظام خلافت

## حرف آخر

اسلام کا نظام حیات اس لئے متوازن و معتدل ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا وضع کردہ ہونے کے لحاظ سے حرف آخر ہے۔ انسان کا ایسے نظام کو پس پشت ڈال کر انتباؤں پر اور تجربات میں سرگرداں رہنا ماسوائے بدبختی اور کج رفتی کے اور کیا ہے؟ کہتے ہیں کہ سچ کی لائیب ہوتی ہے تو جھوٹ کا ابھار۔ بہت جھوٹ آزمایا انسانیت نے خود ساختہ نظام بائے زندگی اپنا کر کیا وقت ابھی نہیں آیا سچ اپنانے کا؟ نیو ورلڈ آرڈر ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن وغیرہ سب پھندے ہیں انسانیت کو زیر و زبر کرنے کے۔ پلٹ اے انسان اپنے رب کی طرف اور اسی کے عطا کردہ نظام۔۔۔۔۔ نظام خلافت کی طرف۔

## خلافت کا نظام اطاعت

عصر حاضر کے مسلمانوں کی مثال اس ہٹ دھرم اور احمق شخص کی سی ہے کہ جو مٹی کا ڈھیلہ کھارے گا یا ہو لیکن مصر ہو کہ وہ گڑ کھارے گا۔ اسے لاکھ کہا جائے کہ گڑ کھانے کی صورت میں اس کا مزہ چٹھا ہونا چاہئے تھا جو نہیں ہو رہا تو گڑ کیسے ہوا؟ وہ کوئی دلیل سننے پر آمادہ ہی نہ ہو بس رٹ لگاتا جائے کہ گڑ بہت اعلیٰ قسم کا ہے۔ گنے کی فلاں، مشہور ورائٹی سے بنایا گیا ہے۔ مصالحہ وغیرہ کے بھی بغیر ہے اور بہت لذیذ ہے۔ مسلمانین عالم آت جس دین کو اپنائے ہوئے ہیں فرض کر بیٹھے ہیں کہ وہ قرآن و سنت پر مبنی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ قرآن و سنت پر مبنی ہے تو پھر ہمیں وہ برکات و فوائد حاصل کیوں نہیں ہو رہے جو خلافت راشدہ کے دور میں ہوئے تھے۔ بلکہ صورت حال ۱۸۰۰ء اور ۱۹۰۰ء کے برعکس ہو گئی ہے۔ اس وقت اسلام والے دنیا میں غالب تھے جب کہ آج مغلوب ہیں۔ اس وقت امن و سکون کا دور دورہ تھا جب کہ آج دہشت گردی کا ہے۔ اس وقت عدل تھا تو آج ظلم، اس وقت مسلمانوں کا مقدر خوشحالی تھا تو آج بد حالی۔ صورت حال کایوں الٹ ہو چلا کیا اس بات کا ثبوت نہیں کہ جس دین کو اسلام سمجھ کر ہم چنے ہوئے ہیں وہ اسلام کی ایک انتہائی تبدیل شدہ بلکہ مسخ شدہ شکل ہے۔ صورت حال دو اور دو چار کی طرح ہمارے سامنے ہے لیکن ہم ہیں کہ مغرور و غموں پر جی رہے ہیں۔ بزعم خویش بڑے دیندار اور اللہ کے محبوب بنے ہوئے ہیں۔ نزول قرآن کے وقت کچھ ایسی ہی حالت یہودی تھی۔ وہ خود کو اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے تصور کرتے تھے۔ قرآن مجید نے ان کا پردہ چاک کیا تو اس طرح کہ لاؤ دلیل اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو؟ ہمارا دعویٰ بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ ہم مسلمان گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں۔ ہمارے ام مسلمانون کے سے ہیں۔ پیدا ہوتے ہی ہمارے کانوں میں اذان دی جاتی ہے۔ عقیدہ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں مسجدیں ہیں۔ نمازیں پڑھی جاتی ہیں۔ روزے رکھے جاتے ہیں، عمرہ و حج کی ادائیگی ہوتی ہے۔ کیا یہ سب کچھ قرآن و سنت پر مبنی دین نہیں؟

جی نہیں ہرگز یہ وہ دین نہیں جو قرآن و سنت میں من و عنان اب بھی موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ



نماز روزے، حج اور کفن و دفن جیسے افعال کرنے پر ہی اکتفاء کرتے تو کہا جاسکتا تھا کہ دین اسلام بس یہی کچھ ہے۔ لیکن نبی کا نجات ﷺ اور صحابہ نے کیا بس یہی کچھ کیا؟ غور کریں تو انہوں نے اور بھی بہت کچھ کیا جو ہم آج نہیں کر رہے۔ انہوں نے اولین فرصت میں وقت کے نظام باطل کو نظام حق سے بدل دیا جب کہ ہم ایسا نہیں کر رہے۔ انہوں نے قرآن و سنت کی پیروی میں اللہ کے دن کو دنیا میں غالب کر دیا۔ اس کے برعکس ہم آج مظلومیت پر قانع ہیں۔ اس وقت کے مسلمان دنیا بھر کی قیادت پر متمکن تھے جب کہ آج ہم نہ صرف کفار و شرکین سے ڈکٹیشن لیتے ہیں بلکہ ان ہی کے سہارے جی رہے ہیں۔ کھاتے بھی ان کا ہیں، ڈالر بھی ان سے لیتے ہیں، اسلحہ بھی ان سے حاصل کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر آس لگائے ہوئے ہیں کہ کشمیر و فلسطین جیسے ہمارے مسائل وہی حل کریں گے۔ اس وقت کے مسلمانوں نے دنیا بھر سے ظلم کو منادیا تھا جب کہ ہم خود ظلم و جور اور دہرے معیار کے شکار ہیں۔

یہی نہیں اس وقت کے مسلمان قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق ایک خلیفہ کی سرکردگی میں تھے تو آج ہم 57 سربراہان کو خود پر مسلط کئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے قرآن و سنت کو انہیں مملکت قرار دیا ہوا تھا ہم نے خود ساختہ کتابچے کو انہیں مملکت بنایا ہوا ہے۔ انہوں نے جہاد کیا تو صرف خلیفہ کے حکم و ایما پر جب کہ آج ہمارا جہاد ٹولیوں، گروہوں، بلکہ آپس میں لڑنے کا جہاد ہے۔ صدیاں بیت گئیں ہم نے خلیفہ ہی کو چلتا کیا ہوا ہے۔ وہ قرآن و سنت کی پیروی میں ایک امت کی شکل میں تھے ہم سیاسی طور پر درجنوں اقوام میں منقسم ہیں تو مذہبی طور پر بے شمار فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ بتائیے جب ہم نے اس دین کو اپنایا ہی نہیں ہوا جو اس وقت کے مسلمانوں نے اپنا رکھا تھا تو ہمیں اس دور کی برکات حاصل ہوں تو کیسے؟

سب سے بڑی بھول ہماری یہ ہے کہ خود کو کچے بچے مسلمان فرض کئے ہوئے ہیں۔ احساسِ نیاں ہے ہی نہیں۔ راہِ گم کئے ہوئے ہیں۔ غری سے اترے ہوئے ہیں۔ دنیا بھر میں جوتیاں جھٹاتے پھرتے ہیں لیکن اپنے کردار پر نظر ثانی کرنے کے لئے آمادہ نہیں۔ اصلاح کی طرف اس لئے نہیں آ رہے کہ خود کو گمراہ سمجھتے ہی نہیں۔ اگلے جشن اور جو بلیاں مناتے ہیں جیسے کہ بڑے کامیاب جا رہے ہیں۔

خلافت راشدہ کو قرآن و سنت پر مبنی نظام کیوں کہا جاتا ہے؟ اس لئے کہ اسلام محض ایک نظریہ اور

ایک قیوری ہے اگر قرآن و سنت کے صفحات تک محدود رہے لیکن جب یہ نظر یہ کسی خطہ زمین میں نافذ ہو جائے یہی خلافت ہے۔ باغیظاً دیگر خلافت ہے تو دوسرا اسلام ہے ورنہ نہیں۔ کہاں ہے آج خلافت؟ خلافت نہیں تو پھر دین کیسا ہوا؟ نظام خلافت ایک مخصوص نظام ہے جس کا ہر شعبہ دنیا کے ہر دوسرے نظام سے مختلف ہے۔ دنیا کے نظام اور شعبے تو انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں جب کہ نظام خلافت اللہ تعالیٰ کا وضع کردہ اور باری برحق ﷺ کا آزمایا ہوا ہے۔ آج کی مسلمان حکومتوں کو نظام خلافت کا بدل تصور کر بیٹھنا ہی تو ہماری بڑی غلطی ہے۔ نظام خلافت کے مختلف شعبہ جات کی مخصوص ترکیب کے پیش نظر ”خلافت کے نظام اطاعت“ پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

## اسلام کا نظام اطاعت

اطاعت کا بنیادی مفہوم ہے کسی کام کو بطیب خاطر دل کی کشادگی اور پسندیدگی سے کرنا۔ طوعاً اور اطاعت کا مادہ ایک ہی ہے۔ طوعاً کے مقابلہ میں کرہاً استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب ہے کسی کام کو گواہی سے یا نہ چاہتے ہوئے کرنا۔ اسلام کی ان گنت دیگر اصطلاحات کی طرح ”طاعت“ بھی خاص مفہوم رکھتی ہے بلکہ اصل میں یہ محض طاعت نہیں سمجھنا اور طاعت کے طور پر مستعمل ہے یعنی اصراراً اور فوراً تعمیل کر دی۔ تعمیل بھی بغیر کسی ہچکچاہٹ کے یعنی برضا و رغبت۔ سمجھنا و طاعت اسلام کے ان پانچ بنیادی اصولوں میں سے دو اصول ہیں جن کو رسول ﷺ نے ایک حدیث میں بیان فرمایا تو اس طرح:

”میں تمہیں پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے۔ (امیر کی بات) غور سے سننا، اس کے حکم کی اطاعت کرنا، اللہ کی راہ میں ہجرت کرنا، جہاد کرنا اور جماعت (امت) میں شامل رہنا۔ بس جو شخص جماعت سے بالشت بھرا لگے ہو، اس نے اسلام (کی رسی) کا پھندا اپنی گردن سے اتار پیچھا لگا لیا یہ کہ وہ جماعت میں دوبارہ لوٹ آئے۔“ (ترمذی)

گوشت نشینی کی زندگی اسلام میں ممنوع اور محض انفرادی زندگی غیر مستحسن ہے۔ جماعتی (جماعت کا لفظ قرآن کریم میں استعمال نہیں ہوا، احادیث میں ہوا ہے لیکن اکثر و بیشتر مدت کے معنی میں) نظام امارت کے بغیر نہیں چل سکتا اس لئے لازم قرار دیا گیا کہ جماعت چھوٹی ہو یا بڑی ایک امیر کی سرکردگی میں ہو حتیٰ کہ اگر تین

مسلمان سفر کریں تو وہ بھی اپنے میں سے ایک کو امیر بنائیں۔ یاد رہے اسلام میں نماز کی امامت اہل بیت صغریٰ ہے۔ قوامت کی امامت اہل بیت کبریٰ۔ امامت صغریٰ میں ہزاروں لاکھوں مقتدی پیش امام کی ایک صدا پر فی الفور گردنیں جھکا دیتے ہیں تو دوسری صدا پر فی الفور کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کسی کی کیا مجال کہ ذرا پس و پیش کرے۔ اسی پر قیاس کریں امیر امت کی اطاعت کا اور اس حکم و ضبط کا کہ جو سنت کی سطح پر مطلوب ہے۔ امیر امت کی اطاعت جو اس قدر مؤکد و لازم ہے شروط سے ایک بڑی شرط کے ساتھ کہ امیر امت خود اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت میں ہو۔ بالفاظ دیگر خلافت کا نظام اطاعت تین اطاعتوں پر مشتمل ہے۔ اللہ کی اطاعت، رسول ﷺ کی اطاعت اور اولی الامر کی اطاعت۔ قرآن میں آیا:

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔ پھر تمہارے مابین کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول ﷺ کی طرف پھیر دو۔ اگر تم واقعی اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو“ (نساء: ۵۹)

یہ نظام ہے تو تین سطحی لیکن یہ راستہ اختیار کیا گیا ہے محض اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لئے جو مستقل بالذات ہے۔ ذیل میں ہر اطاعت کو علیحدہ علیحدہ زیر بحث لایا جاتا ہے۔

## اللہ کی اطاعت

اللہ تعالیٰ کی اطاعت اصل اور مستقل بالذات ہے۔ ”ان احکم الا اللہ“ قانون سازی و نمکرائی صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے۔ انفرادی و اجتماعی اطاعت کا مرکز و محور اللہ تعالیٰ کا قانون ہے۔ اولیٰ اطاعت ان احکامات و قوانین کی ہے جو قرآن میں مل جائیں۔ دوسرے قوانین اور فرمانبرداریاں صرف اسی صورت قبول کی جاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے قانون فرمانبرداری کے مد مقابل نہ ہوں بلکہ اس کے تحت و تابع ہوں۔ ہر وہ حلقہ اطاعت و ارادت کا قابل قبول ہے جو اس اصلی اور بنیادی اطاعت سے ماوراء ہو۔ بڑی تاکید ہے اسلام میں والدین کی خدمت و ارادت کی لیکن ان کے بھی ہر اس حکم کو بے چون و چرا ٹھکرا دیا جائے گا جو قرآن و سنت کے خلاف ہو۔ فرمایا گیا:

”ہم نے انسان کو ہدایت کی ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے۔ لیکن اگر وہ تجھ پر

زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے کو شریک ٹھہرائے جس کی دلیل نہیں تو ان کی اطاعت نہ کر۔“ (مکھبوت: ۸)  
 نبی کا نکتہ ﷺ نے اس امر کی مزید وضاحت فرمائی تو اس طرح کہ ”خالق کی مافرمانی میں کوئی  
 اطاعت نہیں اطاعت جو کچھ بھی ہے معروف میں ہے۔“ (بخاری و مسلم)۔ مختصر یہ کہ آیت اولی الامر میں ذکر تو  
 تین اطاعتوں کا ہے لیکن ان تین اطاعتوں کی ترتیب و ترکیب اس طرح سے ہے کہ اصل میں اللہ تعالیٰ وحدہ  
 لا شریک کے قوانین و احکام کی پیروی ہوتی ہے اور بس۔

### رسول ﷺ کی اطاعت

دوسری اطاعت رسول ﷺ کی اطاعت ہے۔ یہ اطاعت مستقل بالذات تو نہیں لیکن مستقل اور  
 دائمی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو کوئی ایسی اطاعت قابل قبول نہیں جو رسول ﷺ کی اطاعت کے راستہ سے نہ ہو۔ اللہ  
 تعالیٰ کی اطاعت کی واحد عملی صورت رسول ﷺ کی اطاعت ہے۔ انسانیت کے پاس احکام و قوانین الہی حتیٰ کہ  
 اللہ تعالیٰ کی ہستی و صفات کا علم جو بھی ہے رسول ﷺ کا بتایا ہوا ہے۔ رسول ﷺ کی اطاعت اس لئے مستقل اور  
 لازمی ہے کہ اس نے نہ صرف احکام الہی کی تشریح و توضیح کرنا ہوتی ہے بلکہ خود ان پر عمل کر کے اور ان کے  
 مطابق پوری زندگی گزار کر نمونہ پیش کرنا ہوتا ہے۔ یہ تشریح و توضیح اور عمل پیرائی آفاقی قانون کا ہی حصہ ہوتی  
 ہے۔ بشر کو متنبہ بنانے میں مصلحت ہی یہی ہے۔ بتائیں رسول ﷺ کی اطاعت اللہ کی اطاعت بن جاتی  
 ہے۔ قرآن میں آیا:

”کہہ دو اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے  
 گناہوں کو معاف کر دے گا“ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ کہہ دو کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اگر یہ  
 اعراض کریں تو جان لیں کہ اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔“ (آل عمران: ۳۱-۳۲)

ایک اور جگہ پڑھ لیا:

”جس نے رسول ﷺ کی اطاعت کی دراصل اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اور جو منہ موڑ گیا تو بہر  
 حال ہم نے تمہیں ان پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا۔“ (نساء: ۸۰)  
 مزید فرمایا:

”اے ایمان لائے والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی نہ کرو جب کہ تم سن رہے ہو۔“ (انفال: 20)

ایسا اس لئے ہے کہ رسول ﷺ کے فرائض میں ہے کہ وہ لوگوں کو دوسروں کی غلامی و بندگی سے نکال کر اللہ تعالیٰ کی بندگی و غلامی میں لائے۔ یہ امکان ہی خارج از بحث ہے کہ کوئی بھی کسی کو اپنی یا کسی دوسرے کی بندگی میں لائے۔ وہ ”اول مسلمین“ پہلے ہوتا ہے اور دوسروں کو اللہ کی بندگی و غلامی میں بعد میں لائے۔ قرآن میں آیا:

”کسی انسان کا یہ بس نہیں کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کی بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ سچے ربانی بنو جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔ وہ تم سے برگز نہ کہے گا کہ فرشتوں کو یا پیغمبروں کو اپنا رب بناؤ۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک نئی تمہیں کفر کا حکم دے جب کہ تم مسلم ہو۔“ (آل عمران: ۷۹-۸۰)

رسول ﷺ اس لئے نہیں آتا کہ ایمان تو اس کی رسالت پر لایا جائے اور اطاعت اپنی یا کسی دوسرے کی مرضی کی کی جائے۔ رسول کی اطاعت کا محور و مقصد تمام دوسرے قوانین و ضوابط کو چھوڑ کر اس قانون کی پیروی کرنا ہوتا ہے جو وہ لے کر آتا ہے۔ قرآن میں آیا:

”نہیں! اے محمد ﷺ! تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔“ (نساء: ۶۵)

اسی حقیقت کو ایک حدیث میں بیان کیا گیا تو اس طرح:

”تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس اس طریقہ کی تابع نہ ہو جائے جو میں لایا ہوں۔“

رسول ﷺ کی اطاعت اس لئے بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے کہ یہ اطاعت باذن اللہ ہے۔ قانون تو وہی ہوتا ہے جو اللہ کا دیا ہوا البتہ ہمیشہ ہمیش کے لئے وہ طریقہ فیصلہ کن سند ہے جس سے کہ رسول ﷺ اس

قانون پر عمل کر کے نمونہ پیش کرنا ہے۔ اس سند کو قبول کرنے یا نہ کرنے پر کسی کے مومن ہونے یا نہ ہونے کا دار و مدار ہے۔ قرآن میں آیا:

”ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس لئے بھیجا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے“ (نساء: ۶۴)

ایک اور بات جو اطاعت رسول ﷺ کے معاملہ میں جاننا انتہائی ضروری ہے یہ ہے کہ رسول ﷺ بیک وقت رسول بھی ہوتا ہے تو خلیفہ وقت بھی۔ البتہ یہ منصب خلافت تھی رہتا ہے اگر رسول ﷺ کی جدوجہد کے باوجود کوئی اسلامی ریاست معرض وجود میں نہ آ سکے۔ ریاست اگر قائم ہو جائے جیسے کئی کائنات ﷺ کے معاملہ میں ہوئی تو پھر منصب خلافت کا ظہور بھی ہوتا اور بھر پور ہوتا ہے۔ دائرہ رسالت کا کام ایک تو اللہ تعالیٰ کا پیغام دنیا والوں کو پہنچانا ہوتا ہے اور دوسرا احکامات و قوانین الہیہ کے مطابق اسلامی ریاست کو معرض وجود میں لانا اور وحی کے نظام کو قائم کرنا ہوتا ہے۔ اسلامی ریاست قائم ہو جانے کے بعد اس کا چلانا اسے وسعت و استحکام دینا وغیرہ فرائض خلافت کا حصہ ہیں۔ نئی رحمت ﷺ کے دور کو ایس تو کئی دور نبوت میں جو کچھ ہوا اور جس کے نتیجے میں ہجرت پر ایک نئی مٹی اسلامی ریاست معرض وجود میں آ گئی زیادہ تر کار رسالت تھا۔ اس کے برعکس مدنی دور نبوت میں زیادہ تر کار خلافت کا اظہار ہوا۔ رسول ﷺ تو رسول تھے خواہ کی دور نبوت ہو یا مدنی البتہ یہ غزوات لشکروں کی ترکیب و ترتیب، معاہدات، نظام قضا کا قیام، غرضیکہ قوانین الہی کا عملی نفاذ اور اسلامی ریاست کی توسیع و استحکام کا کار خلافت تھا۔ قرآن مجید میں یہ جو رسول ﷺ کو مسلمانوں سے مشورہ کرنے کی تاکید کی گئی ظاہر ہے یہ مشورے کی ضرورت انہیں بطور خلیفہ درکار تھی، کار رسالت میں کسی سے مشورے کرنے کا کیا سوال؟

## اولی الامر کی اطاعت

نظام خلافت کے تین سطحی نظام اطاعت میں تیسری اطاعت اولی الامر کی اطاعت ہے۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ جس طرح رسول ﷺ کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے اسی طرح اولی الامر کی اطاعت اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت ہے۔ من بعد رسول ﷺ قرآن و سنت کی شکل میں اصلاً تو اطاعت ہوتی ہے اللہ و

رسول ﷺ کی لیکن ظاہر ہے قرآن و سنت کا نفاذ کسی اتھارٹی کے بغیر ممکن نہیں۔ ایسی اتھارٹی ہی اسلام میں اولی الامر کہلاتی ہے اور اسلام کے نظم و ضبط کا یہ معراج ہے کہ اس نے اولی الامر کی اطاعت کو اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کے ساتھ شامل کر دیا ہے۔ اولی الامر کی اطاعت کے بغیر اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت نہ ممکن ہے نہ قبول بالخصوص اجتماعی دائرہ کار میں۔ یہ بات اہل زور دینے کے قابل ہے کہ اولی الامر کی اطاعت اللہ و رسول ﷺ کے بعد اور اس کے تحت ہے۔

اولی الامر کا مطلب ہے ایسے اصحاب کا گروہ کہ جن میں سے ہر ایک صاحب امر ہو یعنی وہ ایسے مقام اور عہدے پر ہو جہاں پالیسی امور طے ہوتے ہیں۔ قرآن کی دوسری اصطلاحات کی طرح اولی الامر بھی ایک خاص اصطلاح ہے۔ ایک تو ہر صاحب امر کے لئے قرآنی معیار اہلیت کے مطابق ہونا ہوتا ہے اور دوسرے اولی الامر میں ہوتے تو گورنر وزراء، چیف صاحبان افواج کے سربراہان، ارکان شوریٰ، جہتی و فکری رہنمائی کرنے والے علماء وغیرہ تمام ہیں لیکن ان میں مرکزی اور کلیدی حیثیت خلیفہ المسلمین کی ہوتی ہے۔ پھر خلیفہ المسلمین بھی ایک خاص شرعی اصطلاح ہے ہر حکمران کو خلیفہ المسلمین نہیں کہا جاسکتا۔ خلیفہ وقت ہونے کے لئے دوسری شرعی شرائط کے ساتھ پوری اسلامی دنیا کا اس کی سرکردگی و سربراہی میں ہونا ہے۔ ایسا گروہ جس کا ہر فرد قرآنی معیار اہلیت پر پورا نہ اترے یا اس میں مرکزی حیثیت خلیفہ وقت کو نہ ہو اولی الامر نہیں۔ اگر دنیا میں خلیفہ المسلمین ہو ہی نہ (جیسے کہ آج نہیں) تو فوراً دو غیر معمولی تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں۔ ایک تو اولی الامر کا وجود دنیا سے معدوم ہو جاتا ہے اور دوسرے امت مسلمہ کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ متعدد اقوام معرض وجود میں آجاتی ہیں۔ پھر جب اولی الامر کا وجود نہ رہے تو اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت درہم برہم ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی ہے جیسے انڈے سے اگر زردی نکال دی جائے تو وہ بچہ بنانے کی اہلیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ وہ صورت عود کرتی ہے کہ جیسے دور جا اہلیت کہ جس میں نہ خلیفہ تھا نہ خلافت نہ اولی الامر اور نہ ہی امت مسلمہ۔ ایسی صورت کی خود ہی رحمت ﷺ نے وضاحت فرمائی تو اس طرح:

”جو اطاعت سے نکل گیا اور جو جماعت میں نہ رہا پھر مرا تو وہ جہالت کی موت مرا“ (مسلم)

یعنی ایسی صورت میں امام کعبہ بھی مرے تو جہالت کی موت مرا ہے۔ ہاں کسی کے جہالت کی

موت مرنے سے بچنے کے لئے ایک ہی صورت ممکن ہے کہ وہ نظام خلافت کو پھر ایک حقیقت بنانے کی جدوجہد کر رہا ہو۔

اولوالامر کی اطاعت اطاعت کی تیسری کڑی تو ہے لیکن جیسا کہ اوپر بیان ہوا اس بڑی شرط کے ساتھ کہ وہ خود اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت میں ہوں۔ جو نبی و خدا اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت سے نکل جائیں وہ اپنے حق اطاعت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ان کی اطاعت فرض ہے لیکن محض معروف میں۔ حدیث میں آیا: ”مسلمان پر لازم ہے کہ اپنے اولی الامر کی بات سنے اور مانے خواہ اسے پسند ہو یا پسندنا ہو“ اے معصیت کا حکم نہ دیا جائے اور جب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر اسے نہ کچھ سنا چاہئے اور نہ ماننا چاہئے“ (بخاری و مسلم)

معروف میں البتہ اطاعت ہوگی تو اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت ممکن اور نہیں۔ نبی رحمت ﷺ نے فرمایا:

”جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری مافرمانی کی اس نے اللہ کی مافرمانی کی۔ اور جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی مافرمانی کی اس نے میری مافرمانی کی“ (بخاری و مسلم)

اولی الامر کے نہ ہونے سے چونکہ نظام اطاعت درہم برہم ہو جاتا ہے اور نظام خلافت معدوم ہو جاتا ہے لہذا نظام صلوٰۃ نظام زکوٰۃ نظام قضا غرضیکہ زندگی کا ہر شعبہ بے سرو پا ہو جاتا ہے۔ دین کی جو برائے نام شکل رہ جاتی ہے اس سے اسلام کی فیوض و برکات تو کیا اٹھنے قصاصات و فروعیات سے واسطہ پڑ جاتا ہے۔ غالب ہونے کی بجائے مسلمان مظلوم ہو جاتے ہیں۔ امن کی جگہ دہشت گردی آدھمکتی ہے۔ عدل ظلم سے بدل جاتا ہے اور سب کچھ ہوتے ہوئے بھی مسلمان در ماندگی و پسماندگی اور ذلت و رسوائی سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

آیت اولی الامر (نساء ۵۹) میں جو آخری قانون بیان کیا گیا ہے تو یہ کہ کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کو تو اسلامی قانون کے مرجع کی حیثیت حاصل ہے اولی الامر کو نہیں۔ جب بھی اولی الامر کے آپس



میں یا اولی الامر اور عوام کے مابین کوئی تنازع ہو جائے تو لازم ہے کہ فوراً اللہ و رسول ﷺ (قرآن و سنت) کی طرف رجوع کیا جائے۔

## خروج

جس طرح اسلام طلاق کی اجازت تو دیتا ہے لیکن نہ صرف ما پسندیدگی کے ساتھ بلکہ متعدد مصالحتی کوششیں اور فائز مولے آزمانے کے بعد ہی طرح خروج کی اجازت تو دیتا ہے لیکن آخری سے بھی آخری حربہ کے طور پر۔ احادیث میں آیا:

”تم پر لازم ہے سننا اور اطاعت کرنا (حکام حاکم کا) تکلیف اور راحت میں خوشی اور رنج میں اور جس وقت تیرا حق کسی اور کو دیں“ (مسلم)

بائیں ہم خروج کے امکان کو خارج از بحث قرار نہیں دیا گیا۔ نبی کائنات ﷺ نے فرمایا:

”تم پر ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کی بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو منکر۔ تو جس نے ان کے منکرات پر اظہارِ رائے کیا وہ بری الذمہ ہوا۔ جس نے ان کو ما پسند کیا وہ بھی نیک گیا۔ مگر جو ایسے میں راضی ہوا اور پیروی کرنے لگا وہ ماخوذ ہوگا۔ صحابہؓ نے پوچھا ”یا رسول اللہ! جب یہ صورت ہو تو کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں۔“ فرمایا: نہیں جب تک کہ وہ نماز پڑھتے رہیں۔“ (مسلم)

ایک اور حدیث میں فرمایا ”جب تک کہ وہ نماز قائم کرتے رہیں۔“ اسلام میں قیام نماز کا نظام یہ ہے کہ تلیف وقت خود دار اختلاف کی مرکزی مسجد میں امامت و خطابت کے فرائض ادا کرے اور باقی پوری اسلامی دنیا کی مساجد میں اسی کے انیاء و امر (On Behalf of) آنحضرات امامت و خطابت کے فرائض ادا کریں۔ نیز مساجد محض نماز کے لئے ہی مختص نہ ہوں بلکہ ان میں تمام مقامی و اجتماعی معاملات مشورے سے طے ہوں۔ (عرصہ ہوا ہمارے ہاں قیام نماز کا نظام درہم برہم ہو چکا)

خروج کے بارے میں آپ نے ایک اور موقع پر یوں بھی فرمایا:

”ہم جھگڑا نہ کریں گے اس شخص کی خلافت میں جو اس کے لائق ہو مگر جب کلمہ کلا کفر دیکھیں جو اللہ تعالیٰ کے پاس حجت ہو“ (مسلم)

خروج کی نوبت تھی آسکتی ہے جب مذکورہ بالا ایک یا دونوں شرائط پوری ہوں۔ یعنی ایک تو اس صورت میں کہ کمران وقت مسلمانوں کے درمیان نظام صلوٰۃ قائم نہ کر سکیں اور دوسرے جب وہ مکمل کھلا کفر کے مرکب ہوں۔ ان دونوں صورتوں میں بھی خروج کی اجازت جیسے کہ ہم نے اوپر کہا، آخری سے آخری حربہ کے طور پر ہے۔ ورنہ خروج سے پہلے دونوں صورتوں میں شوریٰ کو اختیار ہے کہ جب بھی خلیفہ وقت یا ولی الامر کا کوئی دوسرا فرد کسی طور قرآنی معیار اہلیت سے گرجائے تو اسے برخاست کر دے۔ ظاہر ہے یہ نظام صلوٰۃ کا قائم نہ کرنا یا کفر کا مکمل کھلا مرکب ہونا قرآنی معیار اہلیت کی گراوٹ میں ہی واقع ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آخری سے آخری حربہ یعنی خروج سے ما قبل آخری حربہ یعنی خلیفہ وقت کی برخاستگی کا راستہ اختیار کیا جائے گا۔

## بیعت

بیعت خرید و فروخت کا ایک ایسا معاہدہ ہے جو اللہ اور اس کے بندے کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ اس معاہدہ میں بندہ اپنی جان اور اپنا مال (جو دراصل اللہ ہی کے عطا کردہ ہیں) اللہ کی سپردگی میں دے دیتا ہے اور اللہ اس ایثار و قربانی کے معاوضہ کے طور پر بندے کو جنت عطا کرتا ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا طریق کار ہے کہ وہ قرآن و سنّت پر مبنی نظام خود براہ راست نہیں بلکہ خلافت کے ذریعہ چلاتا ہے۔ اسی طرح بظاہر یہ بیعت یا معاہدہ بندے اور اس نظام کے مرکز یعنی خلیفہ المسلمین کے مابین ہوتا ہے۔ لیکن اصل اللہ اور بندے کے درمیان ہوتا ہے۔ یقیناً بہت سے لوگوں کے لئے یہ بات حیرت انگیز اور ایک خبر کے مانند ہو کہ بیعت رسول ﷺ اور امتی کے درمیان بھی نہیں ہوتی۔ ہوتی ہے تو خلیفہ وقت اور کسی امتی کے درمیان۔ مکی دور نبوت میں جب تک محض رسالت کا فرما تھی تو کسی سے بیعت نہیں ہوئی۔ کچھ احباب مسلمان ہوئے اور بس۔ پہلی دفعہ بیعت ہوئی تو مکہ ہی میں یعنی منیٰ میں عقبہ کے مقام پر لیکن ہوئی اس وقت جب مدینہ سے ایک وفد رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس وفد کے ارکان نے نہ صرف آپ ﷺ کو مدینہ آکر ایک اسلامی ریاست قائم کرنے کی دعوت دی بلکہ اصل واقع سے پہلے ہی آپ ﷺ کو اس ریاست کا سربراہ تسلیم کیا۔ باحفاظہ دیگر رسالت کے ساتھ خلافت کا عنصر جو تاہنوز چھٹی تھا، جاگر ہوا۔ اس بیعت کو اسلامی تاریخ میں بیعت عقبہ اولیٰ کہتے ہیں اور اس کے بعد بیعت کا یہ سلسلہ پہلے رسول ﷺ اور امتیوں کے درمیان اور پھر خلفائے راشدینؓ اور

اہمیتوں کے مابین چلتا رہا۔ بیعت بہر حال بندے اور اللہ کے درمیان ہوتی ہے کیونکہ اللہ ہی کا حق اور تھارٹی ہے کہ وہ معاوضے میں کسی کو جنت عطا کرے۔ بیعت رضوان کے موقع پر صراحت سے فرمایا گیا:

”اے نبی! جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا“ (فتح: ۱۰)

یہ معاہدہ اصل میں اسی وقت ہی کر لیا جاتا ہے جب کوئی بندہ دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے۔ عورتوں کے لئے چونکہ جان و مال قربان کرنے کے مواقع کم ہوتے ہیں ان سے ان امانتوں کے تحفظ کی بیعت لی جاتی ہے جو ان کی تحویل میں ہوتی ہے۔ قرآن میں آیا:

”اے نبی! جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لئے آئیں اور اس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی پوری نہ کریں گی زنا نہ کریں گی اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ نہ لائیں گی اور کسی معروف میں تمہاری مافرمائی نہ کریں گی تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں اللہ سے دعائے مغفرت کرو۔ یقیناً اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے“ (ممتحنہ: ۱۲)

بیعت کی تجدید اس وقت بھی ہوتی رہی ہے جب مسلمانوں کو نظام خلافت بچانے کے لئے میدان میں اترنا پڑا۔ بیعت رضوان اسی سلسلے میں تھی۔ یہ بات البتہ مد نظر رہے کہ بیعت امتی اور خلیفہ وقت یا خلیفہ کے نمائندے کے مابین ہوتی ہے۔ دور رسالت میں نبی کائنات ﷺ نے حضرت عمرؓ کو عورتوں سے بیعت لینے کے لئے مامور کیا۔ چونکہ یہ معاہدہ نظام خلافت کی بقاء و جاتی کا ضامن ہے لہذا اسلام میں بیعت کی بہت اہمیت ہے۔ نبی رحمت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”جو شخص مراوے اور کسی سے اس نے بیعت نہ کی ہو تو اس کی موت جاہلیت کی ہی ہوگی“ (مسلم)

بیعت کی اسی اہمیت کے پیش نظر ضروری سمجھا گیا کہ دور نبوت کے اواخر میں اس کی تجدید کی تاکید کر دی جائے۔ قرآن میں فرمایا گیا:

”حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لئے

ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں“ (توبہ: ۱۱۱)

سوختہ تختی اسلام پر ایک دور ایسا بھی آیا کہ خلیفہ وقت کی بیعت تو کیا خلیفہ راشد کا وجود ہی نہ رہا۔ یہی وہ تاریک دور ہے جس میں کچھ لوگوں نے جہالت کی موت سے بچنے کی آڑ میں خود بیعت لینا شروع کر دی تھی کہ بڑھتے بڑھتے ہمارے ہاں وہ نظام وجود میں آگیا جسے خانقاہی نظام یا ”پیری مریدی“ کا نام دیا گیا۔ پھر پیری مریدی کے موجدوں نے کمال ہوشیاری سے خلافت کے عنصر کو بھی خود سے چپکائے رکھا اور مختلف علاقوں کے لئے اپنے خلفاء مقرر کر کے شروع کر دیئے۔ زیر آسمان یا ایک ایسی بدعت تھی کہ جس نے پورے دس اسلام کی ہیئت بدل کر رکھ دی۔ اس لئے کہ جب بیعت کی ضرورت جعلی خلفاء نے پوری کر دی تو آہستہ آہستہ خلیفہ و خلافت کی ضرورت انسانی ذہنوں سے محو ہوتی چلی گئی۔ مسلمانوں کا نظام خلافت کو بھول جانا تاریخ عالم کا سب سے بڑا سانحہ ہے جس کی ذمہ داری ان تمام مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے جو اختتام دور خلافت راشدہ سے لے کر آج تک اس دنیا میں آئے۔ ہم گناہگار نہ زندگی بسر کر رہے ہیں اگر بحالی خلافت کی جدوجہد نہ کریں۔

ہمارے ایک تحریر کی ساتھی علامہ عنایت اللہ طور صاحب کی تحقیق کے مطابق خلیفہ وقت کی عدم موجودگی میں کھینچ جان کر کسی کو بیعت لینے کا جواز نکل سکتا ہے تو کسی ایسی تنظیم کے سربراہ کو کہ جو قرآن و سنت کے نظام کو لانے کے لئے تن من دھن کی بازی لگائے ہو۔ ان کا کہنا یہ کہ ایسی بیعت اسی طرح ناراضی ہوگی جس طرح کہ پانی کی عدم موجودگی میں تیمم۔ جو نبی خلیفہ المسلمین متعین ہوگا یہ ناراضی بیعت از خود ساقط ہو جائے گی۔ دلیل علامہ صاحب کی یہ ہے کہ سورہ نساء اور سورہ مائدہ میں جہاں مع و طاعت کے معاہدے کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے اس سے فوراً پہلے دونوں مقامات پر تیمم کا ذکر آیا ہے۔

ایسی صورت میں گواہی جسمانی طور پر پاپا کہی رہتا ہے لیکن اس کی مجبوری کے پیش نظر اللہ تعالیٰ اسے ناراضی طور پر پاک قرار دیتا ہے۔

## طاغوت کا انکار

خلافت کا نظام اطاعت متقاضی ہے کہ اللہ کے اقرار سے پہلے طاغوت کی اطاعت کا انکار کیا

جائے۔ جس طرح ایک جسم میں دو دل نہیں ہو سکتے اسی طرح اللہ کی اطاعت اور طاعت کی ایک وقت نہیں ہو سکتیں۔ دونوں اطاعتوں کو بیک وقت نبھانے کی روش منافقت ہے اور منافق کا دوزخ میں مقام کاغیر سے بھی بدتر ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نبی نے اللہ کی اطاعت کے ساتھ طاعت کی اطاعت کی نفی کی ہے۔ قرآن میں آیا:

”ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا اس تعلیم کے ساتھ کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاعت کی بندگی سے بچو“ (نحل: ۳۹)

اللہ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ طاعت کی اطاعت کے انکار کی ناکید اس کلمے میں سمودی گئی جو بچے کے پیدا ہوتے ہی اسے سنایا جاتا ہے یا کسی کے دائرہ اسلام میں داخل ہوتے ہی پڑھایا جاتا ہے۔ پھر مؤذن پانچ بار دن میں اور ہر بار نماز میں کئی بار اس کا اعلان کرتا ہے کہ میں اللہ کے سوا ہر دوسرے معبود کا انکاری ہوں۔ کسی ایسے آئین کو اور کسی ایسے قانون کو میں نہیں مانتا کہ جو قرآن و سنت کے خلاف ہو۔ کسی ایسی عدالت کو نہیں مانتا جو غیر اسلامی قوانین اپنائے اور کسی ایسے حکم کو نہیں مانتا جو خالق کے حکم کے خلاف ہو۔

## حرف آخر

نظام اطاعت جو گزشتہ صفحات میں بیان ہوا دنیا بھر میں عملاً مایہ ہے۔ ہمیں آج دس اسلام کی برکات حاصل نہیں ہو رہیں تو اس لئے کہ صدیاں بیت گئیں یہ دھرتی خلیفہ راشد سے محروم ہے۔ امیر المؤمنین کے عہد وجود نے پورے دین کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ نہ آج خلافت موجود ہے نہ اولی الامر اور نہ ہی امت۔ ایسے میں امام کعبہ کی موت بھی جہالت کی موت ہے اگر وہ نظام خلافت کے لانے میں تن من کی بازی لگائے ہوئے نہ ہو۔ ایسے نمازی اور روزے دار سخت بھول بلکہ گمراہی کا شکار ہیں کہ جو نمازیں پڑھ کر اور روزے رکھ کر یہ سمجھ بیٹھے ہوں کہ جنت بس ان ہی کے لئے ہے۔ قرآن میں آیا:

”پھر کیا تم لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ تمہیں جنت کا داخلہ بس یونہی مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزرا ہے۔ ان پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، بلا مارے گئے حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چچاٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ اس وقت

انہیں تسلی دی گئی کہ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے“ (بقرہ: ۲۱۳)

قرآن شائد غزوہ خندق کے موقع پر ایسا ہی کراؤ وقت نبی کائنات ﷺ اور صحابہؓ پر آیا: ”اس وقت مومنین خوب آزمائے گئے اور بری طرح بلامارے گئے“ (احزاب: ۱۱)

رسول ﷺ اگر محض نماز پڑھ کر اور روزے رکھ کر اس دنیا سے چلے جاتے تو قیاس کیا جاسکتا تھا کہ محض نماز روزے کی ادائیگی سے دین کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ قرآن وسنت کو پڑھیں بار بار پڑھیں کوئی نئی دنیا میں ایسا نہیں آیا جس نے نماز روزے کے ساتھ ساتھ نظام باطل کو جس حق سے بدلنے کی خاطر تن من دھن کی بازی نہ لگائی ہو۔ شعب ابی طالب کی سختیاں طائف کی سرگردانیاں اور بدر و حنین کی جانفشانیاں گواہی کائنات ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے کوئی کسر اٹھانا نہ رکھی اسی نظام کو لانے کے لئے کہ جس کا نام ہے..... نظام خلافت۔

## خلافت کا نظام مشاورت

تاریخ بتاتی ہے کہ شخصی اور وراثتی حکومتیں ادوارِ جہالت کا لازمی عنصر رہی ہیں۔ عمرو دوفرعون وغیرہ کی حکومتیں اسی سلسلہ کی ہی کڑیاں تھیں۔ آج کی دنیا پر بھی نظر دوڑائیں تو اکیسویں صدی کے اس ترقی یافتہ دور میں کئی ممالک میں یا تو شخصی اور وراثتی حکومتیں بالفعل قائم ہیں یا شاہی خاندانوں کو علامتی (Figure Head) سیادت حاصل ہے۔ عصرِ حاضر کے پارلیمانی نظام میں سربراہِ حکومت یعنی وزیراعظم کے علاوہ سربراہِ مملکت یعنی صدر کا وجود علامتی سیادت کی ہی ایک شکل ہے۔

عین اس وقت جب رسول ﷺ دنیا میں بطور آخری نبی جلوہ افروز ہوئے، کرہ ارض پر دو ایسی عظیم سلطنتیں تھیں جن پر خاندانی و وراثتی حکومتیں قائم تھیں۔ ایک ایسی بڑی سلطنت پر قیصر حکمران تھے تو دوسری پر کسریٰ۔ دونوں سلطنتوں کے آئین شخصی حکومت اور وراثتی بادشاہت کے لحاظ سے مشترک تھے۔ ہر جگہ شخص واحد لاکھوں کروڑوں انسانوں پر قابلیت و صلاحیت کی وجہ سے نہیں وراثت کے خالمانہ و بیہیمانہ اصولوں کی بنا پر حکومت کرتا تھا۔ روز روشن کو یہ شخص اگر تار یک رات قرار دیتا تو پوری مملکت میں کسی کی مجال نہ تھی کہ اسے سورج کی موجودگی کا احساس دلاتا۔ اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ خواہ کتنے ہی احمقانہ ہوتے، قانون قرار پاتے۔ قرآن مجید کے بیان کردہ اہم ہنرمند کے کالمہ سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ شخص واحد کو کس قدر اختیارات حاصل تھے؟

ماضی قریب میں تمدنی ارتقاء کے ساتھ ساتھ جمہوری حکومتیں تو وجود میں آئیں لیکن شخصی حکومتوں کا یہ افسوسناک و المناک پہلو موجود رہا کہ انسان انسانوں کے لئے قانون سازی کرتا اور خود ساختہ قوانین کے ذریعہ حکومت کرتا ہے۔ آج کی دنیا پر یہ خوف و شرم جس کی قرآن مجید نے نشاندہی کر رکھی ہے تو اس طرح کہ "خشکی وتری میں فساد برپا ہو گیا لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے" (روم: 41) کچھ انسانوں کا دوسرے انسانوں کیلئے قانون سازی کرنا اور ان پر حکومت کرنے کی وجہ سے ہے۔ بالفاظِ دیگر کچھ انسانوں کا دوسرے ہم

جنسوں پر حکم چلانا اور انہیں اپنی مرضی کا پابند کرنا اصلی فساد کی جڑ ہے۔ ویسا کی یہ ہے کہ جب بھی کوئی انسان یا انسانوں کا گروہ قانون سازی کرتا ہے تو وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے اور اپنے طبقہ و برادری کے حق میں کرتا ہے باقی انسانوں کا جینا خواہ کتنا ہی دو بھر ہو جائے۔ پارلیمنٹ میں تاجروں کی اکثریت ہو تو قانون بناتے وقت تجارتی مفادات قانون سازوں کے مد نظر رہیں گے اور اگر کاشتکاروں، جاگیرداروں وغیرہ کی اکثریت ہوگی تو فیصلے ان کے حق میں ہوں گے۔ کہنے کو تو اسے جمہوری نظام کہا جاتا ہے لیکن جمہوریت کی آڑ میں درحقیقت چند عیار و بائز انسان دوسرے انسانوں پر یوں قابض ہو جاتے ہیں جیسے کہ چوپائے چرے جو ہے کے جم و کرم پر ہوتے ہیں۔ کیا ہی صحیح ترجمانی کی علامہ اقبالؒ نے اس بظاہر جمہوری لیکن در پردہ جاہلانہ نظام کی جب اس نے اسے ایک شیطانی چال قرار دیا۔ شیطان کی مجلس شوریٰ کا ایک رکن اندرونی راز فاش کرتا ہے تو اس طرح

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس

جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود مگر

انسان کے ان خود ساختہ نظاموں کے سامنے تو شیطان نے یہ کہتے ہوئے ہتھیار ڈال دیئے کہ:

جمہور کے مجلس ہیں اباب سیاست باقی نہیں اب میری ضرورت ہے افلاک

صورت حال کی اسی سنگینی کے پیش نظر اسلام نے جو پہلا وار کیا تو انسان کی اسی باغیانہ روش پر۔

اعلان کیا گیا "ان الحکم الا للہ"..... قانون سازی و حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کو ہر اوار ہے۔ بظاہر تو

انسانوں پر حکومت لیکن ایسے انسانوں کی جو "مجبور محض" ہوتے ہیں خود قانون سازی نہیں کر سکتے۔ آسمانی

کتابوں کی شکل میں مازل کردہ اور پیغمبروں کا جاری کردہ قانون خود حکمرانوں پر بھی اسی طرح لاگو ہوتا ہے جس

طرح کہ عجم الناس پر۔ دائرہ اسلام میں کوئی داخل ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ یہ رہنما اصول تسلیم نہ کرے کہ

"لا الہ الا للہ" یعنی سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی دوسرا نہیں کہ جس کے قانون و حکم کی پیروی کی جائے۔ ہر تسلیم

شم ہوگا تو صرف اس وحدہ لا شریک ہستی کے لئے اور بس۔

قانون سازی و حکمرانی کا یہ اعزاز صرف اس لئے ہی اللہ تعالیٰ کو ہر اوار نہیں کہ وہ غیر جانبدار و اول و



آخر اور تادروقت پر ہے بلکہ اس لئے بھی کہ انسان کا خالق وہی ہے۔ انسان فطرت کی فیکٹری کا پروڈکٹ ہے اور کسی بھی فیکٹری کے مالک کو یہی یہ حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی فیکٹری میں تیار کئے جانے والے پروڈکٹ کو استعمال میں لانے کیلئے ہدایت دے۔ قرآن مجید میں اس اصول کو بیان کیا گیا تو اس طرح

"پس (اے نبیؐ اور نبیؑ کے پیرو) یکسو ہو کر اپنا رخ دین پر جمادؤ قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جاسکتی۔ یہی بالکل راست اور درست دین ہے۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں" (روم: 30)

اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ بہر حال نہیں کہ وہ دنیا میں کہیں فخر کھول کر قانون سازی و نگرانی کرے۔ انسانوں ہی کے ذریعہ وہ اپنے قانون کے مطابق نگرانی کرتا ہے۔ ادارہ خلافت بلکہ نظام خلافت ایسے ہی طرز حکومت کا مظہر ہے۔ خلیفہ المسلمین قوی ہوتا ہے تو اس قدر کہ پوری اسلامی دنیا کے ذرائع و وسائل اسی کے ہاتھ میں مجتمع ہوتے ہیں لیکن وہ بے بس ہوتا ہے تو اس قدر کہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ اور رسول ﷺ کا ولس اختیار کردہ قانون خود خلیفہ پر بھی اسی طرح لاگو ہوتا ہے جیسے کہ مملکت کے کسی نام شہری پر۔

پوری بات کا احاطہ کرنے کیلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وضاحت کر دی جائے کہ نظام خلافت دو طرح کے قوانین پر استوار و رواں دواں ہوتا ہے۔ کچھ قوانین تو وہ ہیں کہ جو بنیادی اصل اور غیر متبدل ہیں۔ احکامات قرآن و سنت انہیں قوانین پر مشتمل ہیں۔ کسی انسان کے بس میں نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ قوانین کو ماقیامت بدل سکے خواہ وہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو۔ دوسرے قوانین وہ ہیں جو وقتی اور عارضی ضرورت کو پورا کرتے ہیں اور حقیقت میں ان کی حیثیت ذیلی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ تو قرآن و سنت نے طے کر دیا کہ اولی الامر مسلمانوں میں سے ہوں لیکن یہ بات کہ وقت کے کسی موڑ پر کتنے گورز ہوں وقتی اور عارضی معاملہ ہے جو کسی بھی وقت طے کیا جاسکتا ہے اور طے شدہ کو بدل بھی جاسکتا ہے۔ یہ ذیلی قوانین ہوتے ہی نہیں بلکہ قوانین کی شرح ہوتے ہیں۔ وقتی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے قرآن و سنت ہی کی روشنی میں بنائے بھی جاتے ہیں اور بدلے بھی جاسکتے ہیں۔ ذیلی و تشریحی قانون سازی کا یہ کام اسلام برابر سے غیر سے کے سپرد نہیں کرتا۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر وہ اس مخصوص اور انتہائی ماہرانہ کام کیلئے ایک ایسا مخصوص ادارہ عرضی وجود لاتا

ہے جو اولی الامر کا ہی حصہ ہوتا ہے۔ ایسا ادارہ چونکہ مخصوص ترکیب دینیت کا حامل ہوتا ہے لہذا ہم اسے پالیٹنٹ، مفقہ وغیرہ کا نام نہیں دے سکتے۔ قرآن و سنت میں اسے مخصوص نام..... "شورعی" سے موسوم کیا گیا ہے۔

قرآن و سنت کی شکل میں اہل اور مائل تفسیر قوانین تو آج بھی من و عن موجود ہیں اور تا قیامت موجود رہیں گے کیونکہ ان کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے۔ البتہ یہ قوانین دھرے رہ جاتے ہیں جب تک کہ وہ ادارہ موجود نہ ہو کہ جو ان قوانین کو بروئے کار لائے۔ قرآن کریم اپنی اصطلاح میں اس بروئے کار لانے والے ادارے کو بھی مخصوص نام "اولی الامر" سے یاد کرتا ہے۔ نظام خلافت کی بقاء و ارتقاء کیلئے اولی الامر کا مسلمانوں کے درمیان ہونا اتنا ہی اہم ہے کہ جتنا خود قرآن و سنت کا ہونا۔ بالفاظ دیگر قرآن و سنت اور اولی الامر لازم و ملزوم ہیں۔ ان دونوں میں سے ایک موجود ہو دوسرا موجود نہ ہو تو نظام خلافت معرض وجود میں آئی نہیں سکتا۔ بنابر اس اسلام نے اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کے ساتھ اولی الامر کی اطاعت کو اس طور نفعی کر دیا ہے کہ اولی الامر کی اطاعت کے بغیر اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت ممکن ہی نہیں۔ فرمایا گیا:

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول اللہ ﷺ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول ﷺ کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یا ایک صحیح طریق کار بجا اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔"

یعنی اولی الامر کا مسلمانوں کے درمیان ہمہ وقت موجود ہونا اس لئے بھی ضروری ہے کہ اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کا ایک ہی راستہ ہے کہ اولی الامر کی اطاعت کی جائے۔ پھر چونکہ اولی الامر میں خلیفہ یعنی مسلمانوں کا ایسا نگران کہ جس کی سربراہی میں پوری اسلامی دنیا ہو کی مرکزی حیثیت ہوتی ہے۔ لہذا خلیفہ وقت کا ہمہ وقت مسلمانوں میں موجود رہنا لازمی ہے۔ یعنی اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کے لئے ضروری ٹھہرا کہ اولی الامر کی اطاعت ہو اور اولی الامر کی اطاعت کے لئے لازم ٹھہرا کہ خلیفہ وقت کی اطاعت ہو۔ بنابر اس قرآن مجید میں خلیفہ وقت کی اطاعت کو اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت متصور کیا گیا ہے۔ ایک جگہ پر آیا

"اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور اس سے سرتابی نہ کرو"

(انفال: 20)

چندی سطور کے بعد فرمایا گیا:

"اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی پکار پر ایک کبوتر جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے اور جان رکھو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہے اور اسی کی طرف تم سینے جاؤ گے" (انفال: 24)

پہلی آیت (20) میں اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت یعنی دوا طاعتوں کا ذکر ہے لیکن جب یہ فرمایا کہ "اس سے سرتابی نہ کرو تو ضمیر واحد (عز) استعمال کی۔ رسول ﷺ کی حیات میں تو ظاہر ہے "اس سے سرتابی نہ کرو" کا مطلب رسول ﷺ کے حکم کی سرتابی نہ کرو ہے لیکن مابعد رسول ﷺ جس کا حکم سنا جائے گا اور جس سے سرتابی ممنوع قرار پائی وہ خلیفہ ہی ہوگا۔ اسی طرح دوسری آیت (24) میں اللہ و رسول ﷺ کی پکار سنیے بھی "عاکم" یعنی صیغہ واحد کا استعمال ہوا۔ نبی ﷺ کی زندگی میں تو "اذا دعاکم" کا مطلب رسول ﷺ کا پکارنا ہی ہے لیکن مابعد رسول ﷺ ظاہر ہے خلیفہ وقت ہی کی پکار پر ایک کیا جائے گا۔

اوپر ہم نے ذکر کیا کہ خلیفہ وقت بنے پس ہوتا ہے تو اتنا کہ خود قانون سازی نہیں کر سکتا بلکہ خود خلیفہ پر قانون اسی طرح لاگو ہوتا ہے جیسے کہ ایک عام شہری پر۔ وہ قوی ہوتا ہے تو اس قدر کہ پوری اسلامی دنیا اس کے اشارہ پر و پر تن من و دھن وارنے کے لئے ہمہ وقت تیار ہوتی ہے۔ یہ عظیم مقام خلیفہ وقت کو حاصل ہوتا ہے تو دو کڑی شرائط کے ساتھ ایک طرف وہ اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کا پابند ہوتا ہے تو دوسری طرف شوریٰ سے مشورہ لینا اس کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ بصورت دیگر وہ اپنے حکم کی اطاعت کا حق اسی طرح کھو بیٹھتا ہے جس طرح کہ شوریٰ اگر مشورہ نہ دے تو وہ اپنا مقام کھو بیٹھتی ہے۔ قرآن میں آیا:

"امرهم شورى بینہم" (شوری: 38) اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشورے کی اہمیت اور اس قدر آخر کیوں؟

## مشورہ کیوں؟

خلافت ایک شورائی نظام ہے۔ مشورے کے بغیر نظام خلافت کو چلانا ممنوع ہے۔ خلیفہ وقت کے لئے لازم ہے کہ کاروبار خلافت امت کے مشورہ سے چلائے۔ اسلام میں اس مشورہ لینے کی اتنی اہمیت ہے کہ خود پیغمبر ﷺ کو بھی مشورہ لینے کا پابند کیا گیا ہے۔ قرآن میں ہے:

"شاور ہم فی الامر" (آل عمران: 159) اور کام میں انہیں شریک مشورہ کرو۔

یاد رہے کوئی بھی نئی اپنے وقت کا خلیفہ بھی ہوتا ہے۔ رسول ﷺ کو یہ مشورہ لینے کا پابند کیا گیا تو کار خلافت میں کار رسالت میں نہیں۔ کار رسالت تو اللہ و رسول ﷺ کا معاملہ ہے کسی تیسرے کی مداخلت و مشاورت کا کوئی سوال نہیں۔

خلیفہ کو مشورہ کا پابند کیا گیا تو ان مصلحتوں کے پیش نظر۔ ایک تو اس لئے کہ منصب خلافت پر متمکن ہونے والا شخص کہیں مطلق العنان نہ ہونے پائے۔ اسے بالاتر قانون کا پابند بھی کیا گیا تو اسی لئے، حتیٰ کہ قانون کومن و مین اس پر لاگو کیا گیا اسی مصلحت کو مد نظر رکھتے ہوئے۔ نظام خلافت میں ویسے بھی خلیفہ کے مطلق العنان ہونے کے امکانات اس قدر کم ہوتے ہیں کہ نہ ہونے کے برابر اس لئے کہ امت میں سے خلیفہ بنایا ہی اسے جاتا ہے کہ جو تقوٰنی کے معراج پر ہو خلیفہ کو تا خدا خوف ہونا ہے کہ امت کے فیصلے وہ تنہا کرنے کا خطرہ مول لیتا ہی نہیں۔ اللہ کے ہاں تو اسے جو بدہ ہوا ہی ہے، اسلام میں پوری امت مسلمہ کو حزب مخالف کا درجہ حاصل ہے۔ کوئی بھی شہری خلیفہ وقت کا دامن پکڑ کر اس سے حساب لے سکتا ہے۔

خلیفہ کو مشورے کی ضرورت پڑتی ہے تو اس لئے بھی کہ زیادہ دماغوں کا اجتماع کسی بھی فیصلے کو قرآن و سنت کے عین مطابق کرنے کا یہی مؤثر طریقہ ہے۔ قرآن و سنت کے عین مطابق فیصلہ ہو جائے تو نہ صرف یہی مطلوب ہے بلکہ وہ فیصلہ ہی بہترین ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ کسی بھی فیصلے کو بہترین ہی ہونا چاہیے۔ مشورہ کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ مشورے سے کوئی قدم اٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ خلیفہ عوام الناس کو اعتماد میں لے کر کوئی قدم اٹھاتا ہے۔ اس طرح سے فیصلہ عوامی ہو جاتا ہے نہ کہ فرد واحد کا۔ اس میں کیا شک کہ راعی و رعایا کے مابین اعتماد کی فضا قائم رکھنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔

قرآن کریم میں مشورے سے کام کرنے کا حکم جس انداز سے بیان ہوا ہے وہ خود بدرجہ اتم مشورے کی اہمیت و ضرورت کی غمازی کرتا ہے۔ قرآن مجید میں سلوٰۃ و زکوٰۃ کا ذکر اکثر و بیشتر اکٹھا آیا ہے۔ تاہم مشاورت کا حکم دیا گیا تو نماز اور انفاق فی سبیل اللہ کے معروف جوڑ کو تو ذکر مشاورت کے حکم کو ان دونوں کے درمیان رکھا گیا۔ ملاحظہ ہو قرآن اخروی زندگی میں انعامات پانے والوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا:

”جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں نماز قائم کرتے ہیں اپنے معاملات باہمی مشورے سے کرتے ہیں اور ہم نے جو رزق انہیں دیا ہے۔ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔“ (شوری 38)

متحدہ حدیث بھی مشورہ کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہیں۔ ایک موقع پر رسول ﷺ نے فرمایا:

”جب تمہارے حکام تم میں سے بہترین لوگ ہوں تمہارے والد راجی ہوں اور تمہارے معاملات آپس میں مشورہ سے طے ہوتے ہوں تو زمین کے اوپر تمہارے لئے رہنا بہتر ہے۔ اور جب تمہارے حکمران بدترین لوگ ہوں تمہارے والد راجیل ہوں اور تمہارے معاملات عورتوں کی خوشنودی کیلئے ہوں تو زمین کے اندر دفن ہو جانا تمہارے زندہ رہنے سے بہتر ہے۔“

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

”جو شخص کسی کام کا ردہ کرے اور باہم مشورہ کرنے کے بعد اس کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے صحیح اور مفید صورت کی طرف ہدایت مل جاتی ہے۔“ (نکتہ شعب الایمان)

اور تو اور خود رسول ﷺ کا عمل مشورہ لینے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ آپ ﷺ نے تین مشہور غزوات یعنی غزوہ بدر، غزوہ احد اور غزوہ احزاب کے موقعوں پر ایسے امور میں کہ جو تاریخ کا جو رخ متعین کرنے والے تھے صحابہ سے مشورہ لیا۔ مسئلہ انک میں بھی آپ نے مشورہ کیا۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب تمام صحابہ دل گرفتہ تھے آپ ﷺ نے اپنی بیوی حضرت ام سلمہؓ جو اس معرکہ میں آپ ﷺ کو ساتھ تھیں سے مشورہ کیا۔ مشورہ آپ ﷺ نے بہر حال انہیں امور میں لیا جو کار خلافت کے دائرہ میں آتے ہیں۔ غزوات و معابدات ایسے ہی معاملات ہیں۔

## مشورہ لیا جائے تو کیسے؟

جب قرآن و سنت کی رو سے مشورہ لینا اس قدر اہم ٹھہرا کہ بنا بریں نظام خلافت کو شورائی نظام سے موسوم کیا جاتا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلیفہ وقت مشورہ لے تو کس سے اور کیسے؟ آج کی دنیا میں مروجہ ہر نظام خواہ اشتراکیت ہو جمہوریت یا کوئی اور تین اجزاء ترکیبی انتظامیہ معتقد اور عدلیہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ یوں تو نظام خلافت بھی انہی تین اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے۔ لیکن جس طرح اسلام میں قانون سازی و حکمرانی کا تصور دوسرے تمام نظاموں سے یکسر مختلف جہاں طرح نظام خلافت کے یہ تین شعبے بھی منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ بقول شاعر۔

خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ﷺ باغی

اس وقت معتقد ہی ہمارے موضوع کے متعلق ہے لہذا ہم اس پر قدرے تفصیلاً روشنی ڈالتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا مشورہ لینا خلیفہ کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ عام روئین کے کاموں میں تو اسے مشورہ کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی لیکن اہم امور بالخصوص پالیسی امور میں لازم ہے کہ مشورہ لیا جائے۔ خلیفہ وقت نے سب سے پہلے اللہ و رسول ﷺ سے مشورہ لیا ہوتا ہے۔ اللہ و رسول ﷺ سے مشورے لینے کا مطلب قرآن و سنت سے رہنمائی لینا (To Consult) ہے۔ قرآن و سنت کی اس کام کے بارے میں کہ جس کے متعلق مشورہ درکار ہو اگر کوئی واضح نص مل جائے تو پھر خلیفہ وقت کو مزید کسی مشورے کی ضرورت نہیں اللہ کے بحرو سے پر وہ منصوص راستہ اختیار کرنے کا پابند ہے اور بس۔ بصورت دیگر یعنی اگر قرآن و سنت سے کوئی واضح نص نہ ملے تو پھر قرآن و سنت ہی کے ایک دوسرے ضابطے کے مطابق ایک ایسے ادارے سے مشورہ لینا ہوتا ہے کہ جس کا نام ہی "شورئی" ہے۔ شورئی ایک قسم کی پارلیمنٹ ہی ہوتی ہے البتہ اس استخفاء کے ساتھ کہ مخصوص کام کے لئے ہی اور مخصوص کام کیلئے ہی اور مخصوص مینٹ و ترکیب کی حامل۔ اصل میں تو خلیفہ وقت نے مشورہ امت سے لینا ہوتا ہے لیکن امت کے قائم مقام شورئی ہوتی ہے اس بنا پر کہ اس کا ہر رکن کسی نہ کسی عوامی حلقہ سے قرآنی معیار اہلیت کی بنا پر منتخب ہو کر آیا ہوتا ہے۔ شورئی کا اصل کام بلکہ ایک ہی کام، جیسا کہ اس کے نام سے عیاں ہے بس خلیفہ وقت کو قرآن و سنت سے استنباط کر کے مطلوبہ امور میں مشورہ دینا ہوتا ہے۔

خلیفہ وقت کا نصب و عزل بھی چونکہ مشورہ سے عمل میں آتا ہے لہذا یہ بھی شوری کے دائرہ کار میں آتا ہے۔ مشورہ دینے کا یہ عمل ذیلی قانون سازی میں آتا ہے اور یہی وہ ذیلی قانون سازی ہے جس کی نظام خلافت اجازت دیتا ہے۔

اکثر و بیشتر یہ ذیلی قانون سازی عارضی اور وقتی ضرورت کو پورا کرتی ہے اور تبدیلی حالات کے ساتھ اس قانون سازی میں تبدیلی بھی ہو سکتی ہے۔ اسی ذیلی قانون سازی کا اصطلاحی نام "اجتہاد" ہے۔ سیکولر نظاموں میں دو ایوانوں کی ضرورت اس لئے پڑتی ہے کہ ایک ایوان اگر عوام الناس کی پوری نمائندگی کرنے سے قاصر رہے تو دوسرا ایوان اس کی کوپرا کر دے۔ مثال کے طور پر ہمارے ہاں کی پارلیمنٹ دو ایوانوں یعنی قومی اسمبلی اور سینیٹ پر مشتمل ہے۔ قومی اسمبلی میں منتخب ارکان کی تعداد چونکہ آبادی کے تناسب سے ہوتی ہے لہذا مختلف صوبوں سے منتخب ارکان کی تعداد مختلف ہوتی ہے۔ جو صوبہ بڑا ہوتا ہے اس سے آمدہ ارکان کی تعداد زیادہ ہوتی ہے بہ نسبت اس صوبہ کے کہ جس کی آبادی کم ہو۔ ایسے میں امکان ہوتا ہے کہ قانون سازی اس صوبے کے حق میں ہو جائے کہ جس کے ارکان کی تعداد زیادہ ہے۔ اسی کی کوپرا کرنے کیلئے سینیٹ کا دوسرا ایوان ہے جس میں ہر صوبے سے آمدہ ارکان کی تعداد برابر ہوتی ہے۔ کوئی تحریک قانونی حیثیت اختیار نہیں کر پاتی جب تک دونوں ایوان اسے پاس نہ کر دیں اور بالآخر صدر مملکت کی منظوری حاصل نہ ہو جائے۔ نظام خلافت میں ذیلی قانون سازی چونکہ قرآن و سنت کی پابندی ہے لہذا اس کا امکان ہی نہیں کہ کسی صوبے علاقے یا طبقہ وغیرہ کی حق تلفی ہو۔ لہذا یہ دو ایوانوں کی عیاشی نظام خلافت کے احاطہ میں نہیں آتی۔

جس طرح نظام خلافت دو ایوانوں کی عیاشی سے مبرا ہے اسی طرح وہ اس بے اعتدالی و عیاشی کو بھی گوارا نہیں کرتا کہ ایک ہی وقت مسلمانوں کے دوسرے اہان ہوں..... ایک سربراہ حکومت اور دوسرا سربراہ مملکت۔ خلیفہ المسلمین سربراہ مملکت بھی ہوتا ہے تو سربراہ حکومت بھی..... یاد رہے خلیفہ وقت کی اطاعت اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت سے مشروط ہی سہی قائم مقام ہوتی ہے۔ بناء پر یہ اطاعت مع و اطاعت کی حامل ہوتی ہے محض فرمانبرداری نہیں۔ یعنی ایک تو بے چون و چرا ہوتی ہے اور دوسرے فیصلہ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت کو صدق دل سے قبول کرنا ہوتا ہے ہر شخص کے شانہ تک کا کوئی سوال نہیں۔ یہ

ایسی اطاعت ایک ہی سربراہ کی ممکن ہے دوہوتے ہی فیصلوں میں نہ وہ یکسوئی رہتی ہے اور نہ وہ مضبوطی جو نظام خلافت کا طرہ امتیاز ہے۔ خلیفہ وقت اسی طرح وقت کا امام ہوتا ہے جیسے کہ نماز میں پیش امام بلکہ امام نماز کی امامت امامت صغریٰ ہے تو خلیفہ وقت کی امامت امامت کبریٰ۔ نظام سلوٹ میں دو امام نہیں ہو سکتے تو نظام خلافت میں دوسرا ہوں کا کیا سوال؟

شورنی کا مشورہ (شورنی سے کی گئی ذیلی قانون سازی یا اجتہاد) اکثر و بیشتر متفقہ ہی ہوتا ہے اس لئے کہ قرآن و سنت کی روشنی میں کیا گیا ہوتا ہے لیکن اس کا امکان بہر حال ہوتا ہے کہ کچھ ارکان کا اجتہاد دوسروں سے مختلف ہو۔ ایسے میں خلیفہ وقت نے اکثر و بیشتر اکثریتی ارکان کے مشورہ کو ہی بروئے کار لانا ہوتا ہے لیکن یہ ضروری بھی نہیں۔ نظام خلافت میں نہ اکثریت فی نفسہ دلیل صحت و صواب ہے اور نہ اقلیت دلیل خطا۔ خلیفہ وقت کی اپنی رائے اگر اقلیت کے مشورہ کے مطابق ہو تو وہ اقلیت کے اجتہاد کو ہی بروئے کار لائے گا خواہ یہ اقلیت ایک رکس شورنی پر ہی بلکہ تبا خلیفہ کی رائے پر ہی مشتمل ہو۔ خلیفہ کے لئے اصل فیصلہ کن یہ امر ہوتا ہے کہ وہ کس مشورے کو قرآن و سنت کے قریب سمجھتا ہے؟

نظام خلافت میں اصل بیرونی توازی و وادی دستور یعنی قرآن و سنت کی ہے لہذا اگر کوئی مشورہ اقلیت کی طرف سے ہی سہی جب قرآن و سنت کے قریب تر محسوس ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ خلیفہ وقت ایسے مشورے سے صرف نظر کرے۔ خود نبی کریم ﷺ نے ایک صحابی کے مشورہ پر بھی عمل کیا جیسا کہ غزوہ احزاب کے موقع پر، چند اصحاب کے مشورے پر بھی چلے جیسے کہ غزوہ احد کے موقع پر اور تمام موجود اصحاب کے مشورہ کو رد بھی کر دیا، جیسے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر۔ انھیں زکوٰۃ اور لشکر اسلامہ بن زید کے متعلق اکثر و بیشتر صحابہ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ کی رائے خلیفہ اول کی رائے سے مختلف تھی لیکن وقت نے بالآخر حضرت ابو بکر صدیقؓ کے فیصلوں کی تصدیق کر دی کہ وہ قرآن و سنت کے عین مطابق تھے۔

اس بحث سے نتیجہ نکلا تو یہی کہ خلیفہ وقت مشورہ لینے کا پابند ہے مشورے پر من و عن عمل کرنے کا پابند نہیں۔ خلیفہ وقت کو اسی مشورے کو بروئے کار لانا چاہیے کہ جس پر اس کا دل ٹھک جائے کہ وہ قرآن و سنت کے قریب تر ہے نہ کہ کو پھر اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ خود نبی کریم ﷺ کا نکتہ کو جب مشورہ لینے کا پابند



کیا گیا تو وہیں یہ بھی صراحت کر دی گئی کہ گوگم کی پالیسی اختیار نہیں کرنی۔ اس مشورے پر فی الفور عمل پیرا ہو جانا چاہیے جس پر دل گواہی دے کہ وہ فیصلہ رضائے الہی کے مطابق ہے۔

نظام خلافت میں یہ خلیفہ وقت کا اکثریت کے فیصلے کے مطابق عمل نہ کرنا بلکہ بعض اوقات پوری شورائی کے فیصلے کو ٹھکرا دینا بظاہر بڑا پرخطر محسوس ہوتا ہے۔ لیکن اگر اسے اس نظام اقتساب کے تناظر میں دیکھا جائے کہ جو اسلام کا طرہ امتیاز ہے تو خلیفہ وقت کا اس قدر مقتدر ہو جانا کہ وہ پوری شورائی کے فیصلے کو ٹھکرا دے پر خطر نہیں بلکہ عین سعادت ہے۔ نظام خلافت اس قدر متوازن و تناسب نظام ہے کہ خلیفہ المسلمین ہمہ وقت دودھاری تلواریں زد میں ہوتا ہے۔ ایک طرف تو ایک دن اسے اپنے رب کے حضور پیش ہو کر اپنے ایک ایک عمل کی جوابدہی کرنی ہے۔ دوسری طرف وہ شورائی کی عین گرفت میں ہوتا ہے۔ شورائی اگر محسوس کرے کہ خلیفہ وقت کسی معاملہ میں خود سری سے کام لیتا ہے تو وہ اسے یک قلم معزول کر سکتی ہے۔ شورائی کو کلی اختیار حاصل ہے کہ وہ ضروری سمجھے تو میر کارواں کو گڑ کارواں بنا دے۔

خلیفہ وقت ویسے ہی اس کردار کا حامل ہوتا ہے کہ اس کا خود سری یا مطلق اعلان ہو جانا بعید القیاس ہے۔ خلیفہ المسلمین نہ صرف اولی الامر کا حصہ ہوتا ہے بلکہ اولی الامر میں اس کی حیثیت گل سرسبد کی ہوتی ہے۔ اولی الامر کا ہر رکن خواہ اس کا تعلق انتظامیہ سے ہو شورائی سے یا عدلیہ سے قرآنی معیار اہلیت کی چیلنجی سے گزر کر آیا ہوتا ہے۔ آیا ہی نہیں ہوتا بلکہ لایا ہوتا ہے اس لئے کہ اسلام میں کوئی خود کو نہ کسی عہدے کے لئے پیش کر سکتا ہے اور نہ ہی اپنے حق میں کنوینینک کر سکتا ہے۔ پھر خلیفہ وقت تو ان تمام میں بلکہ پوری امت میں صلح ہوتا ہے۔ تاریخ معدودے چند افراد ہی ایسے پیدا کر سکی ہے جو خلفائے راشدین کے کردار و معیار پر پورے اترتے ہوں۔

اولی الامر کے معیار اہلیت کی اہمیت کے پیش نظر خود قرآن میں اسے طے کر دیا گیا ہے۔ قرآنی معیار اہلیت پانچ اوصاف (Qualities) ایمان (نور: 55) تقویٰ (ہجرات: 13) صلاح (نور: 55) علم اور جسم (بقرہ: 247) پر مشتمل ہے۔ شورائی بھی چونکہ اولی الامر کا حصہ ہوتی ہے بنا بریں اس قرآنی معیار اہلیت پر پورا اترنے پر ہی کسی کو رکن شورائی بننے کا عزاز حاصل ہوتا ہے۔ قرآنی معیار اہلیت میں

سے اس وقت صفتِ جسم ہمارے موضوع کے متعلق ہے۔ لازم ہے کہ رکنِ شوریٰ جسمانی و ذہنی لحاظ سے توانا و صحت مند ہو۔ معذور کمزور بوزھا عورت وغیرہ اسی طرح رکنِ شوریٰ بننے کے اہل ہوتے ہیں جس طرح کہ خلیفۃ المسلمین بننے کے۔

شاید کوئی معترض ہو کہ جب عورت رکنِ شوریٰ نہیں بن سکتی تو اس طرح سے آدمی انسانیت کو کیا حق مشورہ سے محروم نہیں کر دیا گیا؟ اسلام دس فطرت ہے اور وہ عورت کو مشورے سے محروم کرنے کا سوت بھی نہیں سکتا۔ وہ ایسے معاملے میں کہ جو عورت کے متعلق بھی ہو عورت سے مشورہ کرنا لازم قرار دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں آیا:

"اگر فریقین (مرد و عورت) باہمی رضا مندی اور مشورے سے بچے کا دودھ چھڑا چاہیں تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں"۔ (بقرہ: 233)

یعنی نظامِ خلافت عورت سے مشورہ لینے کو تو لازم قرار دیتا ہے لیکن ایوانِ شوریٰ میں مردوں کے برابر بٹھا کر نہیں بلکہ کسی بھی ایسے طریقے سے کہ جہاں مردوں کے شانہ بٹانہ بیٹھنے کی نوبت نہ آئے۔ اوپر ذکر ہوا کہ خود رسول ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر اپنی زوجہ محترمہؓ سے مشورہ کیا۔ البتہ بیوی سے مشورہ کسی مجلس میں نہیں عین خیمہ کے اندر کیا گیا۔ یہ بات زور سے کہنے کی ہے کہ اسلام میں محوطہ محفل یا محوطہ شوریٰ کا کوئی تصور نہیں۔ عورت کو مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنے کو فرض قرار نہیں دیا گیا۔ البتہ اجازت دی گئی تو اس کڑی شرط کے ساتھ کہ اگر امام سے کوئی بھول چوک ہو جائے تو وہ اشارے کنائے سے تو مطلع کر سکتی ہے زبان سے نہیں۔ ظاہر ہے جب مسجد میں اور عینِ حاجت نماز میں جب کہ للہیت کا ماحول اپنے عروج پر ہوتا ہے عورت کو زبان کھولنے کی اجازت نہیں تو کسی شوریٰ میں مردوں کے شانہ بٹانہ بیٹھ کر وہ آواز کا جادو کیسے جگا سکتی ہے؟ ایسا اگر وہ کرتی ہے یا اس نظام کا حصہ بنتی ہے کہ جو ایسا کروانا ہے تو ظاہر ہے وہ خود بھی باغیانہ روش اختیار کرتی ہے اور ایسا نظام بھی باغیانہ روش پر مبنی ہوتا ہے۔

ایسے امور میں کہ جو عورتوں کے متعلق ہوں جب عورتوں سے مشورہ لینا ضروری ٹھہرا تو اس کی ایک صورت جسے ترجیح کا درجہ حاصل ہے یہی ہے کہ ہر رکنِ شوریٰ آگے مشورہ دینے سے پہلے اپنے ہاں اپنی اہلیہ

ماں بہن بیٹی سے لازماً مشورہ کرے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ خواتین کی اپنی شورنی علیحدہ ہو جو اپنے اجتماعی مشورے کو خلیفہ تک پہنچائے اور یہی وہ صورت ہے جو اسلام میں دوسری شورنی کی گنجائش پیدا کرتا ہے۔ البتہ جیسے کہ عورت کا گھر میں نماز پڑھنا مسجد کی نماز پر ترجیح رکھتا ہے اسی طرح عورت سے اس کی سلطنت یعنی گھر میں جہاں پرکہ وہ داخل ہوتی ہے مشورہ ایسا ترجیحی حیثیت کا حامل ہے۔

ایک بہت بڑی ذمہ داری کہ جس کیلئے مشورہ کی اشد ضرورت ہوتی ہے انعقادِ خلافت کا مسئلہ ہے۔ شورائی نظام میں خلیفہ کا انتخاب مشورہ ہی سے ہونا لازمی ہے کسی خاندانی و جغرافیائی بنیاد پر نہیں۔ البتہ یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ مشاورت کا یہ کام شورنی ہی کے فرائض میں شامل ہے۔ مدت کے ہر ہر فرد سے مشورہ نہیں لیا جائے گا۔ شریعت کی رو سے منصبِ خلافت تین دن سے زائد خالی نہیں رکھا جاسکتا۔ تین دن کے اندر اندر یہ کام بھی سرانجام پاسکتا ہے کہ محض یہ کام شورنی کی صوابدید پر ہو۔ اگر امت کے ہر فرد سے مشورہ (بیعت یا ووٹ) لینے کا راستہ اختیار کیا جائے تو تین دن کیا تین مہینوں میں بھی یہ کام مکمل نہیں ہو پاتا۔ شورنی جب یہ کام سرانجام دیتی ہے تو اصل میں پوری امت کی نمائندگی ہو جاتی ہے کیونکہ شورنی پوری امت ہی کی نمائندہ ہوتی ہے۔ شورنی البتہ اپنے میں سے بھی کسی رکن کو خلیفہ چن سکتی ہے اور ارکان انتظامیہ (گورنر، وزراء وغیرہ) اور عدلیہ سے بھی۔ بعد ہر فاساسی کو پر کیا جائے گا کہ جہاں کارکن خلیفہ چنا گیا ہو۔ یہ بھی ہے کہ اسلام میں منصبِ خلافت تین صورتوں میں خالی ہوتا ہے ورنہ نایک دفعہ کا چنا ہوا خلیفہ حیاتِ قائم و دائم رہے گا یہ تین پانچ سال وغیرہ کے بعد انتخابات کا تصور اسلامی نہیں۔ خلیفہ کے بنائے جانے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ وہ خود معذرت کر لے دوسرے موت کی صورت میں اور تیسرے قرآنی معیارِ اہلیت میں فرق آنے سے (انعقادِ خلافت کے سلسلہ میں مزید تفصیلات کے لئے ہماری دوسری تصنیف "آئیں نظام بدلیں" سے استفادہ کریں)۔

## حرفِ آخر

نظامِ خلافت ایک شورائی نظام ہے۔ جس طرح خلیفہ خود مشاورت سے ہی منصبِ خلافت پر نصب کیا جاتا ہے اسی طرح لازم ہے بلکہ اس کے فرائض منصبی میں شامل ہے کہ امور مملکت شورنی کے مشورے سے

سرا انجام دے۔ یعنی ایک طرف خلیفہ وقت احکامات قرآن و سنت کا پابند ہے تو دوسری طرف قرآن و سنت کے واضح حکم کی عدم موجودگی میں یا کسی شرعی نص کی تشریح و وضاحت کیلئے وہ شورنی سے مشورہ کا پابند ہے۔ روز مرہ کے امور کو کہ جن کے بارے میں پہلے سے ہدایات موجود ہوں وہ معمول کے مطابق سرا انجام دے سکتا ہے لیکن پالیسی اور غیر معمولی نوعیت کے معاملات میں وکیلیت شورنی سے مشورے لینے کا پابند ہے۔ انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ایسے امور جو زیادہ افراد کے متعلق ہوں متعلقہ افراد کے مشورہ سے طے ہوں۔ اس فطری تقاضے کو پورا کرنا ہے تو وہ نظام کہ جس کا نام ہے..... نظام خلافت۔

## خلافت کا نظامِ عفت و عصمت

اسلام میں عفت و عصمت اور شرم و حیا کی اہمیت کو محمد صادق علیہ السلام نے چند الفاظ میں بیان فرمایا تو اس طرح کہ ”انہیاء لایاتی الا بخیر“ (بخاری و مسلم) یعنی حیا، انسانی اوصاف میں سے وہ صفت ہے کہ جو صرف بھلائی لاتی ہے۔ عصمت کے مقام و قدر کا اس سے بھی اندازہ لگائیں کہ کسی آدمی کے پاس اگر دولت کے انبار ہوں اور اس پر کوئی وقت ایسا آجائے کہ اس کی جان صرف ایک ہی صورت میں بچ سکتی ہو کہ وہ اپنی تمام دولت لٹا دے تو جان بچانے کی خاطر وہ تمام دولت داؤ پر لگانے میں غنیمت سمجھے گا۔ البتہ اس کے سامنے اگر کوئی شر پسند اس کی عصمت پامال کرنے کی جسارت کرے تو پھر وہ جیتے جی ایسا نہیں ہونے دے گا اور جان تک کی بازی لگا دے گا۔

تاریخ انسانی میں عورت ان موضوعات میں سے ایک اہم موضوع رہی ہے کہ جنہیں زیادہ سے زیادہ زیر بحث لایا گیا ہے۔ عفت و عصمت کی قدر و قیمت کسی بھی تمدن میں بہر حال براہ راست اس سے مطلق رہی ہے کہ عورت کو وہاں پر کیا مقام دیا گیا ہے۔ عورت کا مقام جتنا کسی معاشرے میں ارفع و اعلیٰ ہوا عفت و عصمت کی اتنی ہی زیادہ قدر کی گئی اور اس کے برعکس جتنی پجاری عورت بے قدر ہوئی اتنی ہی بے قدر عفت و عصمت ٹھہری۔ قدیم ادوار میں جب اکثر معاشروں میں جنگل کا قانون کہ جس کی لاشی اس کی بھینس رواں دواں تھا تو جتنے مظالم عورت پر ہوئے شاید ہی کسی اور معاشرے میں ہوئے ہوں۔ مرد کو بھی دونوں انتہاؤں یعنی غلام اور آقا بنایا گیا لیکن کبھی بھی اسے اتنی گراؤت اور ذلت سے واسطہ نہ پڑا جتنا کہ عورت کو۔ انسانی سطح پر وقار و مرتبہ کی نشانی ایک ہی ہے کہ کسی کو جائیداد میں حصہ ملے یا یا الفاظ دیگر وہ مشکل گھڑی میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی استعداد رکھتا ہو۔ عورت کو جائیداد میں حصہ تو کیا خود اثاثوں کا حصہ بنا لئے رکھا گیا۔ زیر آسمان اسے بچا گیا، خرید گیا، بانٹا گیا، منتقل کیا گیا حتیٰ کہ ذریعہ آمدن اور کاروبار کا وسیلہ بنایا گیا۔ متضاد مقام دیا گیا تو اس قدر کہ کبھی اسے مذہبی عہدوں پر متمکن کیا گیا تو کبھی اسے اس قدر گھٹیا اور ناپاک گردانا گیا کہ اسے مذہبی

رسومات ادا کرنے کے قابل نہ سمجھا گیا۔ انسانی تاریخ شاہد ہے کہ 99 فیصد معاشروں میں لڑکی کی پیدائش کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھا گیا۔ مقامِ افسوس تو یہ کہ لڑکی کی پیدائش نہ چاہنے والوں میں خود غورت ہی پیش پیش رہی ہے۔ نوبت بایں رسید کہ بیٹیوں کو اسی دھرتی پر زندہ درگور بھی کیا جاتا رہا۔ بطور عورت مظلومیت، مروعیت اور محرومیت تو ہر صورت اس کا مقدر رہا لیکن رو گھٹنے کھڑے ہو جاتے ہیں اس سلوک کا محض تصور کرتے ہوئے کہ جو اسے بطور بیوہ ملا۔ اکثر لادینی معاشروں میں اس کا دوبارہ شادی کرنا ممنوع قرار دیا گیا۔ بیوہ ہوتے ہوئے صاف سحرار بنے، جھکے کپڑے پہنے اور عمدگی کی زندگی گزارنے کو بے غیرتی و بے حیائی تصور کیا گیا۔ دل خون کے آنسو روتا ہے اور قلم یہ لکھنے سے لڑکھڑاتا ہے کہ ایسے معاشرے بھی اس دنیا میں رہے ہیں کہ جنہوں نے بیوہ کے حق زیست ہی کو چھین لیا اور چیختی چلاتی بیوہ کو مرنے والے خاوند کے ساتھ ہی شعلوں کی نذر کر دیا۔

جورو جفا اور مظالم کی یہ داستان تو بہت طویل لیکن جو زیادتی آج کے دور جدید میں اس پر ڈھائی گئی، گزشتہ تمام مظالم پر بازی لے گئی۔ اسے سب سے بڑا دھچکا لگا تو اس وقت جب اسے اس کی طاقت یعنی اولاد اور اس کی مملکت یعنی گھر سے محروم کر دیا گیا۔ بطور آئینہ مغربی دنیا آج ہمارے سامنے ہے۔ نعرہ مساوات مرد و زن کی آڑ میں بستیاں ویران، گھر اس دن سرگرداں، راتیں بیزار غریبہ ہو کا عالم۔ بظاہر بڑی چمک دمک لیکن آنکھوں کو خیرہ کرنے والے معاشرے اندر سے یوں جیسے زندہ درگور۔ کسی گھر چلے جائیں، اولاد معدوم، کتوں اور بلیوں نے ڈیرے آجائے۔ لان میں کتے، مچھن میں کتے، بچن میں کتے، بیڈروم بلکہ عین بیڈروم میں کتے۔ صبح نختے ہی جیسے مشین کے پرزے میاں اپنے کام پر سدھار جاتا ہے تو بیوی اپنی راہ لیتی ہے۔ گھر کی چابی ہر ایک کے پاس جو پہلے آگیا، کھول لے۔ دوسرے کا انتظار بھی فضول شاید رات کہیں باہر ہی گزار دے۔ جو آگیا دکان سے لائے ہوئے برگر کھائے اور سو رہے۔

شادی نے بھی بچتے ہیں، شہنایاں بھی کھٹکتی ہیں، ڈانس بھی ہوتا ہے لیکن یہ سب کچھ ہوتا ہے تو گلیوں بلکہ مائٹ گلیوں میں گھروں میں ایسی وسوگ کے سوا کچھ نہیں۔ مغربی عورت خود دھوکے میں پڑ گئی۔ آزادی حاصل کرنے کی دوڑ میں نکلے نہ گھر کی رہی نہ گھاٹ کی۔ گھر گیا، اولاد گئی، بسا اوقات خاوند بھی آنکھیں چرا گیا۔ صدارتی ایوان تک یوں جیسے چمکے۔ خون جوان ہوتا ہے تو شمع محفل بنی رہتی ہے، ادھیڑ عمر ہوتے ہی لپکتی ہے

سکیوں اور آہوں کی طرف دلا سادے تو کون؟ کدھے سے کدھا ملا کر چلنے کی عیث دوڑ میں اپنا مقام کھویا تو عفت و عصمت کا کیا سوال مغربی عورت سر بازار لٹ گئی۔ نظام خلافت اسی انمول نسوانی جوہر..... عفت و عصمت کی آخری حدود تک حفاظت کرنا ہے آئیں دیکھیں کیسے؟

### اسلام کا نظام عفت و عصمت

کوئی نظام کوئی منظم معاشرہ معرض وجود میں نہیں آ سکتا جب تک کہ خود انسانی زندگی کو منظم و منضبط نہ کیا جائے۔ ظاہر ہے عفت و عصمت کا دار و مدار کسی ایک صنف کے کردار پر نہیں۔ بنا بریں اسلام مرد و زن دونوں کی معاشرت کو اس طور منظم کرتا ہے کہ کوئی بھی غیر جانبدار شخص اس کی خوبیوں کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک بات شروع میں نوٹ کر لیں کہ نظم جہاں بھی ہوگا ظاہر ہے کچھ پابندیوں کے نتیجے کے طور پر ہی ہوگا۔ پابندیوں کو کوئی احسن اگر رکاوٹیں تصور کر بیٹھے تو اس کی حماقت و رند مزک کے کنارے لگائے گئے اشارات ظاہر ہے کسی کا سفر کھٹا کرنے کے لئے نہیں مسافروں کے بحفاظت منزل مقصود پر پہنچنے کے لئے ہوتے ہیں۔ نظام خلافت محیط عفت و عصمت کے بارے میں جو تدابیر اختیار کرتا ہے ہم انہیں تین عنوانات یعنی عمومی اصلاحی اپروچ، انسدادی و احتیاطی تدابیر اور قانونی و انضباطی تدابیر کے تحت زیر بحث لاتے ہیں۔

### عمومی اصلاحی اپروچ

انسانی زندگی انفرادی سطح کی ہو یا اجتماعی جمعی منظم و منضبط ہو سکتی ہے جب کسی قانون و ضابطہ کی پابندی کی جائے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسا قانون اور کس کا دیا ہوا؟ اسلام سب سے پہلے اسی سوال کا جواب دیتا ہے۔ پھر وہ اس سوال کا بھی ساتھ ہی جواب ڈھونڈتا ہے کہ اگر کوئی قانون کی پابندی نہ کرے تو اس کا حساب کیسے ہو؟ ہم ان سوالات کے جوابات قدرے تفصیل سے زیر بحث لاتے ہیں اس لئے کہ ان دونوں سوالات کے جوابات پر انسان کی اصلاحی و اخلاقی زندگی کا دار و مدار ہے۔ درج ذیل تین میں سے کوئی ایک اتھارٹی قانون سازی کی سزا و قرار دی جاسکتی ہے اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ ان میں کون اس معیار پر پوری اترتی ہے کہ جو قانون ساز کے لئے از بس ضروری ہے۔

☆ ہر انسان اپنا خود کا قانون ساز ہو۔

☆ اس کے لئے کوئی دوسرا فرد یا ادارہ قانون سازی کرے۔

☆ ماورائے انسان کوئی بالائی طاقت قانون ساز ہو۔

تین ہی وہ صفات یا شرائط ہیں کہ جو فیصلہ کن ہیں کہ مندرجہ بالا تین میں سے کسے قانون سازی سزاوار ہے۔ پہلی صفت جو ایک قانون ساز میں ہونی چاہئے یہ ہے کہ اس کا علم مکمل، بھرپور اور بے نقص ہو۔ وہ پوری کائنات کی نہ صرف ترکیب و ترتیب سے واقف ہو بلکہ یہ بھی جانتا ہو کہ یہ کائنات کیسے اور کس لئے وجود میں لائی گئی اور اس کا انجام کیا ہے؟ پھر قانون ساز کو مکمل علم ہو کہ کائنات میں ذرائع و وسائل کتنے ہیں اور ان کی نوعیت کیا ہے؟ ایسا نہ ہو کہ وہ مثال کے طور پر آج خاندانی منصوبہ بندی کے لئے کوئی ضابطہ بنائے اور کل کو مزید وسائل کی دریافت اس ضابطے کا مذاق اڑائے۔ پھر قانون ساز انسانی فطرت سے کما حقہ آگاہ ہو۔ انسان کے دل کے کسی کونے میں جہنم لینے والی خواہش تک سے واقف ہو۔ وہ ”عالم الغیب والاشہادۃ“ ہو، اسے تجربات کر کے دیکھنے کی ضرورت نہ ہو۔ رات کی تاریکی میں قانون شکنی کرنے والا ہر آنکھ سے چھپ جائے تو چھپ جائے قانون ساز سے بہر حال نہ چھپ سکے۔ کروڑوں انسان مل کر بھی اگر کوئی گناہ یا نیکی کا کام کریں تو قانون ساز جانتا ہو کہ کس کا اس نیکی یا گناہ میں کتنا حصہ ہے؟

دوسری بڑی شرط جو سزاوار قانون سازی کے لئے ضروری ہے یہ ہے کہ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہو۔ وہ جلدیر ہو، عزیز ہو، قوی ہو۔ زندگی و موت اس کے ہاتھ میں ہو۔ وہ کسی کو فائدہ دینا چاہے تو کوئی روکنے والا نہ ہو اور کسی کی گرفت کرنا چاہے تو کوئی چھڑانہ سکے۔ وہ اولنا آخر بلکہ یہ اول و آخر بھی قانون ساز کے لئے نہیں اس کی نسبت سے ہو کہ جس کے لیے قانون بنایا جانا مطلوب ہو۔ وہ ہر لمحہ ہر گھڑی ہر جگہ موجود ہو۔ کوئی پتہ ملے تو اس کے اذن سے کوئی پرندہ جو پر واز ہو تو اس کی مرضی سے اور کوئی مچھلی تیرے تو اس کے حکم و ایما پر۔ نیل و نہار، شمس و قمر، شجر و حجر پر قابض ہو تو وہی اور موسموں کا تغیر، حادثات کا واقع ہونا، بجلی کی چمک، باد کی کڑک، دھوپ چھاؤں وغیرہ نہ صرف اس کی سکیم کی تکمیل میں ہوں بلکہ ان تمام کا مصور و محرک ہو تو وہی۔ ”کن فیکون“ صرف اسی کا اعزاز ہو۔



ایک اور صفت جس کا قانون ساز کیلئے حامل ہونا ضروری ہے یہ ہے کہ وہ غیر جانبدار ہو۔ اس کا تعلق کسی خاندان، کنبے، طبقے، معاشرے، قوم، ملک وغیرہ سے نہ ہو۔ اس کا کوئی رشتے دار حتیٰ کہ بیوی بچے بھی نہ ہوں۔ اس کا کوئی پیشہ نہ ہو۔ اخلاقی بنیاد کے بغیر اس کی ہمدردیاں کسی کے ساتھ نہ ہوں حتیٰ کہ جو اسے قانون ساز تسلیم نہ کرے وہ اس کے لئے بھی غیر جانبدار نہ رویہ رکھے۔ سب اس کے محتاج ہوں وہ کسی کا محتاج نہ ہو۔ وہ حقوق نہ ہو بلکہ ہر شے کا خالق ہو۔ غیر جانبدار ہو تو اس حد تک کہ اسے غصہ اور جذبات تک مطلوب نہ کر سکیں۔ غور فرمائیں تو مذکور بالا تین ممکنہ قانون سازوں میں سے آخری..... اور اے انسان کوئی بالائی طاقت یعنی اللہ تعالیٰ ان شرائط پر کما حقہ پورا اترتا ہے۔ لہذا اسے ہی قانون سازی سزاوار ہے۔ یہی آیا قرآن میں ”ما یأمرنا“ ”ان احکم الا اللہ“ ”فصر ف اسی بنیاد پر ہی قانون سازی کا اہل نہیں کہ وہ نہ عظیم ہے نہ قدیر اور نہ غیر جانبدار بلکہ اس بنیاد پر بھی کہ اگر ہر آدمی اپنا قانون خود بنائے تو دنیا میں اتنے قانون ساز ہوں گے جتنے کہ انسان۔ ایسے میں کوئی معاشرہ تمدن وجود میں آئی نہیں سکتا۔ کوئی دوسرا فرد یا ادارہ بھی نہ صرف اس لئے ہی قانون سازی کے لئے مائل قرار پاتا ہے کہ وہ مندرجہ بالا تینوں شرائط پوری نہیں کرتا بلکہ اس لئے بھی کہ تاریخ انسانی شاہد دنیا میں ہر خرابی کی جزا انسان کا انسانوں کے لئے قانون ساز ہونا ہے۔

جب یہ طے ہو گیا کہ قانون سازی صرف اللہ تعالیٰ کو ہی سزاوار ہے تو یہ مسئلہ بھی خود بخود حل ہو گیا کہ محتسب کون ہو؟ قانون کی پیروی کرنے والے کو انعام دے گا تو اللہ تعالیٰ اور قانون ممکن کو گرفت میں لائے گا تو اللہ تعالیٰ۔ اپنی احتسابی سکیم کی تکمیل کے لئے اس نے انسانی زندگی کو دو ادوار میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک دور اس دنیا کی زندگی پر محیط ہے اور موت پر ختم ہو جاتا ہے جبکہ دوسرا دور آخرت کا ہے۔ پہلا دور دارالعمل کا ہے تو دوسرا دور حساب و کتاب اور جزا و سزا کا۔ اس دنیا میں آنے والے ہر فرد دعوت ہو یا مرد کے اعمال کو بڑی احتیاط اور صحت کے ساتھ ریکارڈ کیا جا رہا ہے اور اس ریکارڈ کی بنیاد پر آخرت میں متعلقہ فرد جزا یا سزا اور جنت یا دوزخ میں داخلے کا مستحق قرار پائے گا۔ بالفاظ دیگر مرنے پر کوئی بھی شخص محض زندگی کے ایک دور سے دوسرے دور میں منتقل ہوتا ہے معدوم نہیں ہوتا۔ اس دنیا میں اسے کما ہے تو آخرت میں اپنے کئے کا انجام وصول کرنا ہے۔

اسلام کا یہ عمومی اصلاحی پروگرام ہر مسلمان کے دل میں ہمہ وقت کی ایک پولیس چوکی قائم کر دیتا ہے۔ خود احتسابی کا یہ عمل جو قرآن کی زبان میں تقویٰ کہلاتا ہے ہر قدم پر پہلے واقع ہونا ہے تو ایسی احتسابی کا عمل آخر میں۔ یعنی جواب دی کا احساس یا تقویٰ وہ معیار ہے جس سے اللہ تعالیٰ کسی شخص کے انفعلاً یا اہتر ہونے کو مانتا ہے۔ یہ محکم بنیاد فرام کر کے اسلام مزید آگے بڑھتا ہے۔

### انسدادی و احتیاطی تدابیر

معاملے کی اہمیت کے پیش نظر نظام خلافت نے کم ہی کسی اور دائرہ کار کے متعلق اتنی ہدایات دی ہوں کہ جتنی تحفظ عفت و عصمت کے بارے میں۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا عورت جتنی کسی معاشرے میں بے قدر ہو گئی عفت و عصمت کی اتنی ہی زیادہ بادی ہو گئی۔ اسلام نے اسی مرکزی نقطے کو مد نظر رکھ کر مقام عورت کو بالا و مستحکم کیا ہے تو اس حد تک کہ وہ جو کبھی خود ماثوں میں منقسم ہوتی تھی وراثت میں حصہ دار بن گئی۔ تاریخ انسانی میں تبدیلی کا یہ وہ نقطہ عروج ہے کہ جس نے انسانی آبادی کے نصف کو یک قلم تحت لائسنس سے اٹھا کر اوپن ٹریا پر بٹھا دیا۔ قرآن میں آیا:

”مردوں کے لئے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہے اور عورتوں کے لئے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہے۔ مال تھوڑا ہو یا بہت حصہ ہے مقرر“ (النساء: 7)۔

چند لحاظ پر مشتمل اس ضابطہ لائسنس نے عورت کی کاپی ہی پلٹ دی۔ اس لئے ہی نہیں کہ وہ با حثیت ہو گئی اس لئے بھی نہیں کہ کسی حادثے یا بے سہارا ہونے کی صورت میں وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئی بلکہ اس لئے کہ اس کی گراں بہا متاع..... عزت و آبرو اور عفت و عصمت..... کا مؤثر و مؤکد بندوبست ہو گیا۔ اسلام نے اس ایک ضابطہ سے تحفظ عفت و عصمت کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل کر دیا۔ اس لئے کہ وراثت کا عمل وقوع پذیر ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ تشخص و تخصیص خون نہ ہو۔ یعنی دو اور دو چار کی طرح معلوم نہ ہو کہ کون کس مرد کی اولاد ہے؟ کس قدر ممنون ہو انسان نظام خلافت کا ایک تیر سے دو شکار کئے شکار بھی بہت بڑے بڑے۔ ایک تو عورت کو با حثیت کر کے اس کے مقام کو ارفع و اعلیٰ کر دیا اور دوسرے تحفظ

عفت و عصمت کا نول پر وف انتظام کر دیا۔ تخصیص خون کا بندوبست کیا تو اس قدر بھر پور کہ انسانی معاشروں سے بہت کد عدت کو متعارف کرایا۔ جس عورت کا شوہر فوت ہو جائے اسے چار ماہ اور دس دن تک دوبارہ شادی کرنے سے روک دیا اور عورت طلاق یا نخل کی بنا پر خاوند سے طلعہ ہوئی ہو اس کی مدت عدت تین مرتبہ ایام ماہواری آنے تک ہے۔ پھر یہ بھی تاکید کی گئی کہ دوران عدت عورت پر عیاں ہو جائے کہ وہ حاملہ ہے تو پھر وہ اس حمل یا غیر حمل ہونے کو چھپائے نہیں اس لئے کہ اس صورت میں عدت کی مدت وضع حمل تک ہے۔ ظاہر ہے اس بھر پور انتظام کا مقصد صرف تخصیص خون ہے یعنی یہ بات بالکل متعین اور طے ہو کہ بچہ کس مرد سے ہے۔ تخصیص خون کی پھر اس قدر رقر رہا سلام کو کہ زمانہ عدت میں شارة کوئی بات ہو جائے تو طلعہ بات ورنہ متعلقہ عورت کو مزید پیغام شادی دینے یا کسی مرد کا اس سے شادی کرنے کے اظہار کو ممنوع قرار دیا۔ یعنی نظام خلافت کو یہ بھی گوارا نہیں کہ بچہ پیٹ میں ہو اور عورت میں دو محبتوں والا خون گردش کرے۔ بالفاظ دیگر دین حق کو محض تخصیص خون کی ہی فکر نہیں دوران عدت جذبات و خیالات کے یکسو رکھنے کی فکر بھی دامن گیر ہے۔ قرآن میں آیا:

”زمانہ عدت میں خواہ تم ان بیوہ عورتوں کے ساتھ منقہ کا ارادہ اشارے کنایے میں ظاہر کر دو خواہ دل میں چھپائے رکھو دونوں صورتوں میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ ان کا خیال تو تمہارے دلوں میں آئے گا ہی مگر دیکھو! خفیہ مہد و بیان نہ کرنا۔ اگر کوئی بات کرنی ہے تو معروف طریقے سے کرو اور عہد نکاح باندھنے کا فیصلہ اس وقت تک مت کرو جب تک کہ عدت پوری نہ ہو جائے۔ خوب سمجھ لو کہ اللہ تمہارے دلوں کا حال تک جانتا ہے۔ لہذا اس سے ڈرو اور یہ بھی جان لو کہ اللہ بر دبار ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے درگزر فرماتا ہے“ (بقرہ: 235)۔

نیز ولی عہدی بھی اسلام میں ممنوع ہے تو اسی لئے کہ دو اطاعتوں کا اختلاط نظام خلافت کو گوارا نہیں۔

پھر تحفظ عفت و عصمت کے لئے یہ تخصیص خون کی محکم بنیاد فراہم کرنے پر ہی اکتفاء نہ کیا گیا۔ مزید احتیاطی تدابیر کا ایک بھر پور بیج دیا۔ اس بارے میں پہلا قدم اٹھایا تو یہ کہ نکاح کرنے کی ترغیب و تاکید کی تو

مجرد رہنے کو ناپسند فرمایا۔ اسلام میں فطرت ہے اور فطری تقاضوں سے صرف نظر نہیں کرتا۔ بتائیں اس نے شادی کرنے کو فرض تو قرار دیا کیونکہ کئی ایک جسمانی وحادثاتی وجوہات کی بنا پر ایک فرد نکاح کرنے سے قاصر رہ سکتا ہے۔ البتہ نکاح کی تاکید کی تو اس قدر کہ اسے محض ایک معاہدہ ہی قرار نہ دیا نیکی اور عبادت قرار دے دیا۔ رہبانیت کو بھی اسلام حرام قرار دیتا ہے تو اسی مصلحت کے پیش نظر کہ اسلام شادی شدہ ہونے کو ترجیح دیتا ہے۔

پھر اسلام نے صرف نکاح کی ترغیب دنا کید پر ہی اکتفاء نہ کیا انسانی فطرت بالخصوص مرد کی فطرت کی رعایت کرتے ہوئے چند شرائط کے ساتھ دو تین بلکہ چار تک بیک وقت شادیاں کرنے کی اجازت دے دی۔ عورت کو بہر حال ایسا کرنے کی اجازت نہ دی ایک تو استحکام خاندان اور نظم خانہ کی خاطر اور دوسرے اسی بنیادی مصلحت یعنی شخص خون کی خاطر۔ مرد کی سہولت کے پیش نظر عورت کو تو مرد کی اجازت کے بغیر نقلی روزے رکھنے کی ممانعت کر دی۔ شادی کرنے کی مزید تاکید کیلئے نبی رحمت ﷺ سے بھی بہت سی احادیث بیان ہوئی ہیں یہاں ہم صرف دو کا ذکر کرتے ہیں۔

”بندہ نے جب شادی کر لی تو اس نے نصف دین مکمل کر لیا۔“ (مشکوٰۃ)

ایک اور موقع پر فرمایا:

”میں شادی کرتا ہوں۔ جو میرے طریقہ سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں۔“ (بخاری)

اگر مجبوری کی بنا پر کوئی فرد شادی نہ کر پائے تو اسے بھی تحفظ عفت و عصمت کی بہر حال تاکید کی۔

قرآن میں آیا:

”اور جن کو بیاہ کا مقدور نہ ہو وہ پاكدامنی کو اختیار کئے رہیں یہاں تک کہ اللہ ان کو اپنے فضل سے

غنی کر دے“ (نور: 33)۔

شادی کے لئے مرد یا عورت کا انتخاب کرتے ہوئے بھی عفت و عصمت کو مد نظر رکھا گیا۔ فرمایا:

”زانی نکاح نہ کرے مگر زانیہ یا شرک کے ساتھ اور زانیہ کے ساتھ نکاح نہ کرے مگر زانی یا

شرک۔ اور یہ (زانی یا زانیہ سے شادی کرنا) حرام ہے مومنوں کے لئے“ (نور: 3)۔

پھر شرم و حیا اور عفت و عصمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلام نے نہ صرف محرم اور غیر محرم جیسی اصطلاحات وضع کیں بلکہ کچھ قرہبی رشتوں کا باہمی شادی کرنا حرام قرار دے دیا۔ فرمایا:

”تم پر حرام کی گئیں تمہاری ماں، بیٹیاں، بہنیں، چھوہ، حیا، خالائیں، بھتیجیاں، بھانجیاں، اور تمہاری وہ ماں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہو اور تمہاری دودھ شریک بہنیں اور تمہاری بیویوں کی ماں اور تمہاری بیویوں کی لڑکیاں جنہوں نے تمہاری گودوں میں پرورش پائی ہو۔۔۔ ان بیویوں کی لڑکیاں جن سے تمہارا تعلق زن و شوہر چکا ہو۔ ورنہ اگر (صرف نکاح ہوا ہو اور) تعلق زن و شوہر نہ ہوا ہو تو (انہیں چھوڑ کر ان کی لڑکیوں سے نکاح کر لینے میں) تم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ اور تمہارے ان بیویوں کی بیٹیاں جو تمہاری صلب سے ہوں اور یہ بھی تم پر حرام کیا گیا ہے کہ ایک وقت میں دو بہنوں کو جمع کر دو مگر جو پہلے ہو گیا سو ہو گیا۔ اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ (النساء: 23)۔

کس قدر پاس ہے اسلام کو حیا و شرم کا کہ جو رشتے کسی طور محترم قرار پاتے ہیں ان کو شادی کے بندھن میں بندھنے سے منع فرمایا۔ ایک جگہ پر تو اظہار ہی کر دیا کہ ایسی شادیاں اس لئے ممنوع ہیں کہ حیا و عفت کی بنیاد پر قائم نہ ہو۔ فرمایا:

”اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں ان سے ہرگز نکاح نہ کرو مگر جو پہلے ہو چکا ہو چکا۔ درحقیقت یہ ایک بے حیائی کا فعل ہے، پسندیدہ ہے اور برا چلن ہے“ (نساء: 22)۔

پھر انہی طبیعت کے جو مسلمانوں سے باہر شادی کی خواہاں ہو اہل کتاب کی پاکدامن عورتوں سے شادی کی اجازت دے کر اس کے لیے بھی گنجائش پیدا کر دی البتہ اس شرط کے ساتھ کہ عفت کا مقصد بہر حال ملحوظ رہے۔ فرمایا:

”اور محفوظ عورتیں بھی تمہارے لئے حلال ہیں خواہ وہ اہل ایمان کے گروہ سے ہوں یا اہل کتاب سے بشرطیکہ ان کے مہر دے دو اور ان سے عفت قائم رکھنی مقصود ہو نہ کہ کھلی بدکاری کرنی اور نہ چھپی دوہنی“ (مائدہ: 5)۔

اگر کسی وجہ سے مرد یا عورت ایک دوسرے کو اس نہ آئیں تو بذریعہ طلاق علیحدہ علیحدہ ہونے اور ہر

ایک کو مزید دوبارہ سربارہ وغیرہ شادی کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ جو دوبارہ شادی کی اجازت دینا ایک انقلابی قدم ہی نہیں رسم دنیا کے بھی خلاف ہے لیکن تحفظِ عفت و عصمت کی خاطر ایسا کرنا چونکا۔ لازمی تھا لہذا دین فطرت نے گوارا نہ کیا کہ ایک نفس کو غیر فطری ماحول میں رہنے دیا جائے۔

پاکدامنی نسوانی راز ہے۔ بیابان عورت سے بیعت لی گئی تو بالخصوص تحفظِ عفت و عصمت کے حوالے سے فرمایا:

”اے نبی (ﷺ) جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لئے آئیں اور اس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی چوری نہ کریں گی نہ کاری نہ کریں گی اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی اور کسی امر معروف میں تمہاری مافرمانی نہ کریں گی تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں اللہ سے مغفرت کرو یقیناً اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے“ (ممتحہ: 12)۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی بندی مریم کی تعریف کی تو ان الفاظ کے ساتھ کہ ”وہ خاتون جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی“ (انبیاء: 91) فلاح پانے والے اپنے بندوں کا ذکر کیا تو فرمایا ”یقیناً فلاح پائی ایمان لانے والوں نے جو اپنی شرنگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں“ (مومنون: 5)۔

پردہ

عفت و عصمت کو سب سے بڑا خطرہ مرد و زن کے آزادانہ میل جول سے ہوتا ہے۔ اس خطرے کا مداوا بلکہ مؤثر اور بھرپور مداوا نظامِ خلافت نے ایک اور انوکھا ادارہ متعارف کرا کے کیا۔ اس ادارے کو اسلام کی اصطلاح میں ”حجاب“ کہا جاتا ہے۔ ستر بھی حجاب ہی کا ایک پہلو ہے۔ عام طور پر پردے سے برقع، چادر وغیرہ اوڑھنے کا مفہوم لیا جاتا ہے۔ ہم نے اس کے لئے جو ایک ادارے کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس لئے کہ پردہ صرف برقع پہننے کا نام نہیں بلکہ ان تمام مبادیات و تفصیلات پر مشتمل ہے کہ جن سے عورت کو مرد کی آوارہ نگاہوں اور اپروچ سے مستور کیا جائے۔ پردے کا مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ اصل میں خانگی زندگی کی تمام سرگرمیاں اور رویتیں اسی سے وابستہ ہیں۔ صرف افراد کے بننے اور گزرنے کا دار و مدار ہی پردے پر مبنی نہیں

تہذیبوں اور حکومتوں کے ضعف و استحکام کا دار و مدار بھی پردے پر ہے۔ پردے کا مفہوم نبی رحمت ﷺ کے اس ارشاد سے کما حقہ واضح ہوتا ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ جس کھیت میں کسی مویشی کا داخلہ منظور ہو اس کھیت کے پاس بھی مویشی کو نہ جانے دیا جائے۔ قرآن و سنت میں پردے کے بارے میں اس قدر تفصیلات آئی ہیں کہ ان کو اس چھوٹے سے رسالے میں بیان کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ چند کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

اسلام کی یہ منفردا پر و چ کوہ پردے کی ہدایات کا آغاز عین نبی کائنات ﷺ کے گھر سے اور عین ازواجِ مطہرات سے کرتا ہے۔ اس کا بہر حال یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ایسی ہدایات محض ازواجِ مطہرات کے لئے ہیں ان کا نفاذ عام مومنات پر بھی ہوتا ہے۔ پردے کے متعلق جو پہلی ہدایات آئیں تو یہ:

”نبی کی بیوی! تم نام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دہی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی کا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے۔ بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔ اپنے گھروں میں تک کر رہو اور سابقہ دور جاہلیت کی سی جج دھجج نہ دکھاتی پھرو۔ نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو۔ اللہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیعت نبی ﷺ سے گندگی کو دور کرے اور تمہیں پوری طرح پاک کر دے“ (احزاب: 33)۔

آگے چل کر اسی سورۃ کی آیات 53-55 میں فرمایا:

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! نبی کے گھر میں بلا اجازت نہ چلے آیا کرو۔ نہ کھانے کے وقت تاکتے رہو۔ ہاں اگر تمہیں کھانے پر بلایا جائے تو ضرور آؤ۔ مگر جب کھانا کھا لو تو منتشر ہو جاؤ! باتیں کرنے میں نہ لگے رہو۔ تمہاری یہ حرکتیں نبی کو تکلیف دیتی ہیں مگر وہ شرم کی وجہ سے کچھ نہیں کہتے۔ اللہ حق بات کہنے سے نہیں شرماتا۔ نبی ﷺ کی بیویوں سے اگر تمہیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو۔ ازواجِ نبی ﷺ کے لئے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ ان کے باپ ان کے بیٹے ان کے بھائی ان کے بھتیجے ان کے میل جول کی عورتیں اور ان کے مملوک گھروں میں آئیں۔ (اے عورتو!) تمہیں اللہ کی مافرمائی سے بچنا چاہئے۔ اللہ ہر چیز پر نگاہ رکھتا ہے۔“

ان آیات میں دوسری پابندیوں کے علاوہ ایک عظیم انقلابی تبدیلی لائی گئی۔ عورت کے دائرہ کار کو

گھر کی چار دیواری کے اندر مقرر کر کے انسانی نصف آبادی کو ان بے جواز کلفتوں، کاوشوں اور قوتوں سے بچایا گیا کہ جن سے اسے ادوارِ جہالت میں دوچار ہونا پڑا ہے۔ مرد کی ذمہ داری کے نام کاموں کی تو کیا بات تاریخ میں آتا ہے کہ کل چلا تے وقت ایک طرف گدھی کو اور دوسری طرف عورت کو جوتا جاتا رہا ہے۔ اور کچھ نہیں تو دو گنا کاروبار یعنی گھر کے کاموں کا بوجھ اور بیرون گھر کے کاموں کا بھی بوجھ اسے اٹھانا پڑا ہے۔ سنجیدگی سے تجزیہ کیا جائے تو گھر پر کام اپنی نوعیت و وسعت کے حساب سے اس قدر بوجھل، مشکل اور صبر آزما ہے کہ عورت کو شاباش دینے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ گھر کی صفائی، کپڑوں کا دھونا، پھراستری کرنا، کھانا پکانا اور پھر لگانا، بچوں کی پرورش، سیٹھ پھا، تیاروں کی تیار داری، مہمانوں کی آؤ بھگت، خاوند کی دیکھ بھال، سب سے آخر میں سونا اور سب سے پہلے جاگنا، پھر ایک دو دن نہیں عمر بھر ایسا کرنا، اگر کسی مرد کو الاٹ کر دیا جائے تو یقینی طور پر ایک دو دن میں ہی ہتھیار ڈال دے۔ غیر جانبدار قانون ساز..... خالق و مالک کائنات..... عورت کے کام کی نوعیت و وسعت اور اہمیت سے کما حقہ آگاہ تھا لہذا اس نے عورت کی سرگرمیوں کا میدان گھر کو قرار دے کر برہمابریس سے کھویا ہوا حق اسے دلوا دیا۔ آج جدید جہالت پر مبنی جن معاشروں نے عورت کو گھریلو کاموں کے علاوہ بیرون گھر کاموں میں پھنسا دیا ہے عورت پر ہی زیادتی نہیں کی، خود مردوں کو بڑی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ عفت و عصمت کا کبڑا ہونا ہی تھا، گھر ویران کر بیٹھے۔

دس فطرت عورت کے دائرہ کار کو گھر کی چار دیواری کے اندر محدود کرنا ہے لیکن اسے بوقتِ ضرورت گھر سے نکلنے سے نہیں روکتا۔ البتہ یہ نکلنے کی اجازت بوقتِ ضرورت یعنی انتہائی اہم کام جسے لانہ جاسکے کے لئے ہے۔ شوقیہ گھومنے پھرنے، سیر سپانے اور پکنک وغیرہ کے لئے نہیں ہے۔ گھر سے نکلنے کی اجازت ہے تو ساتھ ہی جلباب یعنی لمبی چادر اوڑھنے اور کھونگھٹ چہرے پر لٹکانے کی پابندی کا ذکر ہے۔ فرمایا گیا:

”اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو ہدایت کر دو کہ وہ اپنے اپنے اوپر اپنی بڑی چادروں کے کھونگھٹ لٹکالیا کریں۔ یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ بچوں کی جائیں اور نہ ستائی جائیں۔ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔“ (احزاب: 59)۔



یہ پردے کا حکم تو گھر سے باہر نکلتے وقت کا ہے لیکن گھر میں ہوتے ہوئے بھی پردے کا حکم ہے گو کہ اس کی نوعیت قدرے مختلف ہے۔ قرآن میں آیا:

”اے نبی! مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرنگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوزھنیوں کے آئینل ڈالے رہیں۔ وہ اپنا بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں مگر ان لوگوں کے سامنے شوہر، باپ، شوہروں کے باپ، اپنے بیٹے، شوہروں کے بیٹے، بھائی، بھائیوں کے بیٹے، بہنوں کے بیٹے، اپنے میل جول کی عورتیں، اپنے مملوک وہ زیر دست مرد جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ ہوئے ہوں۔ وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی نہ چلا کریں کہ اپنی زینت کو جو انہوں نے چھپا رکھی ہو اس کا ظلم لوگوں کو ہو جائے“ (نور: 31)۔

نظام خلافت نے پھر عمومی ماحول کو پاکیزہ رکھنے کے لئے ان تمام رشتوں کو بند کیا جو آزادانہ میل جول، بدنگاہی اور اخلاقی مفاسد کو راہ دیتے ہیں۔ اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں بغیر اجازت اور کینوں پر سلام کئے بغیر داخلے کی ممانعت کر دی۔ اجازت نہ ملنے کی صورت میں واپس ہونے کو کہا۔ محرم رشتہ داروں کی عدم موجودگی میں غیر محرم مرد و زن کو تنہا بیٹھنے سے منع فرمایا۔ جائز نہیں رکھا کہ کسی مرد کا ہاتھ کسی غیر محرم عورت کے جسم کو گئے حتیٰ کہ عورتوں سے بیعت کا طریقہ بھی مختلف کر دیا۔ جمعہ کی نماز کو فرض کیا تو عورتوں کو اس سے مستثنیٰ کر دیا۔ جھوٹے محفلوں اور جھوٹے کاروبار کی ممانعت کر دی۔ لمبا سفر کرنا ہو تو محرم کے ساتھ ورنہ نہیں۔

مومن عورتوں کو ایسی عورتوں سے بھی پردہ کرنے کی تاکید کی کہ جو بد اطوار ہوں۔ گھر سے باہر میک اپ کرنے، خوشبو لگانے، بھڑکیلے کپڑے پہننے، جھانجرو وغیرہ جیسے زیورات پہننے، غنیمتدہر قسم کی نمود و نمائش اور اظہار زینت سے منع فرمایا۔ اندھوں اور مخمضوں تک سے پردہ کرنے کی تاکید کی۔ حد تو یہ کہ بیوی کو غیر عورت کی حالت خاوند سے بیان کرنے اور خاوند کو اپنی بیوی کے راز دوسروں پر ظاہر کرنے سے منع فرمایا۔ گانے بجانے، تصویر بنوانے کا کوئی سوال نہیں۔ مختصراً اسلام پاکیزگی و پاکدامنی کے مطالبہ سے پہلے ماحول کو پاکیزہ و پارسا بناتا ہے۔

## قانونی و انضباطی تدابیر

رب کائنات سمج و بصیر اور قوی و عزیز ہی نہیں علیم و حکیم بھی ہے۔ اسے گوارا نہیں کہ رومانی و اصلاحی اور انسدادی تدابیر اختیار کئے بغیر چھوٹے ہی لوگوں کو ٹھکلیوں سے باندھنا شروع کر دے۔ نظام خلافت کسی بھی معاملے میں قانونی کاروائی کرتا ہے تو آخری چارہ کار کے طور پر۔ عفت و عصمت کے بارے میں بھی یہی راستہ اختیار کیا گیا۔ مندرجہ بالا درجنوں اخلاقی و انسدادی تدابیر کے علی الرغم بھی اگر کوئی عفت و عصمت کو برباد کرے یا بربادی کا ذریعہ بنے تو اس کی پھر اپنی ہاتھ سے گرفت کی ہے۔ فحاشی پھیلانے والوں پر سب سے پہلے ہاتھ ڈالا۔ فرمایا:

”جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں میں فحش پھیلے وہ دنیا و آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں“ (نور: 19)۔

اس آیت مبارکہ کی زد میں وہ تمام لوگ جو بدکاری کے اڈے قائم کرتے، فحش لٹریچر چھاپتے، کلبوں اور ہوٹلوں کو جھوٹا رقص اور جھوٹا تفریحات کے لئے استعمال کرتے، جذبات ابھارنے والے اشعار گاتے، تصویریں، کھیل تماشے منعقد کرتے، غرضیکہ کسی طور پر عمومی ماحول کو براہ گندہ کرتے ہیں، آتے ہیں۔ اسلامی قانون ایسے تمام افعال کو مستلزم سزا اور قابل دست درازی پولیس قرار دیتا ہے۔

عمومی ماحول کو براہ گندہ کرنے میں سب سے زیادہ عمل دخل آشنائیوں کے قصے بیان کرنے اور تہمت تراشی کی روش اختیار کرنے کا ہوتا ہے۔ نظام خلافت یوں مزے لے لے کر تہمت تراشی کرنے والوں کے لئے تقریباً ویسی ہی سزا مقرر کرتا ہے جیسی کہ خود بدکاری کی۔ قرآن میں آیا:

”اور جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگائیں، پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں، ان کو اسی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو اور وہ ہی فاسق ہیں“ (نور: 4)۔

ان تمام اخلاقی و انسدادی تدابیر کو ملایا میٹ کرتے ہوئے جو بدکاری کا مرکب ہو تو نظام خلافت اس گلے سڑے پھل کو توڑ پھینکتا ہے اور وہ بھی اس طور کہ دوسرے پھل خود اس گلے سڑے پھل سے خراب نہ کریں۔ غیر شادی شدہ بدکاروں کی سزا یہ ہے:

”زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔ اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامنگیر نہ ہو اگر تم اللہ تعالیٰ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو اور ان کو سزا دیتے وقت اہل ایمان کا ایک گروہ موجود رہے (تا کہ عبرت حاصل ہو)“ (نور: 2)۔

شادی شدہ مرد و زن کو سنگسار کرنے یعنی پتھر مار مار کر مارنے کا حکم دیا۔ یہ سزا ہر دوسری سزا سے بڑھ کر ہے۔ ایک تو شاید اس لئے کہ انہوں نے شادی شدہ ہونے کے علی الرغم حدود اللہ کو توڑا اور دوسرے اس لئے کہ ان بدکاروں نے مل کر ایک دوسرے شخص کو جس کی وہ بیوی تھی اس خطرے میں مبتلا کر دیا کہ وہ کسی ایسے بچے کی پرورش کرے کہ جو اس کا نہیں۔

## حرفِ آخر

ملتِ جگہ کی وجہ سے ہم پیش نہیں کر سکے ورنہ بہت سی اور تفصیلات اور قابلِ بیان مسلمات ہیں؛ خلافت کے نظامِ عفت و عصمت کی۔ مختصر یہی کہ ایک تو اسلام نکاح کو آسان بناتا ہے تو بدکاری کو مشکل تر۔ اور دوسرے عورت کو وراثت میں حصہ دار بنا کر نہ صرف اسے باحیثیت بناتا ہے بلکہ عفت و عصمت کا تحفظ کرتا ہے تو اس حد تک کہ اسے وراثت کے لئے شرطِ اول قرار دیتا ہے۔ شخصِ خون کے بغیر کار وراثت کا چلنا ممکن ہی نہیں۔ واقعات کی دنیا سامنے کھوم پھر کر دیکھ لے آج کوئی کہ کیا حال ہے عفت و عصمت کا لادینی ممالک میں اور ان ممالک میں کہ جہاں کسی نہ کسی طور پر اسلامی قوانین نافذ ہیں زمین و آسمان کا فرق پڑ گیا۔ کس قدر بد نصیبی و ناشکری ہے انسان کی کہ وہ آج اس نظام کو ترک کئے ہوئے ہے کہ جس کا نام ہے..... نظامِ خلافت۔

# سوال و جواب

سوال: دنیا میں کچھ لوگ مسلمان ہیں اور کچھ کافر، مسلم اور کافر میں فرق کیا ہے؟

جواب: جو شتر اسکے کہ آپ کے سوال کا جواب دیا جائے یہ جانتا بہت ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے شمار مخلوقات میں سے انسان (اور کسی حد تک جن) ایک ایسی مخلوق ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے ایک مقررہ مدت تک نہ صرف کچھ صوابیہ اختیار دے رکھے ہیں بلکہ سمجھنے، سوچنے اور بولنے کی صلاحیتیں بھی دے رکھی ہیں۔ اس کے برعکس فرشتے، حیوانات، نباتات، سورج، چاند وغیرہ سب ایک لگے باندھے ضابطے کے پابند ہیں اپنی مرضی کو بروئے کار نہیں لا سکتے۔ انسان کے البتہ یہ صوابیہ اختیار اور منفرد صلاحیتوں کے حامل ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ”غیر مسؤول“ ہے۔ روزِ آخر فیضِ یہ غیر معمولی اختیارات و صلاحیتیں عطا کرتے وقت اللہ تعالیٰ نے انسان پر واضح کر دیا تھا کہ یہ منفرد عنایات بلکہ اسکے جسم کا ہر عضو انسان کے پاس بطور امانت ہے۔ لازم ہے کہ باوجود اللہ تعالیٰ کی مافرمانی کی قدرت رکھتے ہوئے انسان ان امانتوں کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کو بروئے کار لانے میں استعمال کرے۔ اگر انسان ان امانتوں کو اپنی یا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی مرضی کے مطابق استعمال کرے گا تو وہ خیانت ہوگی جس کی سزا سے آخرت میں لازماً بھگتنا ہوگی۔ اور یہ بھی کہ جو انسان ان امانتوں کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق استعمال کریں گے ”مسلم“ یعنی ماننے والے اور جو خیانت کے مرتکب ہو گئے ”کافر“ یعنی انکار کرنے والے گردائیں جائیں گے۔ ماننے والے آخرت میں ابدی انعامات سے نوازے جائیں گے جبکہ نہ ماننے والے وہاں پر ابدی عذاب میں مبتلا رہیں گے۔ یہی فرق ہے مسلم اور کافر میں۔

سوال: یہ آخرت کیا چیز ہے؟

جواب: ایک دفعہ پیدا کئے جانے والا انسان کبھی ختم نہیں ہوتا، البتہ اللہ پاک جو انسان کا خالق ہے نے انسانی زندگی کو دو دور میں منقسم کر دیا ہوا ہے۔ پوری زندگی کا کچھ حصہ انسان اس دنیا میں بسر کرتا ہے جبکہ باقی

حصہ آخرت میں۔ اس دنیا میں بسر کی جانے والی زندگی کتنی کے چند سالوں پر مشتمل ہے جبکہ اگلی دنیا یعنی آخرت میں گزار دی جانے والی زندگی بے حد بے کنار ہے۔ یہ اگلی دنیا ہی آخرت ہے۔

سوال: اس کا کیا ثبوت ہے کہ آخرت واقعی واقع ہوگی؟

جواب: اللہ و رسول ﷺ پر ایمان لانے کے بعد ایک مسلمان کو تو چنداں ثبوت کی ضرورت نہیں مگر تسلیم ختم ہے اگر اللہ و رسول ﷺ نے فرمادیا۔ یہی اسلام اور یہی مسلمانی ہے۔ البتہ مسلمان کی دہشتگی کیلئے اور کافر کی جس منطق کو پورا کرنے کیلئے قرآن مجید میں نوع بنوع دلائل دیئے گئے ہیں۔ انہی دلائل میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس دنیا میں فطری طور پر انسان کی انجوائے کرنے کی اہلیت محدود ہے تو سزا پانے کی بھی محدود ہے۔ انصاف کا تقاضا پورا ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ اس محدودیت کو ختم نہ کر دیا جائے۔ مثال کے طور پر ایک آدمی کسی دوسرے کو چھرا گھونپ کر ختم کر دیتا ہے جبکہ ایک دوسرا شخص لاکھوں نفوس کو انہم گمراہ کر کر نیست و نابود کر دیتا ہے۔ ایک فرد کے قاتل کو اگر پھانسی یا کسی اور طریقہ سے ختم کر دیا جائے تو انصاف کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے لیکن وہ جو لاکھوں جانوں کو تلف کرنے اور لاکھوں کو معذور کرنے کا ذمہ دار ہے اگر بھدے سے بھدے طریقہ سے بھی ختم کیا جائے تو انصاف کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ کوئی وقت ایسا ہوا چاہیے کہ لاکھوں کے قاتل کی قوت سیرداشت کو اس قدر بڑھا دیا جائے کہ وہ لاکھوں جانیں تلف کرنے کی سزا بھگت سکے۔ آخرت ہو تو ایسا ہوا ممکن ہے ورنہ بے انصافی ہوگی۔ قرآن پتہ دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یعنی اس کائنات کا خالق و مالک "عین عدل" ہے۔ اس نے ازل سے ایسے زمان و مکان کا بندوبست کر رکھا ہے کہ جس میں انسان کی انجوائے کرنے کی صلاحیت اور سزا پانے کی قوت کو لا محدود کر دیا جائے گا۔ سزا پانے کا عمل تو جاری رہے گا لیکن انسان خود ختم نہیں ہوگا۔ پھر اس دنیا میں تو اربوں مجرم کسی نہ کسی طور سزا سے بچ نکلتے ہیں لیکن آخرت میں ہر مجرم کو اس کے حصے کی اسی طرح سزا ملے گی جیسے کہ لاکھوں جانیں بچانے والے کو اس کے حق کے مطابق جزا سے نوازا جائے گا۔

سوال: آخرت میں یہ کیسے پڑ چلے گا کہ فلاں نے ایک قتل کیا ہے اور فلاں نے لاکھوں۔ پھر کئی کام تو ایک انسان اکیلا کرتا ہی نہیں ہزاروں لاکھوں انسان مل کر ایک کام کو کرتے ہیں۔ ایسے میں کیسے پڑ چلے گا کہ کسی کام کے ہونے میں ہر کس و ما کس کا کتنا حصہ ہے؟

جواب: قرآن مجید پتہ دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ صرف ایسے کام کو اور کام کے کرنے والے کو جانتا ہے جو رات کے اندھیرے میں کیا جائے بلکہ وہ اس خواہش اور ارادے تک کو جانتا ہے جو کسی دل کے کسی گوشے میں پیدا ہوتا ہے۔ بایں ہمہ آخرت میں جزا سزا کا معاملہ چونکہ انتہائی نازک اور صحت طلب تھا لہذا اللہ تعالیٰ نے اس معاملے کا محض اپنے جاننے پر نہیں چھوڑا۔ قرآن مجید نے آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے جب لکھنے پلینے کا فن تک ایجاد نہیں ہوا تھا اطلاع دی تھی کہ ہر انسان کے اعمال کا ریکارڈ محفوظ کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس نے اس وقت یہ کہہ کر مذاق اڑایا تھا کہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں۔ اسلام کی حقانیت کا اس سے اندازہ لگائیں کہ اللہ تعالیٰ کے ذرائع کی قربت ہی کیا، چھوٹی سی کھوپڑی کا حامل انسان آج خود اس قابل ہو گیا ہے کہ کسی بھی انسان کی حرکات و سکنات کو اس کی عدم موجودگی میں دیکھا بھی جاسکتا ہے اور اس کی زبان سے نکلے ہوئے کلمات کو سنا بھی جاسکتا ہے۔ قیامت کو ہر انسان کی زندگی کی فلم اس کے سامنے چلا دی جائے گی۔ کوئی پھر بھی انکار کرے گا تو اس کے ہاتھ پاؤں وغیرہ خود پکاراٹھیں گے کہ ہمیں کس کس استعمال میں لایا گیا۔ نیز اللہ تعالیٰ کے کمپیوٹر اس قابل ہونگے کہ اجتماعی طور پر کئے گئے کاموں میں سے ہر فرد کا حصہ علیحدہ کر دیں۔

سوال: قرآن مجید کہ جس کا آپ بار بار حوالہ دے رہے ہیں کیا ہے؟

جواب: ہر فیکٹری کے مالک کا حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی فیکٹری میں تیار ہونے والے پروڈکٹ کو استعمال میں لانے کی ہدایت دے۔ انسان فطرت کی فیکٹری کا پروڈکٹ ہے لہذا انسانی زندگی گزارنے کیلئے قوانین و ضوابط دینا اللہ تعالیٰ کا ہی حق ہے۔ اللہ تعالیٰ پوری انسانی تاریخ پر وقف و قفے سے آسانی صحیفوں کی شکل میں یہ قوانین و ضوابط مازل کر رہا ہے۔ قرآن مجید اسی سلسلہ تنزیل کی آخری کڑی ہے۔

سوال: یہ وقف و قفے سے بار بار مازل کرنے کی کیوں ضرورت پڑی، شروع میں ایک مفصل صحیفہ مازل کر دیا جاتا تو کیا کافی نہیں تھا؟

جواب: بالکل کافی نہیں تھا اس لیے کہ تاریخ شاہد ہے انسان نے تہذیب و تمدن کے بیٹھار مراحل طے کئے ہیں۔ اس ارتقائی عمل میں جس سطح کے قوانین و ضوابط کی ضرورت ہوتی تھی اسی سطح کی آسانی کتابیں مازل کی جاتی رہی ہیں۔ بنیادی قوانین یا جس حق تو ہمیشہ ایک ہی معنی "اسلام" رہا ہے لیکن دین پر عمل پیرا ہونے

والے طریقوں یا شریعت میں وقت کے ساتھ ساتھ رد و بدل ہوتا رہا ہے۔ بنا بریں آسمانی صحائف کو وقفے وقفے سے مائل کیا جانا لازم تھا۔

سوال: قرآن مجید کو آپ نے سلسلہ تنزیل کی آخری کڑی قرار دیا ہے کیا اب ارتقائی عمل رک گیا ہے؟  
جواب: ارتقائی عمل ہرگز رکا نہیں اور نہ اس کے رکنے کا قیامت سے پہلے کبھی امکان ہے البتہ ایک مرحلے پر پہنچ کر جب خالق کائنات نے محسوس کیا کہ انسانیت اس کی مشیت کے مطابق گلوبل ولیج کی صورت اختیار کرنے والی ہے تو قرآن مجید کی شکل میں گلوبل ضروریات کو قیامت پورا کرنے والے دستور حیات کو مائل فرما کر اللہ پاک نے نہ صرف سلسلہ تنزیل کو منقطع کر دیا بلکہ نئی آخر زماں حضرت محمد ﷺ کو بھیج کر سلسلہ نبوت کو بھی منقطع کر دیا۔

سوال: یہ انبیاء کو وقفے وقفے سے مبعوث کیا گیا تو کیوں؟ کیا یہ علیحدہ علیحدہ دین کے ظہور دار تھے؟  
جواب: ان سوالات کے جوابات دینے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ نبیاً کو مبعوث کیا ہی گیا تو کیوں؟ صرف صحائف ہی مائل کر دیئے جاتے؟ دیکھئے ایک طریقہ تو یہ ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ آسمانی کتاب کسی طور پر اہتمام کسی موزوں جگہ پر رکھوا دیتا ان ہدایات کے ساتھ کہ انسان کتاب اللہ میں دیئے گئے قوانین کے مطابق زندگی گزاریں۔ اللہ تعالیٰ نے بوجہ یہ طریقہ استعمال نہیں کیا۔ ایک تو اس لیے کہ کتاب اللہ اصولوں کی بنیادی کتاب ہوتی ہے تفصیلات اس میں نہیں ہوتیں۔ دوسرے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان کوئی واسطہ ہونا چاہئے کہ جو نہ صرف براہ راست اللہ تعالیٰ سے قانون کے منشا کو سمجھے بلکہ قوانین کتاب اللہ کے مطابق ایک زندگی گزار کر نمونہ پیش کر دے تاکہ اتنی اہم ہدایات پہنچنے کی قسم کے گمان و قیاس کا شائبہ تک نہ رہے۔ نئی یہی نمونہ ہونا ہے۔ نئی بشر بھی ہونا ہے تو اسی لیے کہ وہ انسانی زندگی گزار کر انسانوں کو زندگی کے تمام نشیب و فراز اور سراور رموز سے آگاہ کر دے۔ اسی نمونے کی زندگی کو قرآن مجید ”اسوۂ حسنہ“ اور معیار حق قرار دیتا ہے۔ شریعت کی زبان میں اسے ”سنت رسول ﷺ“ کہا جاتا ہے۔ قرآن و سنت کی اصطلاح بھی مستعمل ہوتی ہے تو اسی لیے۔ قرآن سنت رسول ﷺ کے بغیر ایک قدم نہیں چلتا۔ وہ صرف ”اطیعوا اللہ“ کی ناکید نہیں کرتا ”اطیعوا الرسول“ کی ناکید بھی کرتا ہے۔

یہ بات سمجھنے کیلئے انبیاء بار بار کیوں آئے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ دودھ کی مقررہ مقدار میں اگر مسلسل پانی ڈالنے جائیں تو ایک مرحلے پر پہنچ کر نیا وجود پذیر ہونے والا شروب سودمند ہونے کی بجائے صحت کیلئے مضر ہو جاتا ہے۔ اسی کا ملکہ جتنا عمل پوری انسانی تاریخ پر حق و باطل کے باہم استخراج سے ہوتا رہا ہے۔ ایک نئی کے آنے اور حق کو برگزیدہ کرنے کے بعد باطل آہستہ آہستہ حق میں سرایت کرنا شروع کر دیتا تھا حتیٰ کہ ایک مرحلے پر پہنچ کر وہی حق اس قدر مخ ہو جاتا تھا کہ وہ انسانوں کیلئے نفع آور ہونے کی بجائے نقصان دہ ہونے کو ہوتا۔ ایسے میں اللہ تعالیٰ ایک اور نئی مبعوث فرما کر وہی حق کو پھر اجاگر کر دیتا۔ آمیزش کر دیا ورمخ شدہ دین کو باطل سے پاک کرنے کی ضرورت چونکہ بار بار پڑی اسی لیے نبیؐ کی بار بار بعثت مائز پر غمخبری۔ تمام انبیاءؑ البتہ ایک ہی دین یعنی اسلام کے علمبردار تھے۔

سوال: قرآن و سنت کی شکل میں قانون تو ہمارے ہاں ہے لیکن قانون خود بخود تو نافذ نہیں ہوا کرتا کوئی ادارہ یا ایسا بھی ہونا چاہیے کہ جو قرآن و سنت پر مشتمل دین کو نافذ کرے؟

جواب: آپ نے بہت سچے کی بات کی۔ حقیقتاً قانون دھرے کا دھارا ہونا چاہیے اگر اسے نافذ کرنے والا کوئی ادارہ یا تقارن نہ ہو۔ دور نبوت میں تو یہ نفاذ دین کا کام نبیؐ ہی انجام دیتا ہے۔ مابعد رسول ﷺ البتہ یہ کام اولی الامر نے کرنا ہوتا ہے۔ اولی الامر میں ہوتے تو گورنر و وزراء، صاحبان اداروں کے سربراہان، اہل قزو دانش وغیرہ سبھی ہیں لیکن ان میں مرکزی حیثیت خلیفہ وقت کو ہوتی ہے۔ یاد رہے قرآن مجید، طبع اللہ و طبعو الرسول کو ہی لازم قرار نہیں دیتا، اولی الامر کی اطاعت کو بھی ضروری قرار دیتا ہے اس بڑی شرط کے ساتھ کہ اولی الامر خود اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے پابند ہوں۔

سوال: ہمارے ہاں کے حکمران کیا "اولی الامر" ہیں؟

جواب: اولی الامر ویسے تو ان حضرات کو کہا جاتا ہے جو کسی طور صاحب امر ہوں۔ البتہ ہمارے ہاں کے یہ صاحب امر حکمران یکوثر اولی الامر ہیں شرعی اولی الامر نہیں۔ شرعی اولی الامر کیلئے لازم ہے کہ ان میں خلیفہ المسلمین یعنی مسلمانوں کا ایسا حکمران جس کی سربراہی میں پوری اسلامی دنیا ہو کو مرکزی حیثیت حاصل ہو۔ صدیوں سے چونکہ ہمارے ہاں خلیفہ المسلمین کا وجود نہیں رہا بریں شرعی اولی الامر کا وجود بھی نہیں۔ نیز اولی



الامر میں سے غلیظہ المسلمین کو نکال دیں تو وہ اسی طرح بے کار و بے اثر ہو جاتے ہیں جس طرح کانڈے سے زردی نکال دیں تو وہ بچہ بنانے کے قابل نہیں رہتا۔

سوال: کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ہمارے ہاں قرآن و سنت کی شکل میں ازلی وابدی قانون تو ہے لیکن اس قانون کو یا دین کو نافذ کرنے والے موجود نہیں۔

جواب: بالکل ٹھیک ہمارے ہاں قوانین قرآن و سنت تو سن و عن موجود ہیں لیکن ان قوانین کو نافذ کرنے والے صدیوں سے معدوم ہیں۔ ہم نے اوپر ذکر کیا کہ پوری انسانی تاریخ پر وقفہ وقفہ سے دس حق کو انحطاط پذیر کیا جا تا رہا ہے۔ سلسلہ نبوت منقطع ہونے پر یہ بحالی و تجدید دین کا کام امت مسلمہ کے سپرد کیا گیا تھا لیکن امت مسلمہ نہ صرف یہ کہ فرائض منصبی ادا نہیں کر سکی بلکہ اسی پاداش میں اپنا وجود تک قائم نہیں رکھ سکی۔ آج دنیا میں امت مسلمہ کا کہیں وجود نہیں، اقوام ہیں، کوئی مصری قوم تو کوئی شاہی قوم، کوئی ایرانی قوم تو کوئی عراقی قوم، اکثر و بیشتر باہم دگر اور ایک دوسری کے خلاف صف آراء۔

سوال: نافذ کرنے والے نہ ہوں تو ظاہر ہے دس حق وجود پذیر نہیں ہوتا تو جس دین کو آج ہم اختیار کئے ہوئے ہیں کیا یہ دس حق نہیں؟

جواب: ایک مثال سے بات واضح ہوگی۔ ہمارے ہاں جو مختلف فصلیں پیدا کی جاتی ہیں ہر فصل کی کئی کئی اقسام ہوتی ہیں۔ فصل کی کوئی بھی قسم وقت کے ساتھ اپنا جوہر اصلی کھودیتی ہے۔ اگر محکمہ زراعت کسی ایسی قسم کو بونے کی سفارش کرنا جائے کہ جو اپنے جوہر اصل کو کھو چکی ہو تو کاشتکاروں کو نفع حاصل کرنے کی بجائے انسان نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ آج ہمارا دین نہ صرف ہمارے لیے نفع آور ہونے کی بجائے مضر ہو چکا ہے بلکہ اس کی تبلیغ و دعوت اٹلے اثرات پیدا کر رہی ہے۔ ہمارے ہاں دعوت و تبلیغ کا کام تو کسی نہ کسی طور جاری و ساری ہے۔ اور نہیں تو ہر جمعہ کو دنیا کے اسلام کی لاکھوں مساجد میں مسلسل دعوت و تبلیغ کا کام ہو رہا ہے۔ لیکن سوختہ سختی ہمارے آج اختیار کردہ دین کے نسخ اور انحطاط پذیر ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا کہ اثرات اٹلے برآمد ہو رہے ہیں۔ اخوت کی بجائے تعصب، محبت کی بجائے نفرت، اتحاد کی بجائے انتشار کا چلن کیا آج ہمارا مقدر نہیں؟ یہ تمام اقدار کا یکسر الٹ جانا ہمیں کیا پیغام دیتا ہے؟ یہی ماکہ جس دین کو آج کے مسلمان اختیار

کیے ہوئے ہیں وہ دس حق نہیں۔

سوال: ہمارے دین میں آج کوئی کمی واقع ہو چکی ہے کہ یہ دس حق نہیں رہا؟

جواب: جس طرح رسول ﷺ ربی دنیا تک پوری انسانیت کے لیے ”اسوۂ حسنہ“ ہیں اسی طرح دور خلافت راشدہ کا قیامت ”نمونہ کا دوز“ ہے۔ قرآن مجید نے اسے ”سبیل المؤمنین“ قرار دے کر اسی کے اپنانے کو لازم قرار دیا ہے تو رسول ﷺ نے ”سنی و سنت الخلفاء الراشدین المہدیین“ کہہ کر ہمیں اسی کی پیروی کا پابند کیا ہے۔ بتائیں یہ دیکھنے کیلئے کہ آج ہمارے دین میں کون کوئی کمی واقع ہو چکی ہے لازمی ہے کہ ہم اپنے اختیار کردہ دین کا تقابل اس دین سے کریں جو دو خلافت راشدہ میں رواں دواں تھا۔ اس وقت کے دین کی ان گنت خصوصیات لیکن درج ذیل چار بنیادیں ایسی جیسے کہ کسی عمارت کے چار ستون۔ اس وقت:

۱۔ قرآن و سنت ہی انہیں مملکت تھا آج کی طرح خود ساختہ کتابچے نہیں۔

۲۔ پوری اسلامی دنیا خواہ وہ دنیا کے کناروں تک پھیل چکی تھی ایک خلیفہ کی سرکردگی میں تھی۔ اسلام ایک خلیفہ کی موجودگی میں دوسرے سر اٹھانے والے خلیفہ کو تہ تیغ کرنے کا حکم دیتا ہے تاکہ مسلمان ہمیشہ ہمیشہ ایک ہی جھنڈے تلے رہیں۔ آج ہمارے ہاں اسلامی دنیا کو 57 ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ان پر 57 ہی حکمران جو مسلط ہیں قرآن و سنت کے خلاف ہے۔

۳۔ شریعت نافذ کر نیوالے اولی الامر موجود تھے آج شرعی اولی الامر کا کہیں وجود نہیں۔ بلکہ شوری اور عدت مسلمہ کا وجود بھی کہیں نہیں۔

۴۔ انعقاد خلافت ”بیعت کے ذریعہ حکومت نہ کہ حکومت کے ذریعہ بیعت“ کے نہری اصول پر ہوتا تھا۔ آج کے حکمران نسلی و نسی بنیاد پر یا ڈنڈے کے زور پر برسر اقتدار ہیں۔

دس حق کی یوں چاروں بنیادیں آج منہدم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں آج وہ ثمرات و برکات حاصل نہیں ہو رہیں جو دس حق کا طرہ امتیاز اور دو خلافت راشدہ کے مسلمانوں کو حاصل تھیں۔

سوال: وہ کون سے ثمرات و برکات ہیں جو آج ہمیں حاصل نہیں؟

جواب: قرآن پڑھ دیتا ہے کہ نظام خلافت اگر رواں دواں ہو یا دس حق عملاً برپا ہو تو نتیجہ کے طور پر ثمرات

وہ برکات اُن گنت حاصل ہوتے ہیں لیکن ان میں سے پانچ یعنی اتحادِ غلبہ، دس حق، امنِ عدل اور خوشحالی بہت نمایاں ہیں۔ ظاہر ہے اس سے بڑا اتحاد ممکن ہی نہیں کہ پوری اسلامی دنیا ایک خلیفہ کی سربراہی میں ہو۔ غلبہ دس حق کا اس سے اندازہ لگائیں کہ گودورِ خلافتِ راشدہ تو کوئی 30 سال پر محیط تھا لیکن اس کی برکت سے مسلمان دنیا میں کوئی گیارہ سو سال بطور غالب قوت رہے۔ امن کا یہ حال تھا کہ ایک عورت ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کرتی لیکن اللہ کے خوف کے علاوہ اسے کوئی خدشہ لاحق نہ تھا۔ عدل و انصاف اس قدر رک زرا آساں شاید اسی دور میں خلیفہ وقت کو کچہری کے کٹہرے میں کھڑا دیکھا گیا۔ خوشحالی و فارغ البالی اس قدر رک زکوٰۃ دینے والے بہت تھے لینے والے مشکل سے ملتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ پانچوں فوائد و فیوض آج کے مسلمانوں کو حاصل نہیں بلکہ آج ہمارا مقدر یہ ہے کہ اتحاد کی بجائے امتنا، غلبہ کی بجائے مظلوبیت، امن کی بجائے دہشت گردی، عدل کی بجائے ظلم اور خوشحالی کی بجائے پسماندگی و درماندگی۔ ہمارے ہاں آج دس حق کے نہ ہونے کا اور ثبوت کیا؟

سوال: آپ نے دس حق اور نظامِ خلافت کا یوں استعمال کیا ہے جیسے یہ ایک ہی چیز کے دو نام ہوں۔ کیا ایسا ہی ہے؟

جواب: اسلام دس حق الدین، خلافت، نظامِ خلافت، قرآن و سنت پر مبنی نظام سب مترادف و ہم معنی ہیں۔ البتہ اسلامی نظریہ ایک دوسری چیز ہے یعنی تعلیمات و احکامات قرآن و سنت اگر قرآن و کتبِ احادیث کے صفحات تک محدود ہیں تو محض ایک نظریہ، ایک فلسفہ اور ایک تصویری ہیں لیکن جب یہ اسلامی نظریہ کسی خطہ زمین میں نافذ ہو جائے تو یہی خلافت ہے یہی اسلام ہے یہی دس حق ہے۔ اوپر بیان کردہ چاروں بنیادوں پر مشتمل اگر آج دنیا میں نظامِ خلافت ہوتا تو ہمارے ہاں دس حق بھی ہوتا۔ نظامِ خلافت کا نہ ہونا ہی تو یہ معنی رکھتا ہے کہ جس دین کو ہم آج اپنائے ہوئے ہیں وہ دس حق نہیں، اس کی کوئی منہ شدہ شکل (Self-Styled) ہے۔

سوال: ہمارے ہاں جب نماز روزے عمرہ حج، ذکر، اذکار، کفن و دفن، نکاح و طلاق، ختنے وغیرہ کا انتظام ہے تو پھر یہ دس حق کیوں نہیں؟ دس حق اور کیا ہوتا ہے؟

جواب: یہ تمام مراسم عبودیت جن کا ذکر آپ نے کیا ہے کسی نہ کسی درجے اور کسی نہ کسی طور دور جہالت میں بھی تھے۔ رسول ﷺ بھی اگر انہی مراسم عبودیت پر اکتفا کرتے تو معرکہ بائے حق و باطل کی نوبت کبھی نہ آتی۔ یہ ہجرت و برأت اور غزوات و سرایا کی نوبت آئی تو اس وقت جب آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھی نظام باطل کا قلع قمع کرنے پر مصر بلکہ اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں لگ گئے۔ نظام باطل میں لاکھوں کروڑوں خداؤں اور معبودوں کی پرستش ہوتی تھی۔ دیوتوں اور دیویوں کے منکے اور افواج تھیں۔ مختلف قبائل کی شناخت اپنے اپنے بتوں سے ہوتی تھی۔ خانہ کعبہ میں 360 بت براجمان تھے حتیٰ کہ انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کو جن کی شناخت ہی قرآن کریم میں ہے تو اس طرح ”وہ شرکوں میں سے نہ تھے“ کے نام کا بت بھی ان 360 بتوں میں شامل کر رکھا تھا۔ نبی کا ناس ﷺ نے یہ ملا کہا کہ لوگو تم غلط جا رہے ہو۔ معبود حقیقی صرف ایک اللہ ہے۔ نظام باطل میں رسومات و توہمات اور فروعات و خرافات کی بھرمار تھی۔ مختلف قبائل اپنی اپنی رسومات دوسرے قبائل پر مسلط کرنے کی دھن میں رہتے تھے۔ ان میں جنگ و جدل ہوتا تھا تو اکثر و بیشتر اسی بنیاد پر۔ اللہ کے رسول ﷺ نے کہا کہ تم غلط جا رہے ہو۔ قرآن کی شکل میں بے مثل قانون ان کے ہاتھ میں تھا۔ نظام باطل میں ان گنت قبائل ہی نہ تھے ان گنت سرداران قبائل بھی تھے۔ رسول ﷺ نے ان تمام سرداروں سے اقدار چھین کر باآخر ایک خلیفہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بالفاظ دیگر دور نبوت درمیان میں ایک طرف دور جہالت تو دوسری طرف دور خلافت انہی چار بنیادوں کو استوار کیا جن کا ذکر اوپر ہو چکا تو دور جہالت دور خلافت میں بدل گیا۔ اس قدر عظیم تبدیلی لانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ جسے بجائے باطل نظام کب گوارا کرتے ہیں کہ کوئی آئے اور ان کا تیا پانچ کر دے۔ اس وقت بھی نظام باطل نے خوب مقابلہ (React) کیا۔ نتیجہ کے طور جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہجرت و برأت اور غزوات و سرایا کی نوبت آئی۔ چشم فلک نے معرکہ بائے حق و باطل کا بھرپور منظر دیکھا تو قرونِ اولیٰ ہی میں۔

غلط سوچے بے ان کی کہ جو نماز روزہ قرآن خوانی اور دیکھیں وغیرہ چاہا کرتے تھے جن کا انہوں نے اللہ کو راضی کر لیا ہے۔ جس حق کی آج چاروں بنیادیں منہدم ہیں۔ جب تک ہم ان کو پھر استوار کرنے میں اپنے خون کا آخری قطرہ نہیں بہا دیتے اور اپنی دولت کا آخری پیسہ نہیں لگا دیتے اللہ تعالیٰ کو ہماری نماز اور روزوں

سے کوئی غرض نہیں۔ ہم آج نصرتِ امین دی سے محروم ہیں تو اسی لیے کہ اللہ ہمارے اعمال سے بیزار ہے۔ دین ایک ایسا نظام تھا جس میں ہر شعبہ قرآن و سنت کی تعلیمات پر مبنی تھا۔ آج ہم نے اپنے ہاں کا ہر شعبہ اغیار کے طور طریقوں پر استوار کر رکھا ہے۔ ایسے میں محض چند مراسم عبودیت ادا کرنے سے ہم نے دین کو اسی طرح ایک مذہب میں تبدیل کر رکھا ہے جس طرح کہ یہود و نصاریٰ نے۔

سوال: خلافت کے مقام عالی مقام سے نہ امت کی سطح پر ہم جو گئے تو اتنی بڑی تبدیلی ایک لخت ہوئی یا کدہ رنج؟

جواب: میرے کارواں سے گرے کارواں کی حیثیت اختیار کرنے میں ایک لحاظ سے تبدیلی ایک لخت واقع ہوئی تو دوسرے لحاظ سے بتدریج۔ ایک قلم تو اس طرح کہ جیسے ہم نے اوپر ذکر کیا، انحطاط کا پورا عمل چار بنیادیں منہدم ہونے سے واقع ہوا۔ ان میں سے ایک بنیاد یعنی انعقادِ حکومت کیلئے ”بیعت کے ذریعے حکومت نہ کہ حکومت کے ذریعہ بیعت“ کے اصول کو توڑا گیا تو اسی وقت دورِ خلافت کا اختتام اور دورِ ملوکیت کا آغاز ہوا۔ بالفاظِ دیگر یہ الماسِ تبدیلی ایک ستون کو گرانے کے نتیجے کے طور پر واقع ہوئی۔ باقی تینوں بنیادیں بھی کم و بیش اسی وقت بلا ماری گئیں۔ قرآن و سنت کا بطورِ آئین مملکت ہونا کچھ عرصہ بعد تک جاری رہا لیکن وہ آئین کیسا جس پر جزوی عمل ہوا۔ انعقادِ حکومت کے اصول کو بدلنا شرعی خلیفہ اور شرعی اولی الامر کے وجود کو ختم کرنا قرآن و سنت کی خلاف ورزی میں ہی تو کیا گیا۔ لہذا یہ تبدیلی اس لحاظ سے ایک لخت (Abrupt) تھی۔

تبدیلی البتہ اس لحاظ سے بتدریج ہوئی کہ خلافت کو پہلے ملوکیت کی شکل دی گئی، پھر ملوکیت کو ملوکیتوں میں ڈھالا گیا، پھر ملوکیتیں طوائفِ الملوک کی میں بدل دی گئیں، پھر غلامی کا دور آیا اور آج ”مظلوبیت“ ہم مسلمانوں کا (نہ کہ امتِ مسلمہ کا) کیونکہ اس کا وجود ہی نہیں) مقدر ہے۔ یعنی ہم غلبہ کفر سے نہ صرف کھینچا کیے ہوئے ہیں بلکہ اس کے رسیا ہو چکے ہیں۔ عادی ہو چکے ہیں تو اس حد تک کہ ہم بھول گئے کہ مسلمان ہوا اور مظلوب ہونا ایک تضاد ہے۔

سوال: امتِ مسلمہ معدوم ہوئی تو فرق کیا پڑا؟

جواب: ہم نے اوپر ذکر کیا کہ امتِ مسلمہ اقوام کا روپ اختیار کر گئی یعنی امتِ مسلمہ خود تو معدوم ہو گئی اس کی

بجائے مسلم اقوام معرض وجود میں آگئیں۔ یہ اقوام کسی ایک پلیٹ فارم پر بھی مسلمانانِ عالم کے مؤقف کو مستند پیش نہیں کرتیں بلکہ ایک دوسری کی مانگ کھینچتی ہیں، مگر ان و سر پرست ہیں تو دنیا کے کفر کے مفادات کی۔ آج دنیا میں کفر والے متحد ہیں تو اسلام والے منتشر۔ مسلمانوں کی بنیادیں ہوا اڑ گئی۔ ان کی آواز میں کوئی وزن نہیں۔ دنیا کی قوموں میں ذیل ترین آج کوئی قوم ہے تو مسلمان۔ انداز لگائیں یو این او میں مسلمانوں کی تقریباً ایک تہائی رکنیت ہے لیکن سوختہ سختی، سلاحتی کونسل کے ان پانچ مستقل رکان کہ جنہیں ویٹو کا حق حاصل ہے میں سے ایک بھی مسلمان رکن نہیں۔ مسلمان ممالک تو تیسری دنیا کے ممالک گردانے جاتے ہیں وہ بھی نرم لہجے میں ورنہ تیسری دنیا کے ممالک کہنے والوں کا مل مطلب تیسرے درجے کے ممالک ہوتا ہے۔

قرآن و سنت سختی سے ممانعت کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے بیک وقت زیادہ تو کیا دو خلفاء ہوں۔ حکم یہی ہے کہ ایک خلیفہ کی موجودگی میں کوئی دوسرا شخص بطور خلیفہ سر اٹھائے تو اسے قتل کر دو۔ مطلب یہ کہ مسلمانانِ عالم ہمیشہ ہمیشہ ایک جھنڈے تلے ایک خلیفہ کی سربراہی میں رہیں۔ آج مسلمانوں پر 57 حکمران مسلط ہیں جو اہل میں ایک خلیفہ کے حق خلافت کو غصب کیے ہوئے ہیں لہذا غاصب ہیں۔ مسلمانانِ عالم اگر ایک خلیفہ کی سرکردگی میں رہتے تو ”امت مسلمہ“ کا وجود بھی قائم و دائم رہتا۔ آج 57 حکمران آدمکے ہیں تو 57 ہی اقوام معرض وجود میں آگئیں ہیں۔ بنیادیں وہ فراموش مٹھیں جو امت مسلمہ کی سطح پر کیے جانے تھے اور جو دین حق کا اصل جوہر ہیں آج داغ نہیں ہو رہے۔ صرف یہی نہیں کہ آج ”امت مسلمہ“ کا کہیں وجود نہیں، حقیقتاً بنیادی طور پر ہی سہی خود مسلمانوں کا وجود بھی کہیں نہیں ورنہ قرآن کی رو سے مومن ہوں اور دنیا میں مغلوب یا ایک تنہا

ہے۔

سوال: وہ کونسے فراموش مٹھیں ہیں جو امت مسلمہ نے ادا کرنے تھے اور آج اس لیے نہیں ہو رہے کہ امت مسلمہ کا اپنا وجود دنیا میں کہیں نہیں؟

جواب: بڑے بڑے فراموش مٹھیں تین ہیں:

۱۔ اقوامِ عالم کی قیادت امت مسلمہ کے ذمے ہے۔ بنیادیں اسے ”تحریر امت“ کے عظیم لقب سے نوازا گیا ہے (آل عمران: 110)۔ ایسا ہونے کیلئے مزید لازم قرار دیا گیا کہ دنیا میں غلبہ مسلمانوں کا ہو یعنی

ان کے پائے کی کوئی دوسری طاقت زیرِ آسمان نہ ہو (انفال: 34)۔

۲۔ چھوٹا سا بٹھپنہ بھی دیران ہو جاتا ہے اگر اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی مائی نہ ہو۔ اسی طرح لازمی ہے کہ کوئی انجینیئر یا ادارہ ایسا ہو جو دنیا کو سنوار کر رکھے اور بگاڑ سے بچائے۔ یہ دنیا کو سنوار کر رکھنے اور بگاڑ سے بچانے کی ذمہ داری ”امت مسلمہ“ کے ذمہ ہے (آل عمران: 110)۔ قرآن کریم نے اس کیلئے ”امر بالمعروف ونہی عن المنکر“ کی مخصوص اصطلاح استعمال کی ہے۔

۳۔ دنیا کے انسانوں کی اکثریت زیادہ تر غیر مسلم کفرانوں میں پیدا ہوتی ہے لہذا از خود اکثر و بیشتر علم وحی یا قرآنی تعلیمات سے لاعلم رہتی ہے۔ چونکہ قیامت کے دن تمام انسانوں کا حساب کتاب ایک ہی پلیٹ فارم پر ہونا ہے لہذا اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو کہ جو براہِ راست تعلیمات قرآن و سنت سے مستفید ہوتی ہے کی ڈیوٹی لگا رکھی ہے کہ وہ غیر مسلم اقوام تک قرآن و سنت کے علم کو پہنچائے تاکہ کل قیامت کو کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ میرے پاس تو اصل بات پہنچی ہی نہیں۔ قرآن کریم نے امت مسلمہ کے اس فرض منصبی کو ”شہادت علی الناس“ کی اصطلاح سے یاد کیا ہے (بقرہ: 143)۔

شوقی قسمت یہ تینوں فرائض منصبی آج کا حقدار نہیں ہو رہے۔

سوال: پھر کیا یہ حق ہے کہ دنیا میں آج مسلمانانِ عالم ذلت و رسوائی اور پسماندگی و در ماندگی سے دوچار ہیں تو اس لیے کہ دنیا میں آج خلیفہ ہے نہ خلافتِ اولی الامر ہیں نہ امت مسلمہ اسلام کی مملکتِ واحدہ ہے نہ قرآن و سنت کو انہیں مملکت بنایا گیا ہے؟ دنیا میں مسلمانوں کا غلبہ بھی نہیں نہ امت مسلمہ کے فرائض منصبی ادا ہو رہے ہیں۔ پھر کیا یہ بھی حق ہے کہ بحر و بر میں آج جس قدر فتنہ و فساد و طغیان و شر و عظم و جور اور کفر و شرک ہے مسلمانوں کی مائی اور اپنے فرائض منصبی سے اعراض کی وجہ سے ہے؟

جواب: یہ عین حق ہے۔ یہ جتنی چیزوں کے عدم وجود کا آپ نے ذکر کیا ہے سب دس حق کے اجزاء ہیں۔ ظاہر ہے جب جزائیں تو ہمارے ہاں دس حق کہیں نہیں اور جب دس حق نہیں تو اس کی برکات نہیں۔

سوال: اشد ضروری ٹھہرا کہ دس حق یا نظامِ خلافت کا احیاء ہو لیکن ہو تو کیسے؟

جواب: ہدف تو سمجھی حاصل ہو گا جب موجودہ مسلم ممالک کو صوبوں کی شکل دے کر ایک عظیم تر اسلامی

مملکت واحدہ..... دارالسلام کو معرض وجود میں لایا جائے۔ دارالسلام ایک ہی خلیفہ کی سربراہی میں ہو اور قرآن و سنت ہی آئین دارالسلام ہو۔ یہ بنیادیں استوار ہوں گی تو سچی دس حق یا نظام خلافت پھر انسانیت کا مقدر بنے گا۔

سوال: ایسے میں جب دنیا نے اسلام ایسے 57 ملکوں میں بٹ چکی کہ جن کے درمیان نہ صرف مسند اور پراز بلکہ 57 حکمران بھی حائل ہیں تو ایسے میں دنیا نے اسلام کا آج پھر ایک جھنڈے تلے ہوا کیا ممکن نہیں؟

جواب: ممکن تو نہیں، البتہ مشکل اس قدر ہے کہ پوری انسانی تاریخ پر یہ کام کبھی نصرت الیز دی کے بغیر نہیں ہوا۔ آج بھی جس نے یہ عظیم کام کرنا ہوا، اور ظاہر ہے کہ کئے بغیر کوئی چارہ کار بھی نہیں، تو لازمی ہے کہ پہلے وہ نصرت الیز دی کو حاصل کرے۔ قرآن مجید ہرگز ارپتہ دیتا ہے کہ نصرت اللہ اور فتح و کامیابی لازم و ملزوم ہیں۔

سوال: نصرت اللہ کو حاصل کیا جائے تو کیسے؟

جواب: مسنون طریقہ ایک ہی ہے اور یہ وہی ہے جسے رسول ﷺ اور صحابہؓ نے کئی دور نبوت میں اختیار کیا۔ یاد رہے کئی دور نبوت ”قیام خلافت“ کا دور ہے تو مدنی دور نبوت بشمول دور خلافت راشدہ ”دوام خلافت“ کا دور ہے۔ کئی دور نبوت میں اپنائی گئی حکمت عملی اور جدوجہد کے نتیجے میں اس دور کے اختتام پر مدینہ میں ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست قائم ہو گئی جس کے سربراہ خود نبی کائنات ﷺ تھے۔ بالفاظ دیگر انقلاب آ گیا اور نظام خلافت قائم ہو گیا۔ یاد رہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا کوئی بھی نئی اپنے وقت کا بھی ہونا ہے تو خلیفہ بھی۔ رسول ﷺ کو ساتھیوں سے مشورہ لینے کا پابند کیا گیا تو کار خلافت میں ہی کار رسالت میں مشورے کی ضرورت کا کیا سوال؟ لازمی ہے کہ آج سی مسنون طریقے کو تبدیلی لانے کیلئے اختیار کیا جائے جو کئی دور نبوت میں اختیار کیا گیا اور جس کے نتیجے میں قیام خلافت کا مرحلہ طے ہوا۔

کئی دور نبوت میں جو طریق کار اور حکمت عملی اپنائی گئی اس کے دو پہلو بہت نمایاں ہیں۔ ایک یہ کہ جس نظام کو بدلنا تھا نئی کائنات ﷺ اور ان کے ساتھی اس سے یکسر علیحدہ ہو گئے اور دوسرے یہ کہ جس نظام کو لانا تھا اس کی دعوت دی۔ انقلاب لانے کا یہ وہی طریقہ ہے جو ”لا الہ الا اللہ“ میں بیان ہوا ہے کہ اللہ کا اقرار



کرنے سے پہلے طاغوت کا انکار کیا جائے۔ طاغوت کا انکار پہلے تو اللہ کا اقرار بعد میں ہے۔ نظام عدل و قسط کو لانے سے پہلے نظام جبر و ظلم کا قلع قمع لازمی ہے۔ اگر محض تبلیغ و دعوت کا کام کیا جائے تو نہ نصرت و ایاز دی کمانی جاتی ہے اور نہ انقلاب آتا ہے۔

جب مجھے جمائے نظام باطل کے ساتھ مسلمانوں نے چلنے سے انکار کیا تو باطل نظام نے بھرپور جوابی حملہ کیا۔ حملہ کیا تو کن پر؟ نبی رحمت ﷺ اور کتنی کے چند صحابہؓ پر جن میں بیشتر غلام تھے یا نو جوان یعنی جو اکثر و بیشتر خود مختار نہ تھے بلکہ دو وقت کی روٹی کیلئے بھی دوسروں کے محتاج تھے۔ پھر مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ نے یہ پابندی بھی لگا رکھی تھی کہ وہ مخالفین کے خلاف تلوار تو کیا ان کے ساتھ ترش کلامی سے بھی پیش نہ آئیں۔ پھر کیا تھا چند نئے مسلمان اور مقابلے میں بھرا ہوا چاک و چوبند نظام باطل جو کسی اخلاقی قدر کا پابند نہ تھا۔ زیر آسمان مسلمانوں کو مار پڑی تو بے حد و بے انداز۔ گھروں سے بے کھر کر دیا گیا۔ کاروبار خراب ہو گئے۔ بار بار مسلمانوں کو حبش کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔ ایک دو چار سال نہیں دس سال سی تکش میں گزر گئے۔ ایسے جیسے چارہ مویشیوں کے آگے ڈالا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے کتنی کے چند مسلمانوں کو غار و شریکین کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ رسول ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھی پکاراٹھے ”مٹی نصر اللہ..... کہاں ہے اللہ تعالیٰ تیری نصرت؟“، لیکن اللہ تعالیٰ یوں جیسے سننے پر آمادہ ہی نہیں۔ بیٹھ کے دسویں سال مکہ والوں کی بے بسی سے غلٹ آ کر رسول ﷺ طائف تشریف لے گئے اس امید پر کہ شاید وہاں سے ہی کچھ پیش رفت ہو۔ پیش رفت کیا ہوئی تھی طائف والوں نے پیغمبر ﷺ پر سنگ باری کر دی۔ بعد میں ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے نبی رحمت ﷺ سے پوچھا کہ ان پر زندگی میں کونسا مشکل ترین دن آیا۔ رسول ﷺ نے اسی دن کا ذکر کیا۔ یہی وہ تاریخی دن ہے جب اسلام نے موڑ لیا یعنی نبی رحمت ﷺ کا اپنا خون طائف کی گلیوں میں گرا تو وہ نصرت جو دس سال سے رکی ہوئی تھی دھیسے سے آوارہ ہوئی۔ فرشتہ نوید حاضر ہوا۔ فرمایا گیا اب پیغمبر ﷺ کی صوابدید پر ہے چاہے تو طائف والوں کو پہاڑوں میں چیں کر رکھ دیا جائے۔ اصلی انقلاب تو تین سال بعد آیا لیکن ہوا کا رخ اسی دن سے بدل گیا۔ مشکلات کے ساتھ نویدوں کی جھنکار بھی سنی گئی۔

نصرت و ایاز دی کمانے کا طریقہ ہے ہی یہی۔ پیغمبر ﷺ جو انقلاب لائے اس کا یہی راستہ تھا۔ آج

بھی کسی نے تبدیلی لانی ہو تو نصرتِ امینِ دی کے بغیر یہ کام ہونے والا نہیں اور نصرتِ امینِ دی حاصل کرنے کا وہی مسنون طریقہ ہے جو مکہ کی وادیوں اور فاران کی چوٹیوں میں اختیار کیا گیا۔ ضروری نہیں انقلابیوں کی تعداد لاکھوں میں ہی ہو۔ مسلح ہونے کی بھی ضرورت ہرگز نہیں۔ ضرورت ہے تو اس امر کی کہ فدائینِ نظامِ باطل کے ساتھ چلنے سے دو ٹوک انکار کر دیں اور جس نظام..... قرآن و سنت کے نظام کو برپا کرنا جس کی دعوت دیں۔ تن جانا، بجے جائے دھن جانا، بجے جائے، ان کے جانے ہی سے نصرتِ امینِ دی حاصل ہوتی ہے۔ پہلے بہر حال نصرتِ اللہ حاصل ہو تو پھر فتح ورنہ اس خیال سے بحال ست و جنوں۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ

کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے ٹکاو آئینہ ساز میں

سوال: اللہ تعالیٰ کا وضع کردہ اور رسول ﷺ کا آزمودہ مبارک نظام..... نظامِ خلافت جب دنیا میں رواں دواں ہوگا تو اس کی برکات و ثمرات اور فوائد و فیوض کیا ہونگے؟

جواب: قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق جب دورِ خلافتِ راشدہ ہی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک محبوب و مطلوب نظام ہے تو یہود و امت کی جزوی یافتوں میں الجھنے کی بجائے ہماری توانائیوں، محنتوں اور صلاحیتوں کا بہترین مصرف نظامِ خلافت کو پھر معرضِ وجود میں لانا ہی ہے۔ لہذا اگر ہم:

۱۔ تمام موجودہ اسلامی ممالک کو صوبوں کی شکل دے کر باہم مدغم کر کے نقشہٴ عالم پر ایک عظیم تر اسلامی مملکت معرضِ وجود میں لے آئیں جس کا نام ”دارالسلام“ ہو۔

۲۔ موجودہ درجنوں مسلم سربراہوں کی بجائے پوری اسلامی دنیا یعنی دارالسلام کو ایک خلیفہ کی سرکردگی میں لے آئیں تو یوں بحالیِ خلافت سے نہ صرف ہماری آخرت سدھر جائے گی بلکہ اس دنیا میں بھی ان گنت فیوض و برکات حاصل ہوں گی جن کا اجمالی خاکہ پیش کیا جاتا ہے:

## سیاسی برکات

☆ ”دارالسلام“ کے معرضِ وجود میں آنے، خلافتِ بحال ہونے اور مسلمانوں کے وسائل و ذرائع مجتمع ہونے سے دارالسلام کے پائے کی کوئی اور مملکت دنیا میں موجود نہ ہوگی۔ دنیا میں صرف اور صرف مسلمانوں کا

غلبہ ہوگا۔ امت مسلمہ بے مثال یکجہتی اور باہمی اتحاد و اتفاق کا عظیم الشان مظہر ہوگی۔ مقصدِ بعثت محمدی ﷺ (غلبہ دین) کا ظہور ہوگا۔ مقصدِ تخلیقِ آدم یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کوئی طاقت و قوت مزاحم نہ رہے گی۔

☆ پوری اسلامی دنیا کا ایک سربراہ ایک فوج، ایک کرنسی، ایک زبان، ایک شہریت ہونے سے وطنی، لسانی، عربی، عجمی اور موجودہ بین المملکتی جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔ نہ پاسپورٹ کی ضرورت ہوگی نہ ویزے کی۔

☆ غیر مسلموں کو ذمی بن کر رہنا ہوگا اور ذمی ہونے کی علامت کے طور پر جزیہ ادا کرنا ہوگا۔

☆ خلیفہ و ارکانِ شوریٰ میں سے ہر ایک قرآنی معیارِ اہلیت یعنی ایمان، تقویٰ، صلاح، علم اور جسم کا حامل ہوگا۔ امانت دارانہ عہدے اہل لوگوں کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے پورا نظام عدل و قسط کا مظہر ہوگا۔

☆ بشرطِ قرآنی معیارِ اہلیت چونکہ خلیفہ و ارکانِ شوریٰ کا حیات اپنے عہدوں پر متمکن رہ سکیں گے اور چونکہ کسی عہدے کیلئے امیدوار بھی نہیں بنایا جاسکے گا لہذا یہ آئے دن کے انتخابات انتخابی مہم بے جا اخراجات، تضحیٰ اوقات وغیرہ نظامِ سیاست کا حصہ نہ ہونے کی بنا پر پوری مملکت سکون و چین کا گہوارہ ہوگی۔ بے جا مسابقت، محاذ آرائی، بغض، حسد وغیرہ کام و نشان نہ ہوگا۔ نسل در نسل دشمنیاں غنجا ہو جائیں گی۔

☆ چونکہ مجلسِ شوریٰ کا ہر رکن قرآنی معیارِ اہلیت کا حامل ہوگا لہذا مجلسِ شوریٰ کے ہوتے ہوئے کسی اسلامی نظریاتی کونسل یا ایسے کسی دوسرے ادارے کی ضرورت نہ رہے گی۔ نیز مجلسِ شوریٰ چونکہ قرآن و سنت کی صرف تعبیر و تشریح کرنے پر ہی قادر ہوگی لہذا دستور سازی اور قانون سازی کی مجاز نہ ہونے پر امت کو انسانوں کے بنائے ہوئے قانون سے نجات مل جائے گی۔ شوریٰ صرف اجتہاد کی مجاز ہوگی۔

☆ امر بالمعروف، نہی عن المنکر، احکامِ صلوٰۃ اور ایٹائے زکوٰۃ چونکہ خلافت کے اہم فرائض میں سے ہونگے نتیجہ کے طور پر ایک صالح، متوازن اور خوشحال معاشرے کے معرضِ وجود میں آنے کے علاوہ مقصدِ تخلیقِ امت مسلمہ یعنی دنیا کی ہدایت و رہنمائی کا مقصد خود بخود ادا ہوگا۔

☆ انتظامی وحدت کا مرکز مسجد کو بنانے سے لوکل مسائل کا حل سہل ہو جائے گا۔ مسجد کا امام سربراہ حکومت کا نمائندہ ہوتے ہوئے اپنے گرد و نواح علاقے کا سربراہ بھی ہوگا۔ تمام مقامی مسائل کے حل کا اختیار

اسے ہی ہوگا۔ مقدمات کا فیصلہ تو اکثر و بیشتر موقع پر ہی کر لیا جائے گا نو جداری مقدمات کی شہادتیں بھی نہ چھپائی جاسکیں گی۔ کسی پولیس افسر کے مظالم باقی نہ رہیں گے۔ معاشرہ جرائم سے پاک ہوگا۔ دکاندار ملاوٹ نہ کر سکیں گے۔ تول درست ہوں گے۔ اغوا چوری ڈکیتی مام کو نہ ہوگی۔ کوئی گندگی نہ پھیلا سکے گا۔ کسی کو تجاوزات کی جرأت نہ ہوگی۔ غرض یہ کہ وہ ماں پھر لوٹ آئے گا جو کبھی قرونِ اولیٰ میں تھا۔

☆ چونکہ خلیفہ ارکانِ شوریٰ اور دوسرے اعلیٰ عہدوں پر صرف قرآنی معیارِ اہلیت کے حامل افراد کو متمکن کیا جائے گا لہذا اس معیار پر اترنے میں مسابقت ہوگی۔ سرمایہ جانیہ اور ذخائرِ اثرو رسوخ وغیرہ وہ امتیاز نہ رہیں گے لہذا دورِ دورہ ہوگا تو اخلاق کا اور وقعت ہوگی تو کردار کی۔

## معاشی برکات

☆ امیرِ غریب کے مابین تفاوت کم سے کم ہو جائے گا۔ زکوٰۃ لینے والوں کی تعداد بتدریج کم ہو کر نہ ہونے کے برابر ہو جائے گی۔

☆ دارالسلام کا کوئی شہری روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم اور علاج جیسی بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہے گا۔ کفالتِ عامہ کے پروگرام کے تحت بیواؤں، یتیموں، معذوروں وغیرہ کی بنیادی ضروریات کی فراہمی بذمہ خلافت ہوگی۔ پوری مملکت میں ایک بھی گداگر نظر نہیں آئے گا۔

☆ سودی نظام ختم ہو جائے گا۔ تمام بینک بیت المال کی برانچیں ہوگی۔ ان برانچوں میں بچت بغیر منافع کے حفاظتِ مبادلہ اور دیگر سہولیات کے عوض عندا لطلب واپسی کے معاہدے کے تحت جمع کرائی جاسکے گی۔

☆ عملی شرکت کے بغیر سرمایہ لگانے کی صرف ایک ہی صورت ہوگی کہ کاروباری منصوبوں میں براہ راست حصہ دار بنائے جائے۔ کارکنوں کی کاروباری اداروں میں براہ راست شمولیت سے خواہ وہ کتنی ہی کم کیوں نہ ہو ہڑتال، نالہ بندی وغیرہ کی گنجائش نہ رہے گی۔ نیز وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پیداوار فی یونٹ لاگت کا گراف بلند ہی ہوتا جائے گا۔ بین الاقوامی منڈیوں اور اقوامِ عالم سے لین دین سود کی بجائے شرکت کی بنا پر ہوگا۔ کاروبار میں شرکت، اعتماد اور زیادہ منافع کا باعث بنے گی۔

- ☆ بروہ معاشی عمل جو فرد یا معاشرہ کیلئے نقصان دہ ہوگا ممنوع قرار پائے گا۔ اس سے ملاوٹ، سمگلنگ، چوربازاری، لائٹری، جوائنٹ، کھراؤ وغیرہ سب مایید ہوں گے۔
- ☆ اسلامی قانون وراثت کے ٹھیک ٹھیک نافذ ہونے سے بیٹیوں اور عورتوں کے حصہ کو کوئی دوسرا غصب نہیں کر سکے گا۔ احساس ملکیت عورتوں کو عزت نفس سے نوازے گا۔
- ☆ نظام خلافت میں زکوٰۃ و صدقات، عشر، قومی زمینوں، صنعتوں اور کاروباری منصوبوں کی آمدنی کے علاوہ کوئی ٹیکس وصول نہیں کیا جائے گا۔ آدم کی اولاد سفارش رشتہ استحصال وغیرہ سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے نجات پائے گی۔
- ☆ کارخانے، ٹیکنیریاں اور صنعتوں کا پھیلاؤ فطری یعنی خام مال کی فراہمی کے منبع کے پاس ہوگا۔ ان کا شہروں کی بجائے زیادہ تر دور دراز علاقوں میں ہونے کی وجہ سے شہری سہولیات دیہات میں ہی میسر ہوگی۔ لوگوں کا شہروں کی طرف انتقال رک جائے گا۔
- ☆ اعتماد و امانت دارانہ فضا ہونے کی وجہ سے کوآپریٹو فارمنگ کا رواج ہوگا۔ چھوٹے چھوٹے کاشتکار اپنی زمینیں کوآپریٹو اداروں کے سپرد کر کے خود صنعتی اداروں میں کام کرنا پسند کریں گے۔ اس طرح سے انسانی حیوانی و رمادی ذرائع کا ضیاع ماضی کی یاد ہوگا۔
- ☆ زکوٰۃ و صدقات کی ادائیگی، اتفاق فی سبیل اللہ اور رفاہی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے سے روپیہ گردش میں رہے گا۔ رفاہی اداروں تربیت گاہوں مدرسوں پیشہ دارانہ سکولوں، ہسپتالوں وغیرہ کا جال بچھ جائے گا۔
- ☆ ہر فرد کی تعلیم و علاج کا بندوبست اس کی سکونت کے قریب میسر ہوگا۔ ذرائع پیداوار میں انفرادی تصرف کو قلم و حد و ان کا ذریعہ نہیں بننے دیا جائے گا۔ عمدہ سلوک (Fair Deal) کا روپا کا طرہ امتیاز ہوگا۔
- ☆ چونکہ زمین حقیقت میں اللہ ہی کی متصور ہوگی جسے استعمال میں لانے کا حق ہر ایک کو مساوی ہوگا لہذا دارالسلام میں ایسے نظریات کا قلع قمع ہو جائے گا جو اس بنیادی اصول سے متصادم ہوں۔
- ☆ مفت طبی و قانونی تحفظ کی ضمانت دی جائے گی۔ جگہ جگہ فلاحی و مشاورتی ادارے قائم کیے جائیں

گے جہاں انتقال جائیداد تقسیم وراثت، تخمینہ زکوٰۃ و عشر، محصولات، مکانوں اور دوکانوں کے کرایوں کا تقرر، آجر اور مزدور کی شرائط، قانونی چارہ جوئی کے بارہ میں مفت مشوروں کا خاطر خواہ انتظام ہوگا۔

## معاشرتی برکات

☆ اسلامی حدود کے نفاذ سے دارالسلام میں بحر میں ڈھونڈے سے نہیں ملیں گے، چوری چکاری، ڈاکے، ریزنی، قتل، دغا، دغا، غنڈہ، نکس، ماضی کا افسانہ بن جائیں گے۔ جان و مال، عزت، نفس اور آبرو کا مکمل تحفظ ہوگا۔

☆ سفارش، بدعنوانی، رشوت، سرخ فیتہ، دھڑی مسائل کا نام و نشان نہ ہوگا۔ وہ کام جو آج سالوں میں نہیں ہوتے، ہفتوں میں ہوا کریں گے۔

☆ پابندی قانون، پابندی وقت اور پابندی اخلاق مسلم معاشرہ کا طرہ امتیاز ہوگا۔ زندگی چین اور سکون کا مرقع ہوگی۔ انسان ہی نہیں حیوان بھی اطمینان کا سانس لیں گے۔ محض تماشائی کی خاطر جانوروں پر زیادتی نہیں ہوگی۔ غیر مسلموں کیلئے کوئی چارہ کار نہ ہوگا، ماسوائے اس نظام کی طرف لپک لپک کر آنے میں۔ دنیا گواہی دے گی کہ نظام عدل و قسط ایسا ہی ہونا چاہئے۔

☆ بین الاقوامی معاہدوں کی پابندی ہوگی۔ دوران جنگ بھی دشمن کی عورتوں، بوزخوں، بچوں، فصلوں، درختوں اور جانوروں کو محترم سمجھا جائے گا۔

☆ والدین، اساتذہ، اپنے سے اعلیٰ عہدوں پر متمکن افراد کی فرمانبرداری کے معاملے میں حسن سلوک کی وہ روایات قائم ہوں گی جو دور خلافت راشدہ کا طرہ امتیاز ہیں۔

☆ عورت کا دائرہ کار اس کا گھر ہوگا۔ اس پر وہ وقت نہیں آنے دیا جائے گا کہ اسے حصول معاش میں کھڑے باہر نکلا پڑے۔ چھوٹا تعلیم، چھوٹا محفل، چھوٹا کاروباری اداروں کا وجود نہ رہے گا۔ عورتوں کا گھر سے باہر اگر کوئی حصہ ہوگا تو عورتوں کے تعلیمی اور علاج معالجہ کے اداروں کیلئے۔

☆ جہیز اور براءت کی موجودہ رسمیں غفا ہو جائیں گی۔ شادی بیاہ کے موقع پر اگر کچھ اخراجات ہوں گے تو ان کا بوجھ لڑکے والوں پر ڈالا جائے گا۔

☆ دوسری شادی بشرط ضرورت ہی کی جاسکے گی۔ اسے عیش و عشرت اور عدم مساوات کا ذریعہ نہیں

بنے دیا جائے گا۔

☆ قومی لباس، قومی زبان، قومی روایات، مستحکم ہوں گی۔ اختیار سے صرف وہ اقتدار ملی جائیں گی جو درحقیقت مومن ہی کی کشتہ میراث ہوں گی۔

☆ ذرائع ابلاغ، اخبارات و جرائد، تصویر، خوشنویسی، موسیقی، شاعری اور دوسرے فنون لطیفہ کو یوں مرتب و مروج کیا جائے گا کہ یہ صرف اور صرف اسلامی اقتدار کو جلا دینے کا باعث بنیں۔ نتیجہ کے طور پر ایک ایسا پاکیزہ معاشرہ معرض وجود میں آئے گا جس پر فرشتے بھی رشک کریں گے۔

## تعلیمی برکات

☆ پورے دارالسلام میں ایک ہی طرز تعلیم رائج ہونے سے موجودہ عام مدارس، پبلک اسکولوں اور دینی مدارس کی تیز مت جائے گی۔ نیز عربی کو بین الاقوامی زبان کا درجہ حاصل ہونے سے لسانی اور اصطلاحاتی مشکلات سے دوچار نہیں ہوا پڑے گا۔

☆ دینی اور معاصر تعلیم کے باہم مدغم ہونے سے اخلاق و کردار کی بہتر تعمیر ہوگی۔ استاد و شاگرد کا رشتہ مستحکم اور مقدس ہو جائے گا۔ اساتذہ کو ان کا جائز مقام اور پورا احترام ملے گا۔

☆ تعلیم و تربیت میں بہترین افراد لگانے سے معیار تعلیم بلند ہوگا اور معیار تعلیم بلند ہونے سے زندگی کے ہر شعبہ میں کمال کی صورت عود آئے گی۔

☆ ہر مرد اور عورت کیلئے تعلیم فرض قرار دینے سے ماخواندگی کا کلی قلع قمع ہو جائے گا۔ ماخواندگی ختم ہونے سے بود و باش رہن بہن، لین دین غرض یہ کہ ہر شعبہ زندگی میں نکھار آ جائے گا۔

☆ تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت و تزکیہ کی سہولت میسر ہونے سے صالح بنر مند افراد کی بہتات ہو گی۔

☆ اعلیٰ تعلیم صرف مستحقین کے لیے مختص ہونے سے بین الاقوامی شہرت کے حامل ماہرین کی ایک عظیم کھپ تیار ہو جائے گی۔ نتیجہ کے طور پر کار خلافت آسان ہو جائے گا۔

## عدالتی برکات

☆ چونکہ تلخیر وقت کو دارا خلافت کی مرکزی مسجد کا خطیب و امام بھی ہونا ہوگا اور اسی طرح گورنروں، کمشنروں، ڈپٹی کمشنروں حتیٰ کہ محلہ کی سطح تک یونین کونسل کے سربراہوں کو اپنے اپنے دائرہ اختیار کی مرکزی مسجدوں کے خطباء و امراء ہونے سے کم از کم پانچ وقت اپنے عوام کے درمیان آنا ہوگا، عوام کی شکایات کا ازالہ سونے سے پہلے ہو جایا کرے گا۔ حدود کے نفاذ اور فرائض و حقوق کے متوازن ہونے سے جرائم کی تعداد کم ہو جائے گی۔ لہذا قاضیوں اور عدالتوں کی تعداد برائے امام رہ جائے گی۔

☆ قانون سے کوئی فرد بالا نہ ہوگا۔ اس طرح بڑے سے بڑے حاکم کیلئے امتیازی اختیارات کا بے جا استعمال ممکن نہ رہے گا۔ سفارش نہ عنوانی جیسی کسی قباحت کا نام تک نہ رہے گا۔

☆ مسلمانوں کے دنیا میں غالب قوت ہونے کی وجہ سے بین الاقوامی اختلافات کے فیصلے قرآن و سنت کے مطابق ہوں گے۔ نتیجہ کے طور پر صرف مسلمان ہی نہیں پوری انسانیت قرآن و سنت کی برکات و فیوض سے مستفید ہوگی۔

☆ عدلیہ، نظامیہ سے کلی طور پر تلخیر ہوگی اور صرف رب کائنات کے سامنے جواب دہ ہوگی اس طرح عدل و انصاف عوام کا مقدر ہوگا۔

☆ نظام عدل و قسط قائم ہونے سے مجرم سزا پانے کیلئے خود حاضر ہوا کریں گے حتیٰ کہ جنس جرم ہی آہستہ آہستہ اسلامی دنیا سے مایید ہو جائے گی۔ انسانیت گواہی دے گی کہ اگر ”فردوس بر روئے زمین است“ ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است۔“